اسمارائیں

ممتاز مفتی

اسمارائیل

ممتاز مفتی

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

بار اوّل ---------- ۱۹۹۳ء

مطبع --- فیروز سنز لاہور

مجلد --- 969 0 01111 1

ہمارے جذباتی سلف Selves, نے
زندگی بھر ایک دوسرے سے ٹوٹ کر محبت کی۔
ہمارے ذہنی سلف نے
زندگی بھر ایک دوسرے کو رد کیا' ایک
دوسرے کی کاٹ کی۔
محبت اور نفرت کے یہ دونوں دھارے
ساتھ ساتھ بہتے رہے۔
اپنے قدیم ساتھی
احمد بشیر
کے نام

اسما رائیں

فہرست

جائزہ

میرے خیال میں ممتاز مفتی کے سارے افسانوں کو دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور مجموعہ "ان کہی" سے شروع ہوتا ہے اور "گڑیا گھر" پر ختم ہوتا ہے۔ پہلے دور کے پانچ مجموعوں میں "اسمارائیں" چوتھے نمبر پر ہے۔ جو مواد ان کہانیوں میں شامل ہے، اس سے ظاہر ہے کہ یہ افسانے ۱۹۴۷ء سے آگے پیچھے چند برسوں میں لکھے گئے۔ اسمارائیں پہلی بار ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ یہ کہانیاں ممتاز مفتی کے اوّلین دور کے سبھی موضوعات کی نمائندہ ہیں۔

کرداروں کی نمایاں خصوصیت ان کا شدتِ احساس ہے۔ ہر کردار کسی نہ کسی کرائسس میں الجھا ہوا ہے۔ ماحول نفسیاتی ہے۔ جذبوں، جبلتوں، رجحانات اور احساسات کا تصادم کہانی نویس کا مرغوب موضوع ہے۔ برصغیر میں مرد و زن، سماجی اور ثقافتی عوامل کے زیرِ اثر جس پیچیدہ اور الجھی ہوئی صورتِ حال سے دوچار ہیں، خاص کر جنسی تعلقات کے سیاق میں اس سے ماخوذ کیفیات کو ممتاز مفتی نے ایک راز دان، باعلم راز دان، کے طور پر بیان کیا ہے اور انہیں انواع و اقسام کے افسانوی لباس پہنائے ہیں۔ ان میں سے بعض جدت و تازگی کے حامل ہیں۔

مجموعہ زیرِ نظر میں کل ۱۷ افسانے ہیں۔ سب سے پہلی قابلِ ذکر کہانی سمیع اور اسمارہ ہے۔ محبت کی کہانی، ایسی محبت جو اپنے مقصود کو پانے میں ناکام رہتی ہے۔ لب و لہجہ جذباتی ہے۔ اس افسانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شاملِ بیان فطرتی منظر سے تشبیہ و استعارہ ابھرتے ہیں۔ اسمارہ اور سمیع انفرادی یا طبقاتی کردار ہونے کی بجائے پوری انسانیت کے نمائندہ بن جاتے ہیں اور ناکام محبت کی کہانی انسانی صورتِ

حال کا اشارہ بن جاتی ہے۔

"جوار بھاٹا" کا موازنہ عصمت چغتائی کے ٹیڑھی لکیر کے بعض حصوں سے کیا جا سکتا ہے۔ عنفوان شباب کے اوّلین احساسات، خاص کر لڑکیوں کے باطن میں ابھرنے والی کیفیات، معنی آفرینی، زبان پر عبور، الفاظ کا پر اثر استعمال وغیرہ بعض اعتبار سے زبردست افسانہ ہے۔ بیانیہ قوت کے اعتبار سے، بنت کے اعتبار سے، منظر و کیفیت کے امتزاج کے اعتبار سے اور مرجانہ کے کردار کے بنیادی وصف کے اعتبار سے، مرجانہ کے اندر ناقابل تسخیر جنسی قوت ہے۔ جب جوار بھاٹا اٹھتا ہے تو سبھی کچھ تہ و بالا ہو جاتا ہے۔ عمر کے ایک خاص مرحلے میں داخل ہو کر، عمر کے پینتالیس برس گزارنے کے بعد افسانہ "ریت کی لہریں" کا باقر یادوں، سوچ اور مشاہدہ سے مملو خود کلامی کی گرفت میں ہے۔ افسانہ نگار کی ناسٹیلجیا کی کہانی بیان نہیں کرتا۔ انہوں نے خوابوں کے جال نہیں بنا بلکہ وہ ایک لمحہ موجود کے حوالے سے باقر کے احاطہ شعور میں داخل ہونے والی کیفیات اور تصاویر کی جھلکیاں دکھاتا ہے۔ ایسا لمحہ جب تحت الشعور بڑا سرگرم ہے ریت اور پانی کو جاندار استعاروں کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

"سمنہ" میں ایک بچی، ایک عام سی بچی، ایک عام گھر میں پلنے والی بچی کی اچانک موت پر متعدد کرداروں کی باطنی کیفیات کا بیان ہے۔ معصوم اور نازک احساسات سے بھرپور افسانہ "ہائے یہ نوجوان" عام گھریلو ماحول کا افسانہ ہے۔ بیاہ شادی کے حوالے سے ہر نوجوان کردار اپنی مرضی کرنا چاہتا ہے۔ بڑوں کی طرف سے انہیں یہی تاثر دلایا جاتا ہے کہ سب کچھ انہیں کی مرضی کی مطابق ہو گا مگر فی الاصل وہ کچھ ہو جاتا ہے جو بزرگ چاہتے ہیں۔ زندہ کرداروں، حقیقی صورتِ حال اور ہر دلعزیز موضوع سے ابھرنے والا لطیف طنز قاری کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ بعض کہانیاں جیسے "موقعہ" "وہ ہاتھ" وغیرہ نفسیاتی بگاڑ پر لکھی گئی ہیں ان کے حوالے سے ممتاز مفتی کو فرائیڈ کا پیرو کار بھی کہا گیا ہے اور کہانیوں کو کیس ہسٹریاں بتایا گیا ہے۔ "گوبر کے ڈھیر" اور "گھور اندھیرا" فسادات کے موضوع کے متعلق افسانے کہے جا سکتے

ہیں۔ بعض افسانوں میں ایسا خود سوانحی مواد بھی شامل ہو گیا ہے جسے بعد کو "علی پور کا ایلی" میں زیادہ بہتر تخلیقی اظہار پانا تھا۔

ممتاز مفتی کا فکشن آج بھی اظہار کے سانچوں میں ڈھل رہا ہے۔ انہوں نے اپنی پہلی کہانی ۱۹۳۶ء میں شائع کی۔ یہ برس اردو افسانے کی تشکیل اور اس کے ارتقاء میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد افسانے پر جو گزری، وہ ممتاز مفتی کے سامنے کی بات ہے۔ انہوں نے اپنے طویل تخلیقی سفر میں بہت کچھ لیا اور دیا ہے۔ کئی مراحل سر کئے ہیں اور کئی سرحدوں کو چھوا ہے۔ مگر تحقیق و تنقید نے ان کے بارے میں جو ابتدائی، سرسری سا تاثر قائم کیا تھا، اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ فی الحقیقت ہمارے ہاں افسانے کے سلسلے میں جن مفروضوں پر تحقیق و تنقید کا انحصار رہا ہے، وہ اب منہدم ہو چکے ہیں۔ ضرورت ہے کہ نیا تنقیدی شعور معرضِ وجود میں آئے، فکشن کا مطالعہ کیا جائے، افسانہ نگاروں کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسے تنقیدی جائزے کی روشنی میں ممتاز مفتی سرخرو ہوں گے۔ اور ادب میں ان کے لئے منفرد مقام متعین ہو گا۔ بحیثیت مجموعی ان کے افسانے اس سحر کے امین ہیں جو قصہ گوئی سے متعلق ہے۔ ان کی فنی جستجو کی منزل انسانی فطرت کی تفہیم ہے اور انسانی فطرت زمانے کی تمام تبدیلیوں کے باوجود بڑی حد تک قائم و دائم رہتی ہے۔

نذیر احمد

جولائی ۱۹۹۲ء

پیش لفظ

اسمارائیں میرے افسانوں کا چوتھا مجموعہ ہے جسے چودھری رشید احمد نے پہلی بار مکتبۂ جدید سے ۱۹۵۲ء میں شائع کیا اور اب فیروز سنز، لاہور اس کی دوسری ایڈیشن شائع کر رہے ہیں۔

یہ کہانیاں ۵۲ــ۱۹۵۰ء کے دوران لکھی گئیں۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک پاکستان آزادی کی دردِ زہ سے گزر رہا تھا۔ سرحدوں پر مسلمانوں کا قتلِ عام ہو رہا تھا۔

بھارت نے پاکستان کے وجود کو دل سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ انہوں نے نِپ ان دی بڈ (Nip in the bud) پالیسی کے تحت ہر ممکن طور پر کوشش کی تھی کہ یہ نوزائیدہ بوٹا جڑ پکڑنے سے پہلے ہی سوکھ کر مرجھا جائے۔ اس لئے بھارت نے معاہدے کے مطابق پاکستان سے تعاون نہیں کیا۔

یہ انتشار کے دن تھے اور انتشار کے دنوں میں تخلیقی عمل رک جاتا ہے۔

ذاتی طور پر بمبئی سے واپس آنے کے بعد میں تلاشِ معاش میں سرگرداں تھا۔

اس دوران میں مَیں ایک ایسے تجربے سے گزرا جس نے میرے ذہن پر گہرا اثر مرتب کیا۔ مجھے ایک ایسے محکمے میں نوکری کرنے کا موقعہ ملا جہاں انسانی شخصیت کا تجزیہ کیا جاتا تھا۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی میں نفسیات کا طالب علم تھا لیکن مجھے شخصیت

کے تضادات اور Polarization کا وضاحت سے شعور نہ تھا۔ مجھے علم نہ تھا کہ ہر خیر کے پھول کے ساتھ شر کا کانٹا لگا ہوتا ہے بلکہ خیر کے وجود کے قیام کے لئے شر کا کانٹا ضروری ہے۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ شخصیت مداری کے جادو کے ڈبے کی طرح ہوتی ہے۔ ڈبہ کھولو تو اندر سے ایک اور ڈبہ نکل آتا ہے۔ اسے کھولو تو ایک اَور، ڈبے میں ڈبہ، ڈبے میں ڈبہ۔

ہمارے روایتی ادب میں عام طور سے فلیٹ کردار پیش کئے جاتے ہیں۔ ہیرو مثبت شخصیت کا مالک ہوتا ہے، ولن منفی کا۔

غنی کے کردار میں یہاں وہاں خست کی گرہیں نہیں لگی ہوتیں۔ محبت کرنے والا وفا کے جذبے سے اس قدر بھیگا ہوتا ہے کہ اڑان کی طاقت ہی شل ہو جاتی ہے۔

مثلاً اس مجموعے میں پہلی کہانی سمیع اور اسمارہ کی ہے۔ دونوں محبت کے جذبے میں بری طرح سے بھیگے ہوئے ہیں۔ دراصل انہیں محبوب سے نہیں بلکہ محبت کی کیفیت سے محبت ہے اور یہ محبت سرشاری کی ایسی کیفیت پیدا کر چکی ہے کہ لاشعوری طور پر وہ خوف زدہ ہیں۔ انہیں ڈر ہے کہ کہیں ملاپ نہ ہو جائے۔ ملاپ مقصود نہیں۔

میں نے کوشش کی ہے کہ انسانی شخصیت کی گھمن گھیریوں کو بیان کروں۔

اگر میں اس کوشش میں کامیابی نہیں حاصل کر سکا تو بھی مجھے خوشی ہے کہ میں نے کوشش تو کی۔

ممتاز مفتی

جولائی ۱۹۹۲ء

سمیع اور اسمارہ

سمیع اور اسمارہ کا واقعہ ایک معمولی سا واقعہ ہے ایسا واقعہ جو اکثر ہمارے گردو پیش چپ چاپ وقوع پذیر ہوتا ہے ۔ بار بار وقوع پذیر ہوتا ہے ۔ ہم اسے دیکھتے ہیں ۔ سنتے ہیں ۔ مگر نہیں دیکھتے ، نہیں سنتے ۔

سمیع اور اسمارہ کوئی عجیب و غریب کردار نہیں ہیں ۔ وہ بار بار مختلف کوائف سے مختلف ناموں میں ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں ۔ ہم انہیں دیکھتے ہیں ، ان سے ملتے ہیں اور پھر اپنے کام میں لگ جاتے ہیں ۔

سوچتا ہوں کہ آخر میں سمیع اور اسمارہ کا واقعہ کیوں قلمبند کر رہا ہوں ۔ واقعات کے لحاظ سے یہ ایک اکتا دینے والا واقعہ ہے ، افسانے کے لحاظ سے ۔۔۔؟ افسانویت اس میں قطعی طور پر مفقود ہے ۔ پھر سمیع اور اسمارہ کے کردار بھی تو ہماری زندگی کا کوئی انوکھا پہلو پیش نہیں کرتے ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ۔

ویسے تو جگہ جگہ سمیع اور اسمارہ ملتے ہیں لیکن ان مخصوص سمیع اسمارہ کو دیکھنا ہو جنکا ذکر کرنے پر میں خود کو مجبور محسوس کر رہا ہوں اور جن میں کوئی خصوصی امتیاز نہیں تو کسی روز جبشی باغ کے مغربی حصے میں چلے جائیے ۔ اس مقام سے ذرا دور جہاں تراشے ہوئے پودے ، پھولوں کے تختے اور تراشیدہ گھاس کے ہموار پلاٹ ختم ہو جاتے ہیں اور باغ جنگل کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ جہاں بیٹھے بیٹھے سے سرسبز درختوں سے بھوری ٹہنیاں خم کھاتی ہوئی بے تابانہ باہر نکل آتی ہیں ، جیسے کسی سے کچھ کہنے کے لئے بیقرار ہوں ۔ اور پھر کچھ کہے بغیر بل کھائے جاتی ہیں ۔ جہاں اونچی اونچی گھاس میں خار دار جھاڑیوں کے درمیان سرخ پتھر کا ایک فوارہ ہے جس کے گرد پتھر میں دو معصوم بچے مغموم ہیں اور نیچے ایک کتبہ کندہ ہے :۔

"ہم دونوں کے سوا ساری دنیا عجیب ہے پیاری!"
"ہاں پیارے اور تم بھی کچھ کچھ عجیب۔"

اس فوارے کے گرد چند ایک ٹوٹے ہوئے بنچ پڑے ہیں۔ فوارے کے پاس شاید آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے کیونکہ وہ دن ڈھلے وہاں آتے ہیں۔ لیکن اگر انہوں نے آپ کو دیکھ پایا تو وہ چپ چاپ آگے نکل جائیں گے اور آپ کو معلوم ہی نہ ہوگا کہ وہی دونوں سمیع اور اسمارہ تھے۔

اسمارہ عمر میں پچیس کے لگ بھگ ہوگی اور سمیع تیس کے قریب ان کے خدوخال اور بشرہ سے کوئی خصوصیت نمایاں نہ ہوگی۔ اسمارہ کی شکل و صورت ایسی ہوگی۔ جیسے تمام اسماراؤں کی شکل و صورت ہوتی ہے۔ کتابی چہرہ ستواں ناک، پتلے ہونٹ، تنگ دہن اور اداس، نیم وا ڈولتی آنکھیں۔

اس کے چہرے پر ایک مخملی سی زردی، ایک غم زدہ تازگی نمایاں ہوگی۔ جیسے کوئی پھول اوس کی نمی تلے اور بھی شگفتہ دکھائی دیتا ہے۔ آزردگی کی اس گہری اور شگفتہ تہہ کے علاوہ اس کے چہرے پر کوئی اظہار نہیں ہوتا، جیسے اُس حُسن افزاء غازے نے اُسے باقی جملہ اظہار سے محروم کر دیا ہو۔ اور اس کے جذبات اظہار کے راستے مسدود پا کر چہرے سے ہاتھوں میں اتر آئے ہیں۔

سمیع کی شکل عام سی ہے۔ جیسے آپ کی، میری یا کسی اور کی۔ اور سچ پوچھئے تو ہم اور سمیع میں فرق ہی کیا ہے۔ یہی نا کہ ہمیں کوئی اسمارہ نہیں ملی، جو ہمارے خوابیدہ سمیع کو چونکا دیتی اور پھر اسے تھپک تھپک کر پالتی پوستی۔ اس سمیع کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے جیسے وہ کھو گیا ہو کسی کی تلاش کرتے ہوئے خود کھو گیا ہو، جیسے اس کے گردو پیش کی تمام چیزیں سو گئی ہوں اور فاصلے انگڑائیاں لینے لگے ہوں۔ اور ہواؤں نے چلنا چھوڑ کر تھپکنا شروع کر دیا ہو۔

فوارے کے قریب آ کر وہ دونوں رک جائیں گے۔ سمیع کھوئی ہوئی، تھکی ہوئی نگاہ ادھر ادھر ڈالے گا۔۔۔۔ اسمارہ کے سیاہ برقعے سے دو زرد مخملی سانپ نکل آئیں گے اور یوں مضطربانہ لہرانے لگیں گے جیسے کچھ ٹٹول رہے ہوں۔

"اسمارہ!" سمیع کی کراہ سنائی دے گی۔

"جی۔" فضا میں ایک ہلکی سی آہ تیرنے لگے گی۔

"اسمارہ"!

"جی"۔

"تم تھک گئی ہو اسمارہ؟"

"نہیں تو" اور اس کے تھکے ہوئے بے جان ہاتھ ، بینچ کا سہارا لینے کے لئے آگے بڑھیں گے ۔

"ضرور ، تم تھک گئی ہو ۔ کچھ دیر بیٹھ جائیں ۔"

"اچھا" ــــ۔ اسمارہ دھم سے بنچ پر گر جائے گی جیسے وہ تھک کر چور ہو چکی ہو ۔ سمیع ارد گرد کھوئی ہوئی نگاہ ڈالے گا ، سرد آہیں بھرے گا اور پھر اسی بنچ پر اسمارہ سے پرے ہٹ کر بیٹھ جائے گا ۔ اور وہ دونوں خاموش بیٹھے رہیں گے ۔ اسمارہ برقع اٹھا کر فوارے کی طرف منہ موڑ لے گی اور کچھ اس انداز سے فوارے اور کتبے کی طرف دیکھے گی ۔ جیسے وہ فوارے کے وجود سے ہی واقف نہ ہو ، جیسے وہ کتبہ فوارے کی بجائے اُفق پر رنگین بادلوں میں کندہ ہو ۔ سمیع ان بل کھاتی ہوئی مضطرب شاخوں کی طرف چوری چوری دیکھتا رہے گا جو اس سیاہ جھاڑی سے نکل کر فضا میں ایک جمالی انداز سے معلق ہو گی ۔ سمیع کی مضطربانہ نگاہوں کو دیکھے بغیر محسوس کر کے اسمارہ کی انگلیاں تن کر اور بھی لمبی ہو جائیں گی اور قریب ہی مخملی زرد سانپوں کی زبانیں یوں لہرائیں گی جیسے کسی ضحاک کے شانے ٹٹول رہی ہوں ۔

یہ دیکھ کر سمیع اور بھی سمٹ جائے گا ۔ اور اسمارہ سے ذرا پرے سرک کر آہ بھرے گا ۔

"اسمارہ؟"

"جی"

"اسمارہ میں گردن زدنی ہوں ۔"

"کیوں ؟"

"میں نے تمہاری زندگی تباہ کر دی ۔"

"نہیں تو"۔

"سب میرا قصور ہے، سب میرا قصور ہے۔"
باغ کے اس ویران ٹکڑے میں ایک آہ اور ایک کراہ تیرنے لگیں گی ۔
میری محبت تمہاری تباہی کا باعث ہوئی ۔"
"نہیں تو"۔ پتھر کے معصوم بچے کو دیکھ وہ پیار سے مسکرا دے گی ۔
پھر وہ اٹھ بیٹھے گا اور مضطربانہ ٹہلنے لگے گا ۔ اور اسمارہ کی زرد شاخیں بل کھائیں گی ۔ اور اس کے چہرے کی آزردگی اور بھی شدید ہو کر اسے ایک نئی تازگی بخش دے گی ۔

پھر نہ جانے کہاں سے راز آ نکلے گا ۔ وہ حیرانی سے سمیع اور اسمارہ کی طرف دیکھے گا ۔ "ہیں ! تم تم یہاں؟!" .

"ہاں" سمیع اسمارہ سے اور بھی دور ہٹ جائے گا ۔ اور دوسرے بینچ پر بیٹھ کر اسے اپنی طرف بلائے گا ۔" راز آؤ ، تم جانتے ہو ۔ سب قصور میرا ہے ۔ سب قصور میرا ہے ۔ میں نے اسمارہ کی زندگی کا شیرازہ بکھیر دیا ۔ میں نے اسے اندھے کنوئیں میں دھکیل دیا ۔ میں گردن زدنی ہوں راز"۔

"گردن زدنی !!" یہ کہتے ہوئے وہ سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر آنکھیں بند کر لے گا ۔

"راز ۔۔۔" اسمارہ اسے اشارے سے بلائے گی ۔ "ان کا قصور نہیں ۔ ان کا قصور نہیں راز ! سب میری بد قسمتی ہے ۔ میری بد قسمتی ! میں کتنی بد نصیب ہوں راز! تم جانتے ہو ۔ ان سے جا کر کہہ دو ۔ وہ میرا غم نہ کھائیں ۔ میرے لئے ۔ اپنی زندگی تباہ نہ کریں ۔"

سمیع راز کو پاس کھڑا دیکھ کر چونکے گا ۔ "راز کتنی اچھی ہے وہ کتنی پاکیزہ !!" لیکن میں، میں اس کے قابل نہیں ، قطعی نہیں ، اس نے اپنی پاکیزگی سے میری زندگی سنواری ۔ اور میں نے اسے کیا دیا ، کچھ بھی نہیں ۔ تباہی بربادی ، تنہائی ، جاؤ راز اسے کہہ دو کہ سمیع ساری عمر آنسو بہاتا رہے تو بھی اس گناہ کی تلافی نہیں ہو سکتی !!"

پھر اُس سیاہ جھاڑی سے دو زرد شعلے نکل کر راز کو جھلس دیں گے ۔ زن ایک پٹاخہ سا چھوٹے گا اور راز کا سر کٹ کر درخت کی شاخ سے جا لٹکے گا ۔

ایک کراہ اور ایک آہ ان بینچوں کے گرد آنکھ مچولی کھیلیں گی ۔ اور شاخیں بل کھا کھا کر سبز پتوں سے جھانکیں گی اور شام اپنا دھندلا پردہ کھول دے گی ۔

حبشی باغ کے اس ویران کونے میں سمیع اور اسمارہ ہر اتوار کو آتے ہیں اور فوارے کے قریب رک جاتے ہیں ۔ "اسمارہ" ! سمیع آنسو پی کر کہتا ہے ۔ "جی" ایک مخملی آہ فضا میں تیرتی ہے اور اسمارہ کی نیم واکشتیاں ڈولتی ہیں ، ہاتھ بل کھاتے ہیں ۔ اور اس کے چہرے پر آزردگی کی تہ اور بھی گاڑھی ہو کر اسے ایک انوکھی تازگی بخش دیتی ہے اور پھر اتفاق سے سمیع کا دوست راز ادھر آ نکلتا ہے اور سمیع اُٹھ کر دوسرے بینچ پر جا بیٹھتا ہے ۔ "راز اسے جا کر کہہ دو ۔۔۔۔"

اور سیاہ جھاڑی سے دو زرد سانپ نکل کر راز کے شانے چاٹتے ہیں اور اس کا سر شاخ سے لٹکنے لگتا ہے اور فوارہ اچھل اچھل کر جھانکتا ہے ۔ اور بچے مسکراتے ہیں اور ان کے نیچے وہ کتبہ پھیلنے لگتا ہے ، اور شام کے دھندلکے میں اس کے حروف خون آلود سرخی سے چمکتے ہیں اور دُور افق پر اُن کا عکس پڑتا ہے اور بادلوں کو آگ لگ جاتی ہے اور فضا میں ہلکی ہلکی سرگوشیاں گونجتی ہیں ۔

"ساری دنیا عجیب ہے پیاری!"

"ہاں پیارے ، اور تم بھی کچھ کچھ عجیب!!"

دس سال گزرے جب سمیع نے پہلی بار اسمارہ کو دیکھا تھا ۔ دس سال! اسمارہ اس وقت حسبِ معمول باورچی خانے میں بیٹھی تھی ۔ اس کے ہاتھ مصروف کار تھے ۔ اس کی نگاہیں یُوں کھوئی ہوئی تھیں جیسے کائنات کے خلا اور وسعتیں ان آنکھوں ، دو آنکھوں میں جذب ہو چکی ہوں ۔ اس کے ہونٹ یوں بھینچے ہوئے تھے جیسے کراہ کو دبائے ہوئے ہوں ۔ اس کے رخساروں پر مخملی زردی کی تازگی تھی وہ یوں بیٹھی تھی جیسے سبھی اسمارائیں بیٹھتی ہیں ۔ مگر سمیع نے کبھی کسی اسمارہ کو نہ دیکھا تھا ۔ اس لئے وہ اسے دیکھ کر کھڑا کا کھڑا رہ گیا ۔ اسمارہ کو اس بات کا احساس تھا کہ اس کی خالہ کی نند کے بھائی کا نووارد بیٹا قریب ہی حیرانی سے اُسے دیکھ رہا ہے ۔ لیکن اسمارہ نے دوپٹہ سنبھالنے یا گھبرا کر پیچھے

بٹنے یا ہائے اللہ کہہ کر بھاگنے کی کوشش نہ کی تھی ، جیسے نوجوان لڑکیاں کیا کرتی ہیں ۔ بلکہ سمیع کی موجودگی کے احساس پر اُس کے رخسار اور بھی شبنمی ہو گئے تھے ۔ اس کی آنکھوں کی کشتیاں اور بھی ڈولنے لگی تھیں اور اس کے ہونٹ اور بھی کراہنے لگے تھے ۔

اس روز کے بعد سمیع میں ایک اضطراب سا جاگ اٹھا ۔ بے نام اندھا اضطراب دفعتہً وہ پڑھتے اُٹھ بیٹھتا اور کتاب میز پر دے مارتا ۔ "نہیں ۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا ۔"

راہ چلتے ہوئے وہ چونک پڑتا ۔ "نہیں نہیں ، میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔"

گھر آکر وہ چپکے سے گھومتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ جاتا اور باورچی خانے کی اس کھڑکی کے قریب جو اندر دالان میں کھلتی تھی ۔ دیوار کی اوٹ میں کھڑا ہو کر اسمارہ کو دیکھتا رہتا ۔

نہ جانے کیسے اس کی آمد پر کھڑکی کی طرف دیکھے بغیر اسے احساس ہو جاتا کہ وہ آگیا ہے ۔ اس پر اس کی بھنویں اور بھی تن جاتیں ، چہرا اور بھی تُتا ہوا دکھائی دیتا اور ہاتھ دلفریب خم کھا کر جمالی انداز سے ہوا میں معلق ہو جاتے ، پھر روز بروز اسمارہ کی اس چوکی کا زاویہ بھی بدلتا جا رہا تھا جس پر وہ بیٹھا کرتی تھی اور اس کا چہرہ گلی کی کھڑکی کی سمت غروب ہوتا ہوا دالان کی کھڑکی پر طلوع ہوتا جا رہا تھا ۔ لیکن اس کے باوجود اسمارہ نے کبھی آنکھ اٹھا کر اس کھڑکی کی طرف نہ دیکھا تھا ۔ جس کی اوٹ میں سمیع کھڑا ہوتا تھا ۔

سمیع چوری چوری اسمارہ کی طرف دیکھتا ، آہیں بھرتا ، دیکھتا ، آہیں بھرتا اور ہلکی سی آہٹ پر دیوار پر لگے بجلی کے سوئچ کی مرمت میں یوں مشغول ہو جاتا ۔ جیسے اُسے کچھ خبر ہی نہ ہو ۔ اور اسمارہ آلو چھیلتی ، ٹماٹر کاٹتی ، چائے بناتی اور پھر جیسے تھک کر انگڑائیاں لیتی اور بیٹھتے ہوئے یوں دیواروں کے پار خلاؤں کو گھورتی جیسے اس کائنات سے کوئی تعلق نہ ہو ۔ سمیع آہیں بھر بھر کر تھک جاتا تو چپکے سے سیڑھیاں اُتر جاتا اور اپنے کمرے میں پہنچ کر کتابوں کو گھورتا ، میز سے لڑتا اور جملہ چیزوں کے خلاف شکائتیں کرتا ۔ "اب میں کیا کروں ؟ اب

میں کیا کروں "؟ وہ اس چھوٹے سے کمرے میں صحرانوردی کرتے ہوئے چلاتا ۔ "مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو سکتا ۔"

اسمارہ کے والد کالج میں پروفیسر تھے ۔ جنہیں کتابوں کے علاوہ جیتے جاگتے مطالعوں میں دلچسپی تھی ۔ لیکن اسمارہ کی والدہ کی وفات کے بعد ان کی دلچسپی صرف کتابوں تک ہی محدود رہ گئی ۔ شاید اس خیال سے کہ گھر میں دو جوان لڑکیاں تھیں ۔ انہوں نے مطالعے کو پس پشت ڈال دیا تھا ۔ لیکن کسی پلے ہوئے توارثی رجحان کو پس پشت ڈالنے سے وہ انتقامی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ایسا شبخون مارتا ہے کہ انسان کا ذہنی توازن تباہ ہو جاتا ہے ۔ پروفیسر قائم علی بھی ایک ایسے ہی شبخون کا شکار ہو گئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پڑوسی سب جج کی بیگم عشرتی ہمیشہ کے لئے اپنا گھر چھوڑ کر پروفیسر صاحب کے گھر میں آبیٹھی تھی اور اس کی آمد پر پروفیسر صاحب نے کتابیں پڑھنے کا شغل ترک کر دیا تھا ۔ اور وہ اپنی تازہ فتح ، بیگم عشرتی میں کھو گئے تھے ۔

سمیع جب گاؤں سے شہر آیا تاکہ تھرڈ ایئر میں داخل ہو تو پروفیسر صاحب کو معلوم ہوا کہ ایک حسلب سے وہ ان کا رشتہ دار ہے اور انہوں نے اسے رسمی دعوت دی ۔ "سمیع ! جب تک رہائش کا مناسب انتظام نہ ہو تو ہمارے ہاں آ ٹھہرو ۔" اور جب سمیع کتابوں کا سوٹ کیس اٹھائے وہاں پہنچ گیا تو پروفیسر صاحب اس کے وجود ، اس مکان میں اس کی موجودگی کے احساس سے قطعی بیگانہ ہو گئے ۔ ایک تو وہ ویسے ہی نسیان کا شکار تھے جیسے عام طور پر پروفیسر ہوتے ہیں اور دوسرے بیگم عشرتی کی فتح نے انہیں عام فانی انسانوں کی باتوں اور واقعات سے بے نیاز کر دیا تھا ۔ انہیں یہ احساس ہی نہ تھا کہ خواب گاہ کے قریب ہی باورچی خانے میں ان کی دو جوان لڑکیاں آلو چھیلنے ، منہ پر کوئی چھڑکنے اور بے کام کئے تھک کر انگڑائیاں لینے اور معصومانہ انداز میں کھڑکیوں میں لٹکنے میں مصروف ہیں اور دالان میں ساری دوپہر ان کا نو وارد مہمان بجلی کا سوئچ بنانے میں مصروف کار رہتا ہے جسے دیکھے بغیر اسمارہ اس کی موجودگی محسوس کر کے ٹماٹر کاٹنے میں شدت سے مصروف ہو جاتی ہے اور پھر اس کی نگاہیں اس چار دیواری سے باہر خلاؤں کو گھورتی ہیں ۔ اس کے گالوں پر گذشتہ آنسوؤں کی نمی عود کر آتی

ہے ۔ اس کے ہونٹ یوں بند ہو جاتے ہیں جیسے ہچکی روک رہی ہو ۔ اور سمیع کا بند بند شدید اذیت کے زیر اثر تڑپتا ہے ۔ اس کی نسیں تن جاتی ہیں اور رگیں پھڑ پھڑاتی ہیں ۔۔۔ اور پھر وہ گھبرا کر نیچے کو بھاگتا ہے اور اپنے کمرے میں پہنچ کر چلاتا ہے ۔ "اب میں کیا کروں ؟ اب میں کیا کروں ؟" اور پھر اسمارہ چلتے چلتے رُک جاتی ہے اور کان لگا کر سمیع کی آوازیں سنتی ہے اور اس کے ہونٹوں کی کراہ مسکراہٹ میں بدل جاتی ہے اور اس کی آنکھوں میں خلاؤں کی جگہ آبادیاں نظر آتی ہیں ۔ اور مخملی زردی میں اطمینان کی ہلکی سی سُرخی اس کے رخساروں میں جھلکتی ہے ۔

پھر ایک روز جب سمیع اپنے کمرے میں صحرانوردی کرتے کرتے اور "میں یہ برداشت نہیں کر سکتا نہیں کر سکتا ۔" کہتے کہتے ہار گیا تو وہ چپ چاپ سیڑھیاں چڑھ آیا اور دالان میں سوچ بنانے کے لئے رُکنے کی بجائے سیدھا باورچی خانے میں داخل ہو گیا اور اسمارہ کے پاس جا کھڑا ہوا ۔ اسمارہ کی چھوٹی بہن حسن آرا نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا ۔ وہ ٹھٹھکی اور پھر لپک کر کھڑکی میں لٹک گئی اور جھک کر ، نہ جانے کیا دیکھنے میں یوں کھو گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو جیسے سمیع اسمارہ کے روبرو کھڑا ہی نہ ہو ۔

ایک ساعت کے لئے اسمارہ کے ہاتھ کانپے، نہ جانے تعجب یا خوشی سے ۔۔۔ پھر وہ اٹھ بیٹھی اور منہ موڑ کر میز کے قریب کھڑی ہو گئی ۔

"نہیں اسمارہ! نہیں ، میں اسے برداشت نہیں کر سکتا ۔ برداشت نہیں کر سکتا ۔ میں یہاں نہیں رہوں گا ۔ میں جا رہا ہوں ۔ یہاں سے جا رہا ہوں ۔ ہمیشہ کے لئے ۔" وہ غصے میں چلایا ۔ "اچھا ۔۔۔" وہ بولی اور اس کی نگاہوں میں تمام خلا ازسرِنو جذب ہو گئے ۔ اس کے ہونٹ اور بھی بند ہو گئے ۔ اس کا چہرہ اور بھی ست گیا ۔ اور بال منہ پر ڈھلک آئے اور سیاہ بالوں میں وہ مخروطی چہرا یوں دکھائی دینے لگا ۔ جیسے کوئی چراغ سحری جھلملا رہا ہو ۔

خدا کے لئے اسمارہ ! خدا کے لئے ! اس گھر کو چھوڑ دو ۔ چلی چلو ۔ بھاگ چلو ، اس گھر سے جہاں باپ کو بیٹی کے وجود کا بھی احساس نہیں ، جہاں کسی کو احساس نہیں کہ لڑکی کی جوانی ٹماٹر کاٹتے میں بیتی جا رہی ہے ۔ جہاں تغافل حکمران

ہے ۔ بھاگ چلو اسمارہ!"
"کہاں ؟" وہ بولی جیسے دور کسی نے ہچکی لی ہو ۔
"کہیں ۔ جہاں بھی جگہ ملے ۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا ۔ میں اس تغافل کو برداشت نہیں کر سکتا ۔ نہیں کر سکتا ۔ بولو ۔ اسمارہ!"
"برداشت" اس کے ہونٹ ہلکی مسکراہٹ سے ہلے ۔
"نہیں نہیں" وہ چیخنے لگا ۔ "تم یہاں نہیں رہ سکتیں ۔ بالکل نہیں ۔ میں یہ نہیں دیکھ سکتا ۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا ۔ ورنہ میں چلا جاؤں گا ۔ ہمیشہ کے لئے ۔ یہاں سے چلا جاؤں گا ۔"
"ہوں !" باورچی خانے میں ایک آہ تیرنے لگی ۔ "آپ کسی کے لئے کیوں دکھی ہوں ۔۔ جائیے ۔"
یہ سن کر سمیع خاموش ہوگیا ، جیسے اُس کے منہ میں زبان نہ رہی ہو ۔ جیسے اس کی طاقت گویائی چھن گئی ہو ۔ اس کے گرد ایک دھندلکا پھیل گیا ۔۔۔ پھر وہ دھندلکا صاف ہو رہا تھا ۔ باورچی خانے کی دیواریں واضح ہوئی جا رہی تھیں ۔ چولہا ۔ نعمت خانہ کھڑکی میں لٹکی ہوئی حسن آرا ۔ اور بالآخر میز کے پاس کھڑی اسمارہ اور وہ چونکا ۔ "میں کہاں ہوں ۔ میں ، میں ۔۔۔ معاف کرنا میں" اور پھر چپ چاپ باورچی خانے سے باہر نکل ، سیڑھیاں اُتر کر اپنے کمرے میں بستر پر گر کر بڑبڑانے لگا ۔ "نہیں نہیں ۔ میں نہیں جاؤں گا ۔ میں اُسے چھوڑ کر نہیں جا سکتا ۔ نہیں جا سکتا ۔"
"اس کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے ملنے لگے ۔ دالان میں محراب تلے ۔ سیڑھیوں میں ۔ کوٹھے پر دودکش کی اوٹ میں اور بالآخر سمیع کے چھوٹے کمرے میں ہر بار ملاقات پر وہ دیر تک انتظار کرتا رہتا اور جب مایوس ہو جاتا تو ہاتھ میں کشیدہ اٹھائے یا کوئی چیز سنبھالے اسمارہ چپکے سے ادھر آنکلتی جیسے اتفاق سے آگئی ہو ۔ وہ یوں خاموش اور دبے پاؤں آتی تھی جیسے سورج کی پہلی کرن چپ چاپ کھڑکی کی درز سے داخل ہو کر اپنی آمد کا اعلان کئے بغیر فرش پر کھیلنے لگتی ہے اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ وہ داخل ہو چکی ہے ۔
دفعتاً سمیع کو احساس ہوتا کہ وہ آچکی ہے اور اس کے اس قدر قریب کھڑی

ہے ۔ اس پر وہ سرک کر پرے ہٹ جاتا ۔ "اسمارہ تم؟"

"جی" ایک آہ اس کے کانوں پر منڈلاتی ۔

"تم کتنی دکھی ہو اسمارہ"۔

اسمارہ کے ہونٹ اور بھی سمٹ جاتے ۔

"میں تمہیں اس مصیبت سے کس طرح بچا سکتا ہوں ۔ اسمارہ ؟"

"مجھے کیا معلوم ؟" قریب ہی کوئی کلی چٹکتی اور بند ہو جاتی اور ایک مدہوش کن خوشبو چھوڑ جاتی ۔

"میں کیا کروں ، اسمارہ کیا کروں ؟" وہ گویا اپنے آپ سے کہتا اور پھر اس کے جسم کا بند بند چٹختا اور اس کی نسیں انگڑائیاں لیتیں ۔

"آپ میرے لئے اتنے دکھی ہیں ؟ "

"نہیں نہیں" وہ چونک پڑتا ۔ "میں دکھی نہیں ہوں ۔ ایسے معلوم ہوتا ہے مجھے ۔"

"جیسے جیسے ۔ ۔۔؟ اب میں تمہیں کیا بتاؤں ۔ اسمارہ کیسے بتاؤں سمجھ میں نہیں آتا "

"جیسے جیسے تمہارا دکھ میری ۔۔۔ میری ۔۔۔ جیسے وہ میری زندگی ہو ۔۔۔ نہیں نہیں جیسے ، جیسے مجھے معلوم نہیں مجھے معلوم نہیں تم اتنی پیاری کیوں ہو اسمارہ؟"

"مجھے کیا معلوم ؟" اس کی کمانیں تن جاتیں ۔ کشتیاں ڈولتیں ۔

"میری زندگی میں ایک روشنی سی ہو گئی ہے ۔ زرد چاندنی سی مخملی سنہری روشنی ؟ کیوں؟" وہ رک گیا ۔ جانتی ہو ۔

"میں کیا جانوں" اُس کی ناک افق کی طرف اشارہ کرتی اور آن جانے میں سرک کر وہ اس کے قریب تر ہو جاتی ۔۔۔ اگر اس وقت وہ دونوں سمیع کے کمرے میں ہوتے تو اس قدر قریب ہو جاتی کہ سمیع کے گرد ایک زرد مخملی ہالہ بن جاتا گھبرا کر سمیع پیچھے ہٹنے لگتا تو الٹا اس کا گال مخملی زردی پر ٹک جاتا ۔

" تم کس قدر دکھی ہو اسمارہ؟"

"میں کیا کروں؟" اسمارہ کے بازو دوپٹہ سنبھالنے کی کوشش میں اُلجھ جاتے۔ "میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔" سمیع کی گردن تھک کر لٹک جاتی۔

"اسمارہ؟ ایک کراہ اُبھرتی۔

"جی" ایک مخملی آہ تیرنے لگتی اور ڈولتی کشتیاں ڈوب جاتیں ایک بند کلی چٹک جاتی۔ "آپ میرا غم نہ کھائیں۔ اور پھر کھل کر پھول بن جاتی اور خوشبو کا ایک ریلا نکلتا۔ اور کمرے کی دیواریں زرد ہو کر دھندلا جاتیں اور چیزیں زرد مخملی دھاریوں میں بدل جاتیں۔ اور بالآخر ایک زرد مخملی قوس طلوع ہو جاتی۔

حالانکہ وہ دونوں پروفیسر قائم علی کے گھر کے وسیع ویرانے میں ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ حالانکہ گھر کے اس حصے میں حسن آرا کے سوا اور کوئی نہ تھا اور حسن آرا بھی وہ جو مناسب وقت پر کھڑکی میں لٹک کر باہر گلی میں دیکھنے کے مہذب فن سے پورے طور پر واقف تھی۔ حالانکہ احساسِ تقدس کی وجہ سے سمیع نے اسمارہ کے دکھی ہونے کی بات کسی سے نہ کہی تھی اور بالخصوص کہ وہ سمیع اسمارہ تھے۔ جو ہمیشہ دل کی گہرائیوں میں جیتے ہیں۔ پھر بھی بات نکل گئی جیسے اسے نکل جانے کی عادت ہے۔ اور سمیع کو گھر سے تار آگیا۔ جلدی پہنچو، والدہ بیمار ہے۔" وہ گھبرا گیا اور اس قدر گھبرایا کہ اس روز سے اسے دالان کا مرمت طلب سوئچ بھی یاد نہ رہا۔ اور اسمارہ ٹماٹر کاٹ کاٹ کر ہار گئی۔ اور خلافِ معمول وہ کمان ڈھیلے پڑ گئے۔ اور کشتیاں قائم ہو گئیں۔ اور بند کلی کی پتیاں بکھر گئیں۔ اور وہ اُٹھ کر باورچی خانے میں گھومنے لگی اور گھومتی پھرتی سیڑھیاں اُتر گئی۔ اور پھر سمیع کے کمرے سے ہچکیاں اور آہیں سنائی دیں۔ "اماں بیمار ہے۔" اور پھر ایک مخملی تھپک گونجی۔ "آپ میرا غم نہ کھائیں" ۔۔۔۔ "میرا غم نہ کھائیں" ۔۔۔۔۔ اور پھر سمیع کے کمرے کا دروازہ کھلا اور سمیع اپنا ہینڈ بیگ اٹھائے باہر نکل گیا۔ اور حسن آرا کھڑکی سے لٹکتی ہوئی اسے دیکھتی رہی اور نعمت خانے کے قریب کھڑی اسمارہ کا ہاتھ لرزتا رہا۔

جب سمیع گھر پہنچا تو وہ گھبرا گیا۔ ماں چارپائی پر پڑی ہونے کے بجائے

ہاتھوں پر مہندی لگائے تخت پوش پر بیٹھی تھی ۔ بہنیں ڈھولک بجانے اور گانے میں مصروف تھیں اور والد انتظامات کرنے میں لگے تھے ۔ انہوں نے سمیع کو دیکھا ۔ "تم آ گئے بیٹا ۔ اچھا ہوا تم آ گئے ۔ جاؤ اندر بیٹھو ۔ آج تمہارا نکاح ہے ۔"

دفعتاً بہنوں کا گیت بین میں بدل گیا ۔ ماں کے ہاتھوں سے خون رسنا شروع ہوگیا ۔ اس نے بصد مشکل اپنے آپ کو سنبھالا اور کمرے میں داخل ہو کر چارپائی پر گرا دیا ۔ اور پھر ایک دھندلکا ۔ ایک خونی دھندلکا ، اور اس دھندلکے میں دو ڈولتی کشتیاں ، دو زرد پتوار آپ میرا غم نہ کھائیں ۔ ۔ ۔ میرا غم نہ کھائیں میں آپ"۔

نکاح کی رسم کے اختتام کے بعد وہ واپس آگیا ۔ لیکن اب وہ قائم علی کے گھر نہ جا سکتا تھا ۔ کیونکہ رخصت کرتے وقت ماں نے صاف کہہ دیا تھا ۔ "وہاں نہ ٹھہرنا بیٹا ، لوگ کیا کہیں گے ۔ گاؤں والوں نے تو پہلے ہی ہمارا جینا محال کر رکھا ہے ۔" اماں نہ بھی کہتی تو بھی وہ وہاں نہ جا سکتا تھا ۔ کس منہ سے جاتا وہاں ۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ مکان ، وہ دالان ، وہ زینہ اور وہ کمرہ اس پر انگلیاں اٹھا رہے تھے "۔ ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ وہی ہے وہ !"

اسٹیشن سے اُتر کر وہ سیدھا بورڈنگ پہنچا اور اپنے کمرے میں دھم سے چارپائی پر گر گیا ۔ "میں یہ برداشت نہیں کر سکتا"۔ اور برداشت کرنے کی شدید کوشش میں اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ۔

ایک روز جب وہ کتابوں ، الماریوں اور کھڑکیوں کو بہ آواز بلند برداشت نہ کرنے کی دھمکی دے رہا تھا ۔ تو اس کا پڑوسی دوست راز چپکے سے اطلاع کئے بغیر اندر آ گھسا ۔

"تمہاری قوت برداشت کے کیا کہنے ہیں ، سمیع !" راز نے ہنس کر کہا۔

"ہائیں تم ؟" سمیع گھبرا گیا ۔

"اس احتجاج کے باوجود تم برداشت کئے جا رہے ہو"۔

"نکل جاؤ میرے کمرے سے باہر نکل جاؤ"۔ وہ چلایا ۔ "میری اجازت کے بغیر تمہیں اندر داخل ہونے کی جرأت کیسے ہوئی ؟"

"تمہاری قوتِ برداشت پر مجھے اعتماد ہے"۔ راز کی آواز میں بلا کی طنز تھی سمیع اس کی طرف جھپٹا اور پھر، پھر نہ جانے کیا ہوا۔ دفعتاً وہ رکا اور راز کے شانے پر سر رکھ کر رونے لگا۔ "اس نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔ راز۔ پاگل کر دیا ہے۔ لیکن کتنی پیاری ہے وہ، کتنی پاکیزہ راز !! ۔ ۔ ۔ صرف ایک بار راز۔ صرف ایک بار۔ ایک بار مجھے اس سے ملا دو۔ ۔ ۔ صرف ایک بار"۔ اور پھر کئی دن تک سمیع کے کمرے میں منتوں کی آواز آتی رہی "صرف ایک بار۔ ۔ ۔"

اور راز کی وساطت سے وہ دونوں ایک بار ملے۔ اسی حبشی باغ میں۔ فوارے کے قریب۔

اس روز مطلع غبار آلود تھا۔ آسمان پر مٹیالے بادلوں کی دھول اڑ رہی تھی۔ ہوا میں مٹی کے ذرات آوارہ تھے۔ زرد ٹہنیاں سرسبز پتوں کو تھپک رہی تھیں۔ فوارہ ٹپ ٹپ آنسو بہا رہا تھا۔ اور وہ پتھریلے معصوم بچے ایک دوسرے سے منہ موڑے بسور رہے تھے۔ ۔ ۔ اور فوارے تلے اسمارہ کمان تانے بیٹھی تھی اور دوسرے بینچ پر سمیع بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ اور دونوں بینچوں کے درمیان راز سرگرداں تھا اور خمیدہ ٹہنیاں مڑمڑ کر جھانک رہی تھیں اور لمبی گھاس کے زرد ڈنٹھل سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اور باغ کی روشیں دور دور سے آکر ان کے گرد حلقہ کئے ناچ رہی تھیں۔

"اس سے کہہ دو راز میں گردن زدنی ہوں۔ میں مجرم ہوں۔ گنہگار ہوں۔ لیکن نہیں اس سے کچھ نہ کہو۔ مجھے اب اسے پیغام بھیجنے کا کوئی حق نہیں"۔ ۔ ۔ "نہیں نہیں راز اس سے کہہ دو میری صرف ایک بات مان لے۔ میری آخری التجا۔ آخری اسے کہہ دو کہ وہ مجھ سے نفرت کرے۔ نفرت! میں اسی قابل ہوں اسی قابل۔ سمیع نہ جانے کیا بڑبڑا رہا تھا۔ اور راز حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دو کھنچی ہوئی کمانیں۔ ڈولتی کشتیاں۔ ایک بجھا بجھا سا زرد مگر جھلس دینے والا شعلہ۔ اسے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کہاں ہے کون ہے، کیوں ہے۔ ایک مدہوشی۔ ایک مسلسل دھنکی۔ مدھم مگر پیہم اور وہ ٹپ ٹپ کرتے آنسو۔ پتھر کے سرخ کٹورے سے گرتے ہوئے آنسو اور وہ

درختوں پتوں ، ٹہنیوں کا دھند لکا اور اس میں کمان کی طرح کھنچی ہوئی وہ زرد مخملی پُرنم قوس ۔ دفعتاً دو زرد بازو سیاہ ریشمیں درخت سے بل کھاتے ہوئے نکلے اور اس کی طرف بڑھے ۔ ۔ ۔ اس کے شانے چاٹنے لگے جن کے لمس سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا اور گردن سے تڑاخ سی آواز آئی ۔ ۔ اور اس کا سر کٹ کر اڑا اور شاخ سے لٹکنے لگا ۔ ۔ ۔ اور دفعتاً اس حیران کن طلسمی منظر میں ایک مفہوم پیدا ہوگیا ۔ وہ ویرانہ آباد ہوگیا ۔ اور اس گھٹے گھٹے ماحول میں کائنات کی وسعتیں انگڑائیاں لینے لگیں ۔

پھر فضا میں ایک رنگین آہ گونجی ۔ "ان سے کہہ دو راز وہ میرا غم نہ کھائیں"۔ "نہیں نہیں" پاس ہی سمیع کی آواز گونجی ۔ راز نے بصد مشکل سر اُٹھایا ۔ اسمارہ پر سمیع جھکا ہوا تھا ۔ "نہیں نہیں میں تمہارے سامنے نہیں آسکتا ۔ تمہیں منہ نہیں دکھا سکتا ۔ میں مجرم ہوں ۔ تمہارا مجرم ۔ ۔ ۔ ان آنکھوں کو نکال دو اسمارہ !" اس نے اس کا بازو کھینچ کر اپنے منہ پر رکھ لیا ۔ نکال دو اس سر کو کاٹ دو جو تسلیم میں خم ہوگیا ہے ۔ ۔ ۔ سمیع کا سر جھک کر اسمارہ کی گود میں ڈھیر ہوگیا جیسے کٹ گیا ہو ۔

پتھر کے معصوم بچے تالیاں بجانے لگے ۔ زرد مخملی قوس نے بھورے بادل کو تھام لیا اور شام نے اپنے سیاہ پردے کھول دیئے ۔ پھر وہ دونوں باغ میں ملنے لگے ۔

اسمارہ سیر کی غرض سے اتفاقاً ادھر آنکلتی اور فوارے کے قریب پہنچ کر تھک جاتی اور بینچ پر بیٹھ کر سویٹر بننے لگتی اور سمیع دوسرے بینچ پر بیٹھ کر فلکیات کی کتاب کھول لیتا ۔ پھر اتفاق سے راز آ پہنچتا جسے دیکھ کر اسمارہ کی انگلیاں اور بھی تیز ہو جاتیں ۔ اور کمانیں اور بھی تن جاتیں اور سمیع حیرانی سے چلاتا "تم راز ، تم یہاں ؟" اور راز کے شانوں کو سانپ چاٹتے اور اس کا سر بھُن سے اُڑ جاتا جیسے پٹاخے کو آگ دکھا دی گئی ہو ۔ اور پھر درخت کی بل کھاتی ٹہنیوں سے لٹکتے ہوئے وہ پتھر کے ان معصوم بچوں کی مدھم سرگوشیاں سنتا ۔

" ۔ ۔ ۔ ہاں پیارے ، اور تم بھی کچھ کچھ عجیب"۔

پھر وہ دونوں چپ چاپ بورڈنگ پہنچتے ۔ راز اور سمیع ۔ اور سمیع چلّانے

لگتا ۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا ، مجھ سے اس کا دکھ دیکھا نہیں جاتا ۔ اس کی ویرانی ۔ اس کی تنہائی ۔ ۔ ۔ میں خود تلاش کروں گا ۔ وہ کتنا خوش نصیب ہوگا ۔ جسے اسمارہ حاصل ہو جائے گی ۔ وہ کتنا خوش نصیب ہوگا !! ۔ ۔ ۔ کتنی پاکیزہ ہے وہ کتنی بلند ، کتنی معصوم !!!"

بالآخر وہ دن آگیا جب وہ اس خوش نصیب کو دیکھ سکتا تھا ۔ جسے اسمارہ حاصل ہو رہی تھی ۔ وہ اس کے بدن کو چھو سکتا تھا اس کی زرنگار چپلی کو تھام سکتا تھا جو رکاب میں ٹکی ہوئی تھی ۔ کتنی خوبصورت چپلی تھی وہ اور اس کے دو بڑے بڑے سے ہاتھ جن میں گھوڑے کی لگام تھامی ہوئی تھی ! ان ہاتھوں کو اسمارہ کو چھونے ، اسے تھامنے اور تھپکنے کا حق حاصل ہونے والا تھا ۔ ان پاؤں کو اس کی طرف چل کر جانے کی آزادی مل رہی تھی ۔ لیکن وہ اس کا چہرا نہ دیکھ سکتا تھا جسے پھولوں کی لمبی لمبی لڑیاں ڈھانپے ہوئے تھیں ۔ "شکر ہے راز ! وہ چلایا شکر ہے ۔ نغمے کو سامع مل گیا ۔ کتنی خوشی کی بات ہے ! کاش میں اس خوش نصیب کا چہرہ دیکھ سکتا !"

لیکن چہرا دیکھ کر وہ مایوس ہوگیا ۔ اس نے ایک جھرجھری محسوس کی ، ایک نفرت بھری جھرجھری ۔ اور وہ راز کی طرف بھاگا ۔ ۔ ۔ "راز ! وہ وہ ۔" وہ ہانپ رہا تھا ۔ "وہ تو گوشت کا ایک لوتھڑا ہے ۔ خون سے بھرا ہوا لوتھڑا ۔ ایک روغنی طنبورہ جس میں کوئی تار نہیں جو تاروں سے واقف ہی نہیں ۔ ۔ ۔ وہ ایک ہجوم ہے راز ایک شوروغل سے بھرا ہوا ہجوم ، وہ تنہائی اور خاموشی کے نغمات سے بے بہرہ ہے ۔ راز میں مجرم ہوں ۔ میں مجرم ہوں ۔ میں نے اسے تباہ کر دیا ۔ تباہ کر دیا ۔" اور پھر کئی ایک دن اس کے کمرے سے آہوں اور کراہوں کی آوازیں آتی رہیں ۔ پھر کمرے سے بہ آواز بلند فلکیات کا ورد سنائی دینے لگا جیسے کوئی رو رہا ہو ، چیخ رہا ہو ۔ کائنات سے شکایت کر رہا ہو اور پھر اس کے لئے کمرے میں بند رہنا ناممکن ہوگیا اور وہ حبشی باغ کے اس کونے میں بیٹھ کر فلکیات کا ورد کرنے لگا ۔ ۔ ۔ "ہائیں" مخملی آہ سن کر وہ چونکا سامنے بینچ پر اسمارہ بیٹھی سوئیٹر بن رہی تھی ۔ وہ اٹھ بیٹھا ۔ "تم ! تم یہاں !!! تم چلی جاؤ ۔ یہاں سے چلی جاؤ" ۔ وہ اس کی طرف جھپٹا ۔ "چلی جاؤ ۔ تم کسی اور کی ہو ۔

تمہیں یہاں آنے کا کوئی حق نہیں"۔ اور اسمارہ کی کمانیں تنی رہیں ، کشتیاں ڈولتی رہیں اور وہ چپ چاپ سویٹر بننے میں مصروف رہی ۔ ۔ ۔ وہ چلاتا رہا ۔ حتّٰی کہ تھک گیا ۔ اس کی گردن جھک گئی اور لٹکتے لٹکتے مخملی زردی کی جھیل میں ڈوب گئی اور دو سنہرے بازو نکل کر اسے تھامنے میں مصروف ہوگئے ۔ "آپ میرا غم نہ کھائیں ، میرا غم نہ کھائیں آپ" اور پھر آہستہ آہستہ فضا پر خاموشی چھا گئی اور اس خاموشی کے نغمے سے بے خود ہو کر پاس والی جھاڑی سے راز باہر نکل آیا اور اس تنی ہوئی کمان کے روبرو مجرم کی طرح بیٹھ گیا ۔ ۔ ۔ "تم ان سے کہہ دو راز"۔ ایک سنہری آواز گنگنائی ۔ ۔ ۔ اور سیاہ جھاڑی سے زرد سانپ نکلے اور راز ضحاک بن گیا ۔ پھر ایک پٹاخہ ۔ ۔ ۔ اور راز فضا میں تحلیل ہوگیا ۔ اور سبز درختوں میں بھوری شاخیں بل کھانے لگیں ۔ اور فوارے نے اپنے بال بکھیر کر "حال" کھیلنا شروع کر دیا ۔

ہاں حبشی باغ کے اس ویران حصے میں اب بھی آتے ہیں ۔ ۔ ۔ فلکیات کا وہ طالب علم جواب فلکیات کے محکمہ میں ملازم ہے اور اس کا دوست راز جسے ضحاک بننے کی لت پڑچکی ہے اور گلابی ، اضطرابی انگلیوں والی اسمارہ اور ان کے وہاں آتے ہی بھوری ٹہنیاں بل کھا کر باہر نکل آتی ہیں ۔ جھاڑیاں دب کر بیٹھ جاتی ہیں ۔ اور سرخ پتھر کا فوارہ اچھل اچھل کر جھانکتا ہے اور معصوم بچے سرگوشیاں کرتے ہیں ۔

"۔ ۔ ۔ ہاں پیارے اور تم بھی کچھ کچھ عجیب !"

○

راں ٹڑیاں

"بائیں" پھولدار لہنگے والے نے مونچھیں مروڑتے ہوئے کہا ۔ "سچ ؟"

"ہاں۔" بڈھے نے داڑھی جھاڑ کر کہا ۔ "سب کا رکھ رکھاؤ اکیلی کرے ہے وہ بدراں"۔

"گھر میں کوئی نہیں کیا؟"

"سبھی کھیت پر رہیں ہیں ۔ بھائی ، باپو ، چاچا ساری بستی میں چار ایک مرد ہوں گے ۔ ویسے آتے جاتے رہتے ہیں ہفتے میں ایک بار"۔

"اچھا" نوجوان ہنسا ۔ ۔ ۔ "معلوم ہوتا ہے ۔ انہیں کوئی ملا نہیں"۔

بڈھا قہقہہ مار کر ہنسا ۔ "میاں یہ راں ٹڑیاں ہے راں ٹڑیاں سمجھے ۔ ۔ ۔ وہ پھر ہنسنے لگا ۔ اپنے چوہدری کا گھر سونے سے بھرا ہے ۔ پر یوں سمجھو جیسے مندر میں مورتی ۔ کسی کی کیا مجال ہے کہ آنکھ اٹھا کر دیکھے ۔ لو وہ رہا کنواں ۔ درختوں کے اُس جھنڈ میں ہے ۔ پی لو پانی جا کر اس جھنڈ میں ۔ اللہ بیلی ۔" یہ کہہ کر بڈھا ڈنڈی پر اتر گیا ۔

"بدراں ۔ ۔ ۔" نوجوان مسکرا دیا لہنگا سنوار کر مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے زیرِ لب بولا ۔ "راں ٹڑیاں کی بدراں"۔

"راں ٹڑیاں ۔ ہو اوراں ٹڑیاں آں آں ۔

دور کہیں سے پہاڑی کی تان سنائی دی ۔

جس جاں ٹڑیاں ، اوس نہ ماں ٹڑیاں ۔ جس ماں ٹڑیاں ۔ آن جانڑیاں ۔

"راں ٹڑیاں ۔ ہو اوراں ٹڑیاں ۔ آں آں ۔

چناب کے شمال مغرب میں چلے جاؤ تو پتن وال سے آگے درختوں کی تعداد کم ہو جاتی ہے اور قد چھوٹا ۔ درختوں کے جھنڈ اور گاؤں سرک سرک کر دور ہٹتے جاتے ہیں ۔ زمین پتھریلی ہوتی جاتی ہے اور مٹی کا رنگ لاکھا ۔ یہ علاقہ پلچھی کا

ہے ۔ جس کے عین وسط میں راں ڑیاں کا گاؤں آباد ہے ۔

گاؤں کے ارد گرد خود رو گلابڑی کی جھاڑیاں دیکھ کر یقین نہیں پڑتا کہ اس زمین میں کاشت کرنے کے لئے اس قدر مشقت کی ضرورت پڑتی ہوگی ۔ لیکن وہاں کے مردوں کو دیکھ کر اجنبی راہ گیر ایک ساعت کے لئے رک جاتے ہیں ۔ اونچا لمبا قد ۔ ابھری چھاتی ۔ فراخ شانے ۔ پٹھوں میں موروثی جدوجہد کا تناؤ ۔ آنکھ میں رد عمل کی جھلک ۔ شاید کامیابی ۔ اور عورتوں کو دیکھ کر سبھی دیکھتے انہیں ۔ چونکہ وہ پردہ وردہ نہیں جانتیں ۔ لیکن وہی تناؤ قدو قامت ۔ شاہانہ چال ۔ نڈر نگاہیں جو شرما کر کسی کو دعوت دینے کے فن سے بیگانہ ہیں اور بھرا بھرا مٹیار جسم گھبرا کر یا سمٹ کر راہگیر کی توجہ اکسانے سے بے نیاز ہے ۔ ان کی آنکھ چھلکی ہوئی ہونے کے باوجود چھلکتی نہیں ۔ سرخ ہونے کے باوجود گال شرم سے تمتماتے نہیں ۔ شاید راں ڑیاں کے مردوں نے ان کے نسائی پہلو کو عریاں دیکھا ہو ۔ لیکن اجنبی ۔ ۔ ۔ اجنبی کو تو وہ یوں دیکھتی ہیں ۔ جیسے سڑک پر گڑا ہوا کھمبہ ۔ شاید اسی لئے اُس علاقے کی عورتوں کو راں ڑیاں کہتے ہیں ۔ بہر حال پلچھی کی عورتیں واقعی راں ڑیاں ہیں اور راں ڑیاں کی ہر عورت ملکہ ۔

وہ سُرمہ سیندور اور اخروٹ کے چھلکے کی شوقین ہیں ۔ رنگدار کپڑوں کی دلدادہ اور خشبو ۔ ۔ ۔ خشبو سے تو انہیں عشق ہے عشق ۔ حتیٰ کہ لونگ ابالے پانی بغیر نہاتی نہیں ۔ شاید اسی لئے انہیں راں ڑیاں کہا جاتا ہے ۔ لیکن اس نفیس مزاجی کے باوجود ان کے انداز میں نسائی نمائش نہیں دعوت نہیں ۔ جیسے مندر ہو ۔ مورتی ہو ۔ پوجا کا سامان ہو ۔ سیس نوانے کی آگیا نہ ہو ۔

شاید ان کا ”عورت“ کو چھپائے رکھنا تلاش پر مائل کرنے کا انوکھا انداز ہو ۔ لیکن راں ڑیاں کے مرد متلاشی دکھائی نہیں دیتے ۔ ان میں جستجو کی بیتابی نہیں بلکہ پالینے کا نشہ ہے ۔ وہ عموماً اپنی زمین پر رہتی ہیں ۔ انہیں اس پتھریلی زمین کو تسخیر کرنے کا شوق ہے اور اپنی رنگین مگر سنگین راں ڑیاں پر بھروسہ ہے ۔

قاسو پہلی مرتبہ اس علاقہ میں آیا تھا ۔ ویسے تو بیلی پر سوار ہو کر رات رات میں سو سو میل کا سفر کرنا اس کا شغل تھا ۔ لیکن عموماً پو پھوٹنے سے پہلے

وہ اپنے گاؤں میں واپس پہنچ جایا کرتا تھا جاکھڑاں کے گردو نواح میں کون تھا جو قاسو اور ببلی کو نہ جانتا تھا لیکن وہ سب اس کے متعلق اظہارِ خیال کرنے سے گریز کرتے تھے بہر حال ہر کوئی کوشش کرتا کہ قاسو کے بارے میں لاعلمی ظاہر کرے ۔ آدھی رات کو لوگ ببلی کا ہنہنانا سنتے ٹھٹک جاتے اور پھر معاً بات ٹالنے کے لئے کوئی موضوع چھیڑ دیتے پوپھٹتے وقت ہل چلاتے ہوئے کسان قاسو کی تان سن پاتے تو دوسری جانب منہ موڑ کر شدت سے کام میں مصروف ہو جاتے "تاتا ۔ ستاتا" چلتے ہوئے بیلوں کو ہانکنا شروع کر دیتے ۔ عورتیں معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسری کی طرف دیکھتی ڈر کر دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیتیں اور بالآخر مسکرا کر دہی بلونے میں مصروف ہو جاتیں ۔

اس روز قاسو اور ببلی نوسار کی جانب آئے ببیلی پورہ کے پاس جہاں سے نوسار کو ڈنڈی نکل جاتی ہے ، قاسو نے ببلی کو موڑنے کے لئے لگام کھینچی ۔ لیکن خلافِ معمول ببلی اڑ کر کھڑا ہوگیا ۔ قاسو نے دوسری مرتبہ اسے موڑا تو وہ بدک کر رک گیا ۔ قاسو نے غصے میں ایڑ لگائی ۔ تو بھی اپنی جگہ سے نہ سرکا پھر نہ جانے کیا خیال آیا ۔ قاسو نے اسے گردن پر تھپکی دی اور بولا "اچھا ببلیا تیری مرضی نہیں تو نہ سہی ۔ آج قاسو ببلی کی مرضی پر چلے گا ۔" یہ کہہ کر اُس نے لگام ہاتھ سے پھینک دی اور ببلی ہوا ہوگیا ۔ اندھیرے میں قاسو کو معلوم نہ تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے ۔ لیکن اسے یقین تھا کہ ببلی اسے واپس لے آئے گا ۔ اس لئے وہ بے پرواہی سے بیٹھا رہا حتےٰ کہ وہ راں ٹیاں آپہنچے ببلی رُک گیا اور قاسو نے پگڑی سر تلے رکھی اور سو گیا ۔ شام کو وہ جاگا تو اسے بڑی شدت کی پیاس لگی تھی ۔ پانی پینے کے لئے خشک درختوں کے اُس ویران جھنڈ سے باہر نکلا تو اس بڈھے سے ملاقات ہوگئی ۔

"راں ٹیاں ۔ ۔ ۔ ہو راں ٹیاں ۔
کن جاں ٹیاں نے کن ماں ٹیاں"۔

پانی پینے کے بعد مونچھ مروڑتا ہوا وہ گاؤں کی طرف چل پڑا ۔

قاسو ڈیوڑھی سے ہوتا ہوا ایک کھلے صحن میں پہنچا ۔ "چوہدری"۔ اُس نے آواز دی "کون ہے"۔ بدراں نے سرسری طور پر آواز دی اور چرخہ کاتتے

میں لگی رہی ۔ قاسو نے سر اٹھا کر دیکھا سفید سفید بھرے ہوئے ہاتھ میں تاگا اور حرکت میں بے نام سی لچک ۔ نسائیت کا پتہ دے رہے تھے ۔ سر اٹھائے بغیر بدراں نے دوپٹے کو سرکا کر ماتھا ڈھانپ لیا اور بولی "کون ہے ؟"

"پیاس لگی ہے"۔ قاسو دروازے میں کھڑا ہوگیا ۔

وہ اٹھ بیٹھی ۔ "لسی پیو گے ویر یا دودھ"۔

"لسی" قاسو نے اس کے ہاتھ کی چوڑیوں کو گھورتے ہوئے کہا ۔

بیٹھ جاؤ ویر ۔ بدراں نے اس کی طرف دیکھے بغیر پیڑھی ادھر سرکا دی اور گڑوا اٹھا چاٹی کے قریب جا بیٹھی ۔ اس نے اتنی بڑی چاٹی کو یوں اٹھا لیا گویا وہ تنکوں کی بنی ہو ۔ "میٹھا کراؤں یا نمک ۔ کیوں ویر"۔ "نہیں نہیں ۔ نمک نہیں" وہ چونک کر بولا ۔ اجنبی کی آواز میں اضطراب کی جھلک پا کر اس نے آنکھ اٹھا کر پہلی مرتبہ غور سے اُس کی طرف دیکھا ۔ وہ ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ اس بات پر بدراں کے ماتھے پر تیوری پڑ گئی ۔ "میٹھا ڈال دوں"۔ وہ منہ موڑ کر بولی ۔ "نہیں" قاسو نے جواب دیا ۔ " ایسے ہی دے دے"۔ بدراں نے منہ موڑے بغیر گڑوا ادھر بڑھا دیا ۔ دو ایک ساعت وہ یونہی گڑوا لئے کھڑی رہی ۔ لیکن اجنبی نے گڑوا نہ پکڑا ۔ بدراں نے مڑ کر دیکھا وہ حریص نگاہوں سے اس کے کڑوں کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ یہ دیکھ کر وہ مسکرا دی ۔ ماتھے کی تیوری اتر گئی "لے ویر لسی"۔ وہ بولی گڑوا دے کر وہ اپنی جگہ پر آبیٹھی اور آنکھ بچا کر اسے دیکھنے لگی ۔ وہ گڑوے کے کنارے کی اوٹ لے کر مکان کا جائزہ لے رہا تھا ۔

"پردیسی ہو ویر" بدراں نے سرسری طور پر پوچھا ۔

"کہیں دُور جانا ہے"۔

"نہیں نہیں ۔ ادھر ہی کام تھا"۔

"راں ڑیاں میں ؟"

"ہاں ہاں یہاں پاس ہی اُدھر"۔

"اب روٹی کھا کر ہی جانا ویر"۔

"روٹی ۔ نہیں نہیں ۔ مجھے جلدی ہے"۔ غٹاغٹ لسی پی کر وہ کھڑا

ہوگیا"۔ یہ لو ۔ اس نے گڑوا بڑھایا ۔ وہ بیٹھی رہی ۔ غالباً وہ اسے دعوت دے رہی تھی کہ گڑوا زمین پر رکھ دے لیکن اُسے منتظر دیکھ کر بدراں کو اٹھنا ہی پڑا ۔

گڑوا پکڑتے ہوئے اُس نے آخری مرتبہ اس کے کڑوں پر نگاہ ڈالی ۔

"پسند ہیں ویر؟" وہ خشک لہجے میں بولی ۔

"کیا ؟" وہ چونکا ۔

وہ کڑے اتارنے لگی ۔ "یہ کڑے ۔ میری طرف سے اپنی گھر والی کو دے دینا ۔ میری بھابی کو"۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا ۔ "تکلیف نہ کرو ۔ کڑوں کی کیا کمی ہے ۔ گھر والی بھی ہو"۔

"کمی نہیں ویر تو اس کام کا فائدہ ؟"

"کونسا کام ؟"

"میری مانو تو یہ کام چھوڑ دو"۔

وہ پھر ہنسا ۔ "ہم باکھڑاں والے دان نہیں لیتے ۔ ہاتھ کا کمایا کھاتے ہیں"۔ اس نے بازو دکھاتے ہوئے کہا ۔

"اسے ہاتھ کا کمایا نہیں کہتے ویر"۔

"اپنا اپنا کام ہے ۔ اپنی اپنی بولی ۔ تجھے زیادہ فکر ہے تو لا پلا دے نمک والی لسی"۔ اس نے معنی خیز انداز سے کہا ۔ "پھر تو تسلی ہو جائے گی"۔

بدراں کی آنکھیں انگارہ ہوگئیں ۔ میں راں ڑی ہوں ویر ہم تسلی نہیں چاہتے ۔ تسلی دیتے ہیں ہم میں نے تجھے ویر کہا ہے میں پھر بھی لحاظ کروں گی تیرا راں ڑیاں میں اور کسی نے تجھے ویر نہیں کہا ۔ ٹھہر ذرا ۔ ۔ ۔ ادھر آ ۔ اُس نے قاسو کو للکارا ۔ وہ ایک بچے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا ۔ بدراں نے صندوق کھولا ۔ "یہ دیکھ یہ چوڑیاں ۔ چوک ۔ ہنسلی تعویذ" اور اُس نے کڑے اور ہار اتار کر وہیں ڈھیر کر دیئے ۔ پھر جلدی جلدی قفل لگا چابی طاقچے میں رکھ کر بولی۔ "یہاں ہوگی چابی ۔ اندر والے صندوق سب کھلے ہیں ۔ دروازے کھلے ہوں گے ۔ میں وہاں سوتی ہوں ۔ اس پلنگ پر ۔ ۔ ۔ اکیلی جب تیرا جی چاہے آجائیو ویر ۔ صرف جاتے ہوئے مجھے جگا دینا ۔ پھر اگر تو

گٹھڑی باہر لے جائے تو تیری اور اگر تو یہاں آنے سے پہلے کسی اور جگہ یہ کام کرے تو اپنے باپ کا نہ ہوگا ۔ سنا تو نے"۔

"عورت کے ساتھ شرط باندھوں"۔ وہ ہنسا ۔

"عورت" وہ ہنسی ۔ "یہ راں ڑیاں ہے ویر ۔ راں ڑیاں"۔

"راں ڑیاں ۔ ۔ ۔ اوراں ڑیاں"۔

دور کسی کے گانے کی آواز آئی ۔ وہ چونکا ۔ جیسے کسی نے اس کی مردانگی کو للکارا ہو ۔

بدراں نے سر اٹھایا اور یوں تن کر کھڑی ہوگئی جیسے لڑائی کا ڈھول سن کر کوئی سورما ۔ جب تیرا جی چاہے آجائیو"۔

دیوار پھاندنے سے پہلے اسے خیال آیا ۔ بھلا آزماؤں تو سہی ، کیا وہ سچ کہتی تھی کیا واقعی دروازہ کھلا ہے اور وہ دروازے کی طرف چلا آیا ۔

اُف کس قدر اندھیری ہے یہ رات اس نے سوچا ۔ آخر عورت ہے نا ۔ مسکرا کر اس نے پٹ پر انگلی کا دباؤ دیا ۔ دروازہ کھلا تھا ۔ ہوں ۔ کتا ہوگا ۔ کتا !! وہ پھر مسکرایا اور اندر داخل ہوگیا ۔ آہٹ کرنے کے باوجود کوئی آواز نہ آئی ۔ اونہوہ اس نے سر ہلایا ۔ طاقچہ پر دیا ٹمٹما رہا تھا ۔ پلنگ پر چادر لپیٹے وہ سو رہی تھی ۔ اس کے علاوہ مکان خالی پڑا تھا ۔ دیئے کے پاس صندوق کی چابی دیکھ کر اُسے حیرانی ہوئی ۔

گٹھڑی باندھ کر وہ بدراں کے سرہانے آ کھڑا ہوا ۔ فضول بے آرام کرنا اُس نے سوچا ۔ جگا بھی دوں تو کیا فرق پڑ جائے گا ۔ معاً اُسے خیال آیا کہ وہ کس قدر نڈر تھی ۔ ورنہ یوں بے فکر گہری نیند میں پڑے رہنا آسان کام نہیں ۔

قاسو نے بدراں کی بائیں کلائی پکڑ کر اُسے ہلایا ۔ بدراں نے کروٹ بدلی ۔ لیکن اُس کی آنکھ نہ کھلی ۔ دوبارہ قاسو کے جھنجھوڑنے پر اُس نے آنکھیں کھول دیں ۔ ایک ساعت کے لئے جوں کی توں پڑی رہی ۔ پھر اس نے لپک کر دائیں ہاتھ سے قاسو کی کلائی پکڑ لی اور اُٹھ کر بیٹھ گئی ۔ بولی ۔ "اب اگر تو کلائی چھڑا لے تو وہ گٹھڑی تیری ہے"۔

وہ ہنس پڑا اور بے پرواہی سے ہاتھ چھڑانے کے لئے جھٹکا دیا ۔ لیکن بدراں کی گرفت اور بھی آہنی ہوگئی ۔ ابھی وہ دوسرا جھٹکا دینے کی سوچ رہا تھا کہ بدراں نے کلائی مروڑ کر اُسے چارپائی پر گرا لیا ۔ ”آرام سے بیٹھ کر ویر“ وہ بولی ”لے اب چھڑا“ اس نے دونوں ہاتھوں سے کلائی پکڑ کر کہا ۔

قاسو غصّے سے آگ بگولا ہوگیا ۔ لیکن بدراں کی گرفت بلا کی تھی ۔

ایک بار پھر وہ چلّائی ۔ قاسو نے دوسرے ہاتھ سے اُسے پکڑنے کی کوشش کی ۔ اِس بات پر وہ بھوکی شیرنی کی طرح اُٹھ بیٹھی ۔ ”افسوس ہے کہ میں نے تجھے ویر کہا ہے ورنہ“ ۔ اُس نے قاسو کو دھکا دیا اور وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرایا ۔

کچھ دیر کے لئے وہ خاموش کھڑا رہا ۔

”میں تو تجھے آزما رہا تھا ۔“ قاسو نے اپنا انداز بدلا ۔

”تو آزما دیکھا“ وہ اکڑ کر بولی ۔

”تو نے مجھے ویر کہا ہے“ وہ مسکرایا ۔

”ہاں ۔“ وہ بولی ”ورنہ ۔ ۔“

بیلی کے ہنہنانے کی آواز سن کر وہ چونکا ۔ ”اچھا میں جاتا ہوں ۔“

”قول دے پہلے ۔“ وہ مسکرائی ۔

”اوہوں“ اس نے سر ہلایا ۔ ”مجھ سے نبھایا نہ جائے گا ۔“

”اچھا ۔“ وہ سوچ کر بولی ۔ ”نہ سہی ۔“

”ادھر نہ آؤں گا کبھی راں ڑیاں کو ۔“

”تو دودھ پی کر جا ۔“

”ضروری ہے کیا ؟“

”ہاں“ وہ بولی یا قول دے یا دودھ پی کر جا ۔ یہاں کی ریت ہے ۔“

”اچھا“ وہ بیٹھ گیا ۔ ”لا دودھ ۔“

بدراں اٹھ کر کاڑھنی کی طرف چلی ۔ ڈول میں دودھ ڈالا ۔ پھر اندر جا کر شکر تلاش کرنے لگی شکر کے علاوہ وہ دودھ میں سبز سا سفوف گھول کر لے آئی ۔

قاسو نے اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھا ۔

"اوہوں ۔ زہر نہیں ۔" وہ بولی ۔ "ویر کو زہر نہیں دیتے ۔"

"اچھا راں ڑی"۔ وہ بولا ۔ "جو چاہے دے دے اب کیا ہے" اور غٹاغٹ پی گیا اور پھر ۔

"اللہ بیلی" کہہ کر وہ صحن کے اندھیرے میں غائب ہوگیا ۔

جاکھڑاں کے لوگ چند دن تو خاموش رہے ۔ پھر دبی دبی باتیں شروع ہوگئیں ۔ کسی نے کہا ۔ "میں کہتی ہوں تم نے سنا کچھ ۔ اب تو بیلی ساری ساری رات گلیوں میں ہنہناتا رہتا ہے" کوئی بولی "اچھا نہ ہوگا ۔ اللہ مارا تیسری نے کہا ۔ "اوں ۔ اچھا نہ ہوگا ۔ بھلا چنگا پھرتا ہے"۔

رات کے وقت ہر آہٹ پر کسانوں کے کان کھڑے ہو جاتے ۔ پھر کوئی بول اُٹھتا "اوہ ۔ ۔ ۔ یہ تو پگلی چلا رہی ہے صبح سویرے پو پھوٹنے کے وقت وہ متوقع نظروں سے دیکھتے اور پھر وارے میں جا کر چہ میگوئیاں کرتے ۔ "چھوڑ دیا اپنا کام"۔ "بھئی اللہ ہی جانے" کہتے ہیں رات بھر پیر جیلانی کے روضہ پر سویا تھا"۔ "بس یہ تو پتے کی کہی تو نے اجی بڑی کرامت والے ہیں وہ"۔

ہر جگہ قاسو کی بات چھڑ جاتی ۔ اس ہر بات میں قاسو کی اس تبدیلی کا ذکر چل نکلتا ۔ قاسو کے متعلق ۔ پہلے جس قدر چپ رہتے تھے وہ اب اسی قدر زیادہ باتیں کرنے لگے ۔

قاسو کا بھائی ماجو آپ حیران تھا ۔ اگرچہ قاسو کے دھندے کے حق میں نہ تھا مگر اب اس کے اسے چھوڑ دینے پر یوں چڑ گیا جیسے اُسے قاسو کی وہ تبدیلی اچھی نہ لگی ہو ۔ یا شاید اُسے یہ شکایت تھی کہ قاسو نے اپنے بھائی سے ساری حقیقت کہہ دی ۔

"لیکن آخر تھا کیا اُس دُودھ میں"۔ ماجو نے پوچھا ۔

"معلوم نہیں ۔ قاسو نے آہ بھر کر کہا ۔ جب سے بدن میں جان نہیں رہی ۔ ہمت نہیں رہی"۔

"ہمت نہیں رہی ؟"

"ہاں جیسے چوڑیاں پہن لی ہوں میں نے"۔ وہ زہر خند ہنسی ہنسا ۔

"کیوں عورت بن گئے ہو کیا؟"

"اس سے بھی بدتر"۔ قاسو نے شرم سے سر جھکا لیا۔

"قاسو۔ ۔ ۔ ؟" ماجو حقیقت حال جان کر چلایا۔

"ہاں ماجو"۔ قاسو یوں خاموش ہوگیا جیسے کسی جرم کا اقبال کر لیا ہو۔

"لیکن۔ ۔ ۔ لیکن۔ ۔ ۔ کیا تم نے اس پر ہاتھ" ۔ ۔ ۔

"اوہوں"۔ وہ بولا۔ "میں نے اپنی ہار تک مان لی۔ میں نے اسے بہن کہا"۔

"پر کیوں"۔

"پتہ نہیں"۔

"تعجب ہے تمہیں ایسا بنا دینے سے اسے کیا ملا۔ حرامزادی۔ میں۔ ۔ ۔ میں" ۔ ۔ ۔ دفعتاً وہ رُک گیا اور خاموش ہو رہا۔

اس وقت ماجو کے دل میں ایک خاموش جذبہ پرورش پانے لگا کوئی ارادہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔

رات بھر وہ سو نہ سکا۔ دن بھر کھیت پر کچھ کام نہ کر سکا۔ پھر وہ مادو قصائی کے پاس جا بیٹھا اور تفریحاً ایک چھری تیز کرنے لگا اور گھر آتے ہوئے ان جانے میں وہ چھری ہاتھ میں لئے چلا آیا۔ ۔ ۔ "اونہوں" وہ آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ یہ چُھری۔ اس نے چھری کی طرف دیکھ کر کہا۔ "یہ چھری کام نہ آئے گی" اور وہ مادو کی طرف لوٹا۔ چھری لوٹانے گیا تو مادو سے پوچھنے لگا۔ "مادو کوئی ایسی چیز ہے کیا جو کسی کو بے ہوش کر دے"۔

"کیوں"۔ مادو نے پوچھا۔

"ویسے ہی پوچھ رہا ہوں"۔

"صمدو کے پاس ہے۔ صمدو نائی کے پاس" مادو بولا۔" فوراً بیہوش ہو جائے بس سونگھنے کی دیر ہے۔" "کیا چیز ہے۔" اس نے پوچھا۔" پتہ نہیں۔" مادو نے کہا۔" سرکاری چیز ہے کوئی۔ دواخانے کی ڈبیا میں بند کر کے رکھتا ہے صمدو۔"

رات کو چارپائی پر پڑے پڑے نہ جانے وہ کیا کیا سوچتا رہا۔ اور پھر خواب

میں ایک اونچی لمبی عورت بیہوش پڑی تھی ۔ اور وہ غصے میں اپنے بھائی قاسو سے کہہ رہا تھا ۔ "یہی ہے نا وہ ؟"

اور قاسو منہ کھولے اس کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ وہ جاگ اٹھا ۔ "جاؤں گا ضرور جاؤں گا ۔"

اندھیرے میں دبے پاؤں سرک سرک کر وہ بدراں کے مکان کے دالان تک جا پہنچا سامنے پلنگ پر کوئی سویا ہوا تھا ۔ اس نے ایک بڑی سی ڈبیا لہنگے کے پلّہ سے نکالی ۔ اسے مضبوطی سے تھام کر وہ پھر چوپائے کی طرح چلنے لگا ۔ چارپائی کے پاس پہنچا تو بدراں نے کروٹ لی ۔ ماجو چارپائی تلے چھپ گیا ۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد اس نے سر باہر نکالا ۔ بدراں دائیں پہلو پر یوں پڑی تھی کہ اس کی ناک چارپائی کے سرے کے قریب تھی ۔ وہ سرک کر قریب ہو بیٹھا اور ڈبیہ کھولنے لگا ۔ پیشتر اس کے کہ وہ ڈھکنا کھولتا ۔ ۔ اس کے دونوں ہاتھ بدراں کی گرفت میں تھے ۔

"ہوں" ۔ ۔ ۔ وہ اُٹھ بیٹھی ۔ "مجھے معلوم تھا تو آئے گا" ۔ ۔ ۔ لیکن ماجو کے چہرے کی طرف دیکھ کر ٹھٹھکی ۔ ۔ ۔ تو ۔ ۔ ۔ توکون ہے" وہ بولی ۔ ۔ ۔ "اونہوں" ۔ ۔ ۔ اسے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ کر وہ گنگنائی ۔ ۔ ۔ "چوری کرنے آیا تھا کیا۔کر لے چوری ۔ کس لئے آیا تھا تو"۔ بدراں نے پوچھا ۔ ماجو کو جوش آگیا ۔ بولا ۔ "تیرے لئے"۔

"میرے لئے"۔ وہ حیران ہوگئی ۔

"ہاں تجھے لینے کے لئے" اس نے دانت پیسے ۔

"تو"۔ بدراں نے نفرت سے ہونٹ نکالے ۔ "اپنی جان کی خیر نہیں کیا"۔

"اونہوں" ماجو نے نفی میں سر ہلا دیا ۔ ایک روز مرنا تو ہے ہی"۔

"حرام موت"۔

"نہیں حرام کیوں ۔ نہ چلے گی میرے ساتھ تو تجھے مار ڈالوں گا۔ آپ مر جاؤں گا ۔"

"بڑا بہادر ہے تو ۔ پر یہ ڈبیا کیا ہے ہُوں ؟"

"کچھ ہے ہی نا۔"

"زہر ہے کیا ۔"

"زہر ۔ ۔ ۔" وہ مسکرایا ۔

"تو پھر" وہ بولی ۔

"دوائی ہے اور کیا ۔"

"دوائی" ۔

"ہاں تجھے بے ہوش کرنے کو ۔ تو سونگھ لیتی تو میں کب سے تجھے اُٹھا کر چل دیتا"۔

"اچھا ۔" مجھے بے ہوش کر کے لے جانا تھا تو نے ۔ بڑا بہادر مرد ہے"۔

بدراں نے اسے دیوار پر دے پٹخا ماجو کھسیانا ہو کر اُٹھ بیٹھا ۔

"بس یہی ہمت ہے تیری ۔ گھر سے راں ڑی لینے آیا تھا ۔ ہمت بھی ہے تجھ میں"۔

"نہ سہی"۔ وہ بولا، "خواہش تو ہے"۔

"تیرے جیسے تو ہمارے کمین ہیں کمین"۔ وہ غرائی ۔

"کمین ہی سہی"۔

"چل دفع ہو"۔ وہ بولی ۔ "دُور ہو جا یہاں سے ۔ جاتا ہے یا نہیں"۔

بدراں نے اُسے پھر دھکا دیا ۔ اور وہ دہلیز پر گر پڑا ۔ منہ پر خراش آئی ۔ لیکن جلد ہی سنبھل کر اٹھ بیٹھا ۔

"جائیگا یا نہیں"۔ وہ پھر غرّائی ۔

"اچھا" وہ کھڑا ہوگیا ۔ "پھر سہی"۔

"تو ۔ ۔ ۔" وہ غصہ سے چلّائی اور اُسے پکڑ کر کھڑی ہوگئی ۔

"کون ہے۔" پڑوس سے دتا بھاگتا ہوا اندر آیا"۔ کون ہے بدراں ۔

"کون ہے یہ" دِتے نے ماجو کو دیکھ کر بدراں سے پوچھا ۔

"پتہ نہیں"۔ وہ بولی ۔

"چور ہے ؟" دِتے نے پوچھا ۔

"پوچھو اِس سے کہتا ہے تجھے لینے آیا ہوں "۔ وہ ہنسی ۔

"تجھے"۔

"ہاں"۔

"حرام خور"۔ ۔ ۔ دِتے نے اس کی گردن پر ایک دی ۔ اور وہ چکرا کر بدراں کے پاؤں میں آگرا ۔

"پاگل ہے کوئی"۔ وہ بولی ۔

"خون پی لوں گا اس کا ۔ ۔ ۔ میں"۔ دِتا ایک بار پھر اُس کی طرف بڑھا ۔

ماجو بدراں کی اوٹ لے کر بیٹھ گیا ۔ اور یوں اس کا دامن کھینچنے لگا گویا بچہ ماں سے پناہ مانگ رہا ہو ۔ "دتے" بدراں چلّائی "تو کچھ نہ کہہ اسے میں کر لوں گی ٹھیک ، دِتے ۔" وہ پھر چیخی لیکن دِتے نے ایک اور لگائی اسے اور وہ چیخا "راں ڑی"۔ ماجو نے اعلانیہ اس سے پناہ مانگی ۔ "رہنے دے بہادری تو"۔ وہ دِتے کا ہاتھ پکڑ کر بولی ۔ "تو جا" اس نے دِتے کو دروازے کی طرف دھکیلا اور خود رسی لے کر ماجو کو باندھنے لگی ۔

یہ دیکھ کر دِتا ہنسا ۔ بولا ۔ "اچھا جیسے تیری خوشی"۔

"کہتی جو ہوں پاگل ہے کوئی ۔ سر پھرا"۔

دِتا ہنسا اور باہر نکل گیا ۔

اسے بندھا ہوا دیکھ کر بدراں کی ہنسی نکل گئی ۔ "مجھے لے جانے کا خبط نہیں گیا"۔

"اب تو باندھ دیا ہے مجھے تُو نے"۔ ماجو بولا "بندھے ہوئے کو باندھنے میں بڑی بہادری ہے"۔ اس نے دکھلاوے کی محبت جتائی ۔

"اوہ"۔ وہ ہنسی اور اُسے کھولنے لگی ۔ "اچھا ۔ اگر میں سونگھ لیتی اسے تو کیا ہوتا ۔" اس نے ڈبیہ کی طرف اشارہ کیا ۔

"بیہوش ہو جاتی تو"۔

"پھر"۔

"پھر میں گھوڑے پر بٹھا کر لے جاتا تجھے"۔

"سچ"۔ وہ بولی ۔ "پھر"۔

"پھر ۔ ۔ ۔" وہ گھبرا گیا ۔ "بس" ۔ ۔ ۔ لیکن عین اس وقت اسے سوجھی ۔ "تو نے میرے بھائی کو نہ جانے کیا پلا دیا ۔ اس میں ہمت نہیں رہی ۔ اب سارا گاؤں دشمن ہے ۔ ہم کیا کریں"۔

"اچھا"۔ وہ بولی "تو اس کا بھائی ہے"۔

"ہاں" وہ بولا ۔ "جب سے قاسو نے کام چھوڑا ہے ۔ سبھی دشمن ہو رہے ہیں"۔

"میں وہاں چلی جاتی ۔ پھر کیا ہوتا"۔ وہ بولی ۔

"پھر ۔ ۔ ۔ پھر ہمیں کیا پروا تھی"۔ وہ جوش میں اُٹھ بیٹھا ۔ "تو چلی جاتی تو کسی کو ہم پر ہنسنے کی جرأت نہ ہوتی"۔

"اچھا"۔ وہ مسکرائی ۔ "کیا اس ڈبیہ کو سونگھ لیتی تو واقعی بے ہوش ہو جاتی"۔ اُس نے ڈبیہ سے کھیلتے ہوئے کہا اور کھیل ہی کھیل میں اِسے کھول کر ناک کے قریب لا کر بولی ۔ "دیکھوں ۔ ۔ ۔ ہائے میں نہیں دیکھتی ۔" وہ رُک گئی "ہائے بیہوش ہوگئی تو تم لے جاؤ گے ۔ ۔ ۔ لے جاؤ گے نا ؟" وہ ہنسی ماجو خاموش بیٹھا رہا ۔

"تلخ سی بُو ہے"۔ اُس نے ڈبیہ کو ناک کے قریب لاتے ہوئے کہا ۔ ۔

"اوئی"۔ ایک چیخ سی سنائی دی اور بدراں دھڑام سے ماجو کے پاؤں پر بیہوش ہو کر گر پڑی ۔

ماجو حیران کھڑا دیکھ رہا تھا ۔

دُور ۔ ۔ ۔ دُور ۔ ۔ ۔ کہیں کوئی گا رہا تھا ۔

راں ڑیاں ۔۔۔ ہو راں ڑیاں ۔
کن جاں ڑیاں تے کن ماں ڑیاں
راں ڑیاں ۔ ۔ ۔!

ہائے یہ نوجوان

اس روز چودھری غلام حسین کے گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔
ایک طرف بند کمرے میں میاں بیوی اور خالہ منور سرگوشیاں کر رہے تھے۔ دوسری طرف ملحقہ کمرے میں فرخ پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ پیشانی پر تیوری چڑھی تھی۔ نتھنے پھولے ہوئے تھے اور مٹھیاں بند تھیں۔ وہ ان جانے میں گھونسے چلاتا ہوا کمرے میں یوں گھوم رہا تھا جیسے پنجرے میں شیر ہو۔ اس کے پاس آصفہ بیٹھی کچھ بُن رہی تھی۔ کان ملحقہ کمرے میں سرگوشیوں پر لگے تھے ہونٹوں پر زیر لب مسکراہٹ تھی۔ لطیف تمسخر گالوں کے گڑھوں سے نمایاں ہو رہا تھا۔ آصفہ، امی ابا اور خالہ کی سرگوشیاں سنتی ایک نظر بھائی کی طرف دیکھ کر مسکراتی جو پاس ہی عالمِ بے بسی میں ہوا کو گھونسے مار رہا تھا۔ کچھ گنگناتی اور پھر الجھی ہوئی لٹ ہٹا کر ازسرِنو کان دیوار سے لگا کر بننے میں مصروف ہو جاتی۔

بند کمرے سے عجیب سی آوازیں آ رہی تھیں۔ پہلے تو سرگوشیاں ہوتی رہیں۔ پھر اگرچہ باتوں کا انداز رازدارانہ رہا۔ مگر وہ سب اس قدر بلند آواز میں بولنے لگے جیسے اِس راز کو اچھالنا چاہتے ہوں۔

پہلے تو خالہ منور اور آصفہ کی ماں کی روئی روئی آوازیں سنائی دیں پھر کوئی سسکیاں بھرنے لگی اور غلام حسین منتیں کرنے لگے۔ جیسے سمجھا بجھا رہے ہوں۔ دلاسے دے رہے ہوں۔ پھر خالہ منور کی سسکیاں مدہم پڑتی گئیں۔ آصفہ کی ماں کی آواز بھی سنبھلتی جا رہی تھی۔ اور اس کی باتوں میں تسلسل پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ اس پر غلام حسین کی آواز میں منت کا عنصر خارج ہونے لگا۔ جیسے دفعتاً انہیں اپنے وقار کا خیال آگیا ہو۔ ان کے لہجے میں کرختگی پیدا ہونے لگی۔ اور ان کی آواز بلند ہوتی گئی۔ وہ بیگم کی بات کاٹنے کی ناکام کوشش میں

لگے تھے ۔ کیونکہ بیگم کے روبرو ان کی کوششیں جملۂ معترضہ کی حیثیت رکھتی تھیں ۔ بیگم یوں بولے جارہی تھی جیسے ویرانے میں ندی بہہ رہی ہو ۔ عادی طور پر اسے کہنے سے غرض تھی ۔ سننے سے نہیں ۔

ملحقہ کمرے میں آصفہ یوں بیٹھی تھی ۔ جیسے اسے بات سننے سے کوئی دلچسپی نہ ہو ۔ اس کے باوجود بند کمرے کی سرگوشیوں کی تال پر اس کا دل دھڑک رہا تھا ۔ لیکن اس کے چہرے پر ان دھڑکنوں کا کوئی اثر دکھائی نہ دیتا تھا۔ کندھوں پر مالٹے کا رنگ کا ہلکا دوپٹہ بے پرواہی سے لٹک رہا تھا ۔ جس میں سفید پھول چمک رہے تھے ۔ شنگرفی ناخنوں پر سفید تاگہ لپٹ کھل رہا تھا ۔ نگاہیں اگرچہ سفید سینڈل کی نوک پر ٹکی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ مگر وہ کنکھیوں سے بھائی فرخ کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ اور مسکرا کر یوں ہونٹ ہلا رہی تھی ۔ جیسے کچھ گنگنا رہی ہو ۔ فرخ کو اشارۃً کچھ سمجھا رہی ہو ۔

"سج لے اے اے بڑا سج لے "

آصفہ کو گیتوں اور ٹھمریوں کے بول بے حد پسند تھے وہ کہا کرتی ہائے امی کتنے پیارے بول ہیں جیسے دل سے نکلے ہوں ۔ اور امی ہاتھ چلا کر کہتی تُو تو پاگل ہو گئی ہے لڑکی واہی تباہی نہ بکا کر ۔ اور جب آصفہ اس کا جواب دینے لگتی تو امی ہاتھ بڑھا کر اس کے منہ پر رکھ دیتی چپ کر اب ۔ آصفہ ہنسے جاتی ۔

غلام حسین کے گھر میں بچوں کو کافی آزادی حاصل تھی اور یہ سب امی کی طبیعت کی وجہ سے تھا ۔ اگرچہ میاں کے ساتھ اس کا برتاؤ سخت گیر قسم کا تھا ۔ مگر بچوں کے ساتھ وہ اکثر بچہ بن جاتی ۔ جب غلام حسین باہر چلے جاتے تو ماں چپکے سے آصفہ کے پاس آ بیٹھتی ۔ "کیا کر رہی ہے میری آسو" وہ پیار سے کہتی ۔ آصفہ کی زیر لبی مسکراہٹ ہونٹوں سے نکل کر گالوں پر پھیل جاتی ۔ کیا گنگنا رہی ہے تو ۔ "ماں پوچھتی" اے ہے منہ ہی منہ میں گنگناتی ہے ۔ ذرا اونچی آواز سے کہہ تو کیا بول ہے ۔ "کچھ نہیں امی" آصفہ منہ پکا کر لیتی ۔ "اے ہے کہہ تو سہی" ایک بار ۔ توبہ تُو تو نخرے کرتی ہے ۔ کیا ہے "وہ ڈیرے والا گیت"۔ اس پر صادقہ چلاتی ۔ امی میں بتاؤں ۔ مانڈے ڈیرے آجا ۔ "ہاں وہی" ماں کی باچھیں کھل جاتیں ۔ "مانڈے ڈیرے آجا ۔ سنا دے"۔

آصفہ ہنستی ۔ "امی وہ تو ڈیرے پر ہی ہیں پھر بلانے سے فائدہ ؟"

"چل دُور ہو" ماں ہنس کر گھورتی ۔ ہر بات کا مذاق اڑاتی ہے "شرم نہیں آتی"۔ آصفہ گیت سنانے لگتی تو صادقہ سلیٹ رکھ کر ٹکٹکی باندھ کر آصفہ کی طرف دیکھتی ۔ آصفہ کے چہرے پر ایک پر کیف اداسی جھلکتی ۔ صادقہ کا دل چاہتا کہ آپا گاتی رہے اور وہ اسے دیکھتی رہے ۔ اس وقت آصفہ کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا گویا واقعی کوئی ڈیرے کی طرف آ رہا ہے ۔

ایسے وقت فرخ آ جاتا تو وہ چھپ کر اس کا گانا سنتا رہتا اور اپنی آمد کا اظہار نہ کرتا ۔ پھر جب گانا ختم ہو جاتا تو وہ بھدّی آواز میں مینڈک کی طرح ٹرانے لگتا ۔ اس پر آصفہ کانوں میں انگلیاں ڈال لیتی ۔ ہائے امی یہ مینڈک کیوں ٹرانے لگے ابھی تو برسات نہیں آئی اور فرخ چلاتا اور کیا ہر وقت کوئلیا ہی کوکتی رہے ۔ مینڈک کو ٹرانے کا حق نہیں کیا ۔ "ہائے بھائی جان صادقہ سلیٹ اٹھا کر منہ بناتی ۔ سارا مزا کرکرا کر دیا ۔ "میں کہتی ہوں ۔ ماں ہاتھ چلا کر کہتی ۔ سارا دن گھر میں ہی گھسا رہتا ہے ۔ کبھی باہر بھی جایا کر ۔ ۔ واہ اماں وہ غصّے میں گھونسا چلاتا ۔ مجھے تو باہر جانے کو کہتی ہو اور اپنی لاڈلی سے "ماندے ڈیرے آ جا" سنتی ہو ۔ "توبہ ماں ہونٹ پر انگلی رکھ کر کہتی ۔ "کیسے منہ پھٹ ہو تم جو منہ میں آیا بک دیا ۔"

"میں بتاؤں امی صادقہ چلانے لگتی ۔ اصل میں بھائی کو یہ گیت پسند نہیں ۔ ان کو تو یہ شکایت ہے کہ ان کی پسند کا گیت کیوں نہیں گایا جاتا ۔

"میں بتاؤں امی آصفہ مسکراتی اور پھر گانے لگتی ۔

"سج لے اے اے بنرا سج لے"

اور فرخ اس کا منہ چڑانا شروع کر دیتا ۔ بڑی گویا تو دیکھو ۔ ہونہہ"

یہ دلہن اور بنرا سجنے کی بات بھی بہت پرانی تھی ۔ بہن اور بھائی دونوں کو شادی کے نام سے چڑ تھی ۔ فرخ رشتہ داروں میں ناطہ کرنے کے خلاف تھا اور آصفہ شادی کرنے سے ہی منکر تھی ۔ گھروں میں بچوں کے بیاہ شادی کی بات ہوا ہی کرتی ہے ۔ آصفہ کی شادی کی بات چھڑ جاتی تو فرخ دوڑ کر اس میں جا حصہ لیتا اور بات کو ہوا دیتا اور پھر چوری چوری آصفہ کی طرف دیکھ کر مسکراتا ۔ فرخ

کے بیاہ کا ذکر ہوتا تو آصفہ چپکے سے ان کے پاس آ بیٹھتی ۔ ہائے اماں خالہ منور کی بیٹی رعنا کی سی لڑکی تو ڈھونڈے سے نہ ملے گی۔ اس پر فرخ دانت پیستا اور غصے میں ہوا میں گھونسے چلاتا ۔ لیکن آصفہ گویا اپنی دھن میں بات کئے جاتی جیسے فرخ کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہو ۔

ادہر فرخ بھی موقعے کے انتظار میں رہتا تھا ۔ موقعہ ملتا تو جھٹ رشتہ داروں میں شادی کرنے کے قبیح اثرات پر لکچر جھاڑنے لگتا ۔ اماں بات سمجھے بغیر ہی ہونٹ پر انگلی رکھ کر کہتی کیا واقعی رشتہ داروں میں شادی کرنا بُرا ہے فرخ ۔ اس پر فرخ فاتحانہ انداز سے آصفہ کی طرف دیکھتا جو چپ چاپ بیٹھی بننے میں مصروف ہوتی اور فرخ تفصیل سے ماں کو بات سمجھانے لگتا ۔ اور جب فرخ کو یقین ہو جاتا کہ اس نے اس مسئلے پر پورے طور پر روشنی ڈال دی ہے اور ماں اس کی بات کو مکمل طور پر سمجھ چکی ہے ۔ تو آصفہ چپکے سے کہتی ۔ امی عزیزوں میں شادی نہ ہو تو کیا غیروں میں ہو ۔

"اللہ تیرا بھلا کرے ماں" جھٹ بول اٹھتی یہی تو میں سوچ رہی تھی ۔ آخر خدا رسول نے جائز کی ہے رشتہ داروں میں شادی"۔

فرخ کا بنایا ہوا قلعہ دھڑام سے زمین پر آ رہتا ۔ اور وہ دانت بھینچ کر ہوا میں مکے مارنے لگتا ۔ لیکن آصفہ چپ چاپ بننے کے کام میں محو رہتی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔

لیکن اس روز جب گھر والوں نے پہلی مرتبہ سج رہی دلہن ساجے کا بول سنا تھا ۔ اس روز حالات مختلف تھے ۔ ماں نے برسبیل تذکرہ آصفہ کے بیاہ کی بات چھیڑ دی ۔ اسے بھی تو ان دونوں سے الجھنے میں مزا آتا تھا ۔ آصفہ بیاہ کی بات سن کر غصے میں لال ہو گئی ۔ بولی "دماغ چل گیا ہے ؟ ہر وقت بیاہ کی بات کوئی اور بات سوجھتی ہی نہیں ۔ عین اس وقت فرخ گھر میں داخل ہوا اس نے ایک ہی نگاہ میں بھانپ لیا کہ بات کیا تھی ۔ دفعتاً اسے یاد آیا کہ جب وہ بازار سے گذر رہا تھا تو کوئی ریڈیو پر گانا گا رہا تھا جو عین موقعہ کی چیز تھی ۔ اس نے چپکے سے ریڈیو کا بٹن کھول دیا ۔

آخر کسی روز دلہن بننا ہی ہے تمہیں ۔ اماں بولی ۔

آصفہ نے مڑ کر ماں کی طرف دیکھا اور پھر سنگار میز کے سامنے کھڑی ہو کر بال بنانے لگی عین اس وقت ریڈیو چیخنے لگا ۔

"سج لے دُلہن سج لے"

اور فرخ تالی بجانے لگا ۔ واہ واہ واہ واہ کیا گیت ہے ۔"

آصفہ یہ سُن کر تڑپ کر مڑی اور پھر کنگھی پھینک کر سنگار میز سے دور ہو گئی ۔ جیسے اسے سجنے سے کوئی دلچسپی نہ ہو ۔

فرخ اپنی ہی دھن میں چلاتا رہا ۔ واہ واہ کیا گیت ہے سج ری دلہن سج لے ۔ واہ واہ ۔ صادقہ آج تو کمال ہو گیا ۔ واہ واہ واہ ۔

پھر چند دنوں بعد جب ماں باپ بیٹھے فرخ کے بیاہ کی بات کر رہے تھے اور فرخ اپنے کمرے میں شیو کرتے ہوئے ان کی باتیں سن کر چیں بجبیں ہو رہا تھا تو آصفہ دبے پاؤں فرخ کے کمرے میں گھس گئی اور ادھر ادھر یوں گھومنے لگی جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو ۔ پھر اس نے گنگنانا شروع کر دیا ۔

"سج لے بنرا سج لے"

فرخ نے آصفہ کی طرف دیکھ کر غصے سے مکا چلایا ۔ مگر آصفہ یوں معصومیت سے بولی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔ بھائی جان میری پنسل تو نہیں دیکھی ۔ آپ نے اور جواب کا انتظار کئے بغیر وہی گیت گنگناتے ہوئے پھر تلاش میں مصروف ہو گئی ۔

دوڑ جا یہاں سے فرخ غصے میں چلایا ۔ اور وہ قہقہہ مار کر ہنسی اور وہ دونوں میز کے گرد دوڑنے لگے ۔ یہ سج لے کا مذاق بہت پرانا تھا ۔

لیکن اس روز تو حالات بہت ہی بگڑے ہوئے تھے ۔ گھر میں سبھی جانتے تھے کہ بند کمرے میں فرخ کے بیاہ کی بات ہو رہی ہے ۔ حالات کی سنجیدگی کو مدنظر رکھ کر آصفہ کو بھی جرأت نہ ہوئی کہ بآواز بلند گنگنائے اس لئے وہ دیوار کے پاس بیٹھی ہوئی مسکرا رہی تھی ۔ اور فرخ غصے سے بھوت بنا ہوا تھا ۔

ماں چاہتی تھی کہ فرخ کا بیاہ اس کی خالہ کے گھر ہو ۔ خدا کے فضل سے اس کی ایک نہیں چار خالائیں تھیں اور ہر خالہ کے ہاں چار چار بیٹیاں تھیں ۔ جیسے خالاؤں کے گھر ہمیشہ ہوتی ہیں ۔ جبھی تو ماں بیٹے سے کہا کرتی تھی ۔ بس تو کوئی

سی چن لے ۔ جونسی تیرا جی چاہے ۔ تجھے پوری آزادی ہے ہاں ۔ میں تجھے مجبور نہ کروں گی ۔

مگر مصیبت یہ تھی کہ فرخ کو سرے سے بنتِ ام سے نفرت تھی ۔ عام سی بھدی صورتیں ۔ گھریلو انداز پھس پھسی طبیعتیں اور پھر اس کی اپنی خالہ زادیاں لاحول ولا قوۃ ۔ مانا کہ ان کا رنگ گورا تھا ۔ لیکن رنگ کا کیا ہے ۔ کسی کی طبیعت میں ذرہ بھر چمک نہ تھی ۔ کئی ایک تو نماز بس بھی پڑھتی تھیں ۔

وہ تو سمجھئے اس کی خوش قسمتی تھی کہ تمام خالائیں دور دراز مقامات پر رہتی تھیں ۔ پھر بھی ان میں سے کسی کے آنے کا امکان ہوتا تو وہ گھبرا جاتا ۔ نہ جانے کیا آفت آنے والی ہے ۔ ان دنوں خالہ منور آئی ہوئی تھی ۔ اگرچہ فی الحال وہ اکیلی ہی آئی تھی ۔ مگر سننے میں آیا تھا کہ باقی قافلہ بھی آنے والا ہے ۔ خالہ منور کے میاں ۔ ان کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ۔ خالہ کے آنے پر فرخ گھبرا گیا تھا ۔ گھبرانے کی بات تو تھی ۔ کیونکہ اس کی آمد فرخ کے لیے خطرے کی جھنڈی سے کم نہ تھی ۔ جب سے وہ آئی تھی ماں کے کمرے میں ان تینوں کی پرائیویٹ ملاقاتیں ہو رہی تھیں ۔ اور گھر بھر میں سرگوشیوں کی آوازوں کا گویا سیلاب اُمڈا ہوا تھا ۔ ان آوازوں سے صاف ظاہر تھا کہ فرخ کی شادی کی بات زیرِ غور ہے ۔ یہ تو خیر پھر بھی قابل برداشت تھا ۔ اپنا ہی مغز کھاتے تھے ۔ لیکن خالہ زادیوں کا قافلہ ان کے گھر آکر ٹھہرا تو کیا ہو گا ۔ فرخ یہ سوچ رہا تھا کہ کسی بہانے کہیں باہر چلا جائے اور طوفان چل کر تھم جائے تو واپس آئے ۔ اس وقت بھی وہ یہی سوچ رہا تھا ۔ اگر بھائی صمد کے ہاں ملتان چلا جاؤں تو ۔ ۔ ۔ دفعتاً بند کمرے سے خالہ منور کی آواز سنائی دی ۔ وہ تو ٹھیک ہے بہن۔ مانتی ہوں ۔ مانتی ہوں ۔ میں تو خود یہ چاہتی ہوں ۔ میرے لیے اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے ۔ "لیکن بہن میں مجبور ہوں ۔ میری مجبوری کا بھی خیال کرو ۔ میرا بس بھی چلے کچھ۔"

فرخ رُک گیا اور خالہ کی بات سننے لگا۔

آصفہ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اُڑ گئی ۔ اس کی وہ بے آواز گنگناہٹ ختم ہو گئی ۔

خالہ منور جوش میں کہنے لگی ۔ بہن میں تو فرخ کو رعنا سے بھی زیادہ عزیز سمجھتی ہوں میرا بس چلے تو فرخ پر اپنی جان تک نثار کر دوں ۔ ایک چھوڑ کلیجے کی دس بوٹیاں کاٹ دوں ۔ مگر رعنا کے ابا نہیں مانتے ۔ وہ کہتے ہیں ۔ آخر فرخ خالی بی ۔ اے ہی ہے نا اور بی ۔ اے آج کل ہوتا ہی کیا ہے ۔ انہوں نے تو بڑے بڑے رشتے رد کر دئے ہیں ۔ ہاں ۔

فرخ نے پاؤں تلے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس کی ۔ دیواریں دھندلی پڑ گئیں ۔ وہ بیٹھ گیا اور سوچنے لگا چلو مخلصی ہوئی ۔ جان بچی سو لاکھوں پائے ۔ اس نے خوشی محسوس کرنے کی کوشش کی ۔ "وہ مار لیا میدان"۔ وہ آصفہ کے سامنے چٹکی مار کر چلایا ۔ "وہ مار لیا" لیکن اس کے باوجود اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا ۔ وہ محسوس کر رہا تھا ۔ جیسے اس کی بے عزتی کی گئی ہو ۔ جیسے اس کا مذاق اڑایا گیا ہو ۔

آصفہ کی مسکراہٹ کافور ہو گئی ۔ اس کے ہاتھ رک گئے اور انگلیاں بے جان ہو کر لٹکنے لگیں ۔

"اور پھر تم سے کیا پردہ ہے بہن خالہ منور کی آواز پھر سنائی دی ۔ اپنی رعنا کے عجیب سے خیالات ہیں ۔ نہ جانے آج کل کے نوجوانوں کو کیا ہوا ہے ۔ الٹی الٹی باتیں سوچنے لگے ہیں ۔ تمہیں کیا بتاؤں بہن مجھے تو شرم آتی ہے بات کرتے ہوئے۔رعنا کہتی ہے مجھے رشتے داروں میں شادی کرنا پسند نہیں ۔ لو کبھی سنی تھی ایسی بات ۔

فرخ نے اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹیک دیا اور خالی الذہن ہو کر چھت کو گھورنے لگا ۔

آصفہ اٹھ بیٹھی جیسے کھو گئی ہو ۔

"میری بات کا یقین نہ ہو" خالہ منور بولی ، "تو رعنا کے ابا سے بات کر دیکھو آج ہی آ رہے ہیں وہ ۔"

"آج آ رہے ہیں" آصفہ کی ماں کی آواز میں گھبراہٹ تھی ۔

ہاں ۔ "منور بولی ۔ سبھی آ رہے ہیں۔ رعنا حسن آرا اکبرا اور جمیل سبھی ۔ مگر وہ یہاں نہیں ٹھہریں گے ۔

یہاں نہیں ٹھہریں گے ۔ ماں نے دہرایا ۔

"ایک دو دن کی بات ہوتی تو وہ یہیں آ پڑتے پورے دو مہینے یہاں رہنا ہے ۔ پچھواڑے میں مظفر علی کے گھر کی اوپر لی منزل کا انتظام کر لیا ہے ۔ مظفر علی کا بھائی کراچی گیا ہوا ہے ۔ جگہ خالی پڑی ہے ۔ تم جانتی ہو مظفر علی ان کے چچا زاد ہیں ۔"

"اچھا تو میں چلتی ہوں ۔ اب ذرا جگہ ٹھیک ٹھاک کرا دوں ۔"

خالہ منور کے جانے کے بعد غلام حسین کے گھر پر قبرستان کی سی خاموشی چھا گئی ۔ آصفہ کی ماں چپ چاپ چولہے کے پاس جا بیٹھی ۔ غلام حسین اندر حقے سے غم غلط کرنے لگے ۔ آصفہ خاموش چارپائی پر جا پڑی اور فرخ کتاب پڑھنے کی کوشش میں مشغول ہو گیا ۔

شام کے وقت فرخ مال روڈ پر گھومتے ہوئے اس مخلصی پر خوشی محسوس کرنے کی شدید کوشش کر رہا تھا ۔ چلو ایک خالہ زاد سے تو جان چھٹی ۔ اللہ کارساز ہے بھائی ۔ وہ چھاتی ابھارے آگے بڑھے جا رہا تھا ۔ اخاہ اس ہوٹل میں کس قدر رونق ہے ۔ ارے یہ سنیما ہال ابھی سے فل ہو گیا ہائیں ۔ کیا نام ہے اس کھیل کا ۔ سارا ہوٹل ۔ عجیب سا نام ہے ۔ ایسی باتوں کے باوجود وہ محسوس کر رہا تھا ۔ جیسے دل میں ایک کانٹا سا لگ گیا ہے ۔ پھر وہ اپنا آپ سنبھالتا اور ادھر ادھر کی باتوں پر توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کرتا ۔ ہائیں بھئی واہ کتنے خوبصورت ہیں یہ نئے ریڈیو سیٹ نہ جانے روسی ساخت کے ہیں یا فرانسیسی اور وہ شوونڈوز کی طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھتا ۔ لیکن جلد ہی اس کا خیال رعنا کی طرف مبذول ہو جاتا جسے گذشتہ چار سال سے اس نے نہ دیکھا تھا ۔ بڑی مغرور لڑکی ہے ۔ رشتے داروں میں شادی نہیں کرنی چاہیے ۔ معلوم ہوتا ہے سمجھدار بھی ہے ۔ لیکن خیر ہے تو وہی نا بے جان آنکھیں، پیشانی پر تیوری جلی کٹی شکل چھی ۔ ۔ ۔ ممکن ہے اب جوان ہو گئی ہو ۔ مگر جوانی تو ہر کسی پر آتی ہے ۔ جوانی کا کیا ہے ۔ ارے یہ نیا پوسٹر کیسا خوبصورت ہے ۔ گپ و چائے ۔ واہ واہ کیا عنوان ہے ۔ ٹی اینڈ تماشہ سے بھی بہتر ہے یہ تو ۔ واہ واہ ۔ انہیں سوجھتی ہیں خوب خوب ۔

اگلے روز جب فرخ کوٹھے پر گیا تو معاً اسے یاد آیا کہ وہ سب آ چکے تھے ۔ رعنا ، حسن آرا اور کبرا ۔ اور ان کے ابا جان جو بی اے کو خالی بی ۔ اے سمجھتے ہیں ۔ وہ مسکرایا اور مظفر علی کے چوبارے کی طرف دیکھے بغیر سیٹی بجاتے ہوئے ٹہلنے لگا۔

جمی ای ای ای ل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قریب ہی کسی نے آواز دی ۔

فرخ چونکا ۔ اس نے محسوس کیا گویا کوئی سانپ لہرا رہا تھا ۔ نہ جانے کون ہے ۔ اس نے ادھر ادھر دیکھے بغیر سوچا کوئی کالج کی معلوم ہوتی ہے ۔ ان کالج والیوں کو آواز لہرانے کی عادت ہوتی ہے ۔ یوں گولائی سی پیدا کر دیتی ہیں بات میں جیسے بات چاکلیٹ کی ڈلی ہو ۔

جمی ای ای ای ل ۔ ۔ ۔ ۔ " پھر آواز آئی ۔

اس نے محسوس کیا کہ وہ آواز مظفر علی کے چوبارے سے آ رہی تھی ۔

وہ مڑا ۔ ۔ ۔ مظفر علی کے چوبارے کی کھڑکی کھٹ سے بند ہو گئی ۔ اور اسے ایک لہراتے ہوئے رنگین آنچل کے سوا کچھ نظر نہ آیا ۔ لاحول ولا قوۃ وہ مسکرایا ۔ وہی بات ۔ تانک جھانک کا کھیل ۔ فضول اب مطلب یہ ہے کہ ہمیں ڈھونڈو ۔ ہم یہاں چھپے ہیں ۔ نہ بابا نہ وہ ہنسا ۔ ہمیں اس کھیل میں کوئی دلچسپی نہیں ۔ آپ شوق سے کھڑکیاں بند کرنے کا شغل فرمائیے خاکسار کو کوئی دلچسپی نہیں ۔ اور وہ بے پرواہی سے سیٹی بجاتا ہوا نیچے اتر آیا ۔

اگلے روز مظفر علی کے چوبارے پر نظر پڑی تو اس نے دیکھا کہ دونوں کھڑکیوں پر چقیں پڑی ہیں ۔ ایک ننھی سی بچی چق اٹھائے کھڑی تھی ۔ اس کے عقب میں سیاہ بالوں کی لٹوں کے درمیان کوئی سفید سی چیز چمکی ۔ "کبرا" کسی کی آواز بجلی کی طرح لہرائی ۔ چق گر گئی ۔ کھڑکی بند ہو گئی ۔ فرخ کو ایک دھچکا لگا ۔ اس نے محسوس کیا کہ اس سے ناقابل برداشت سلوک کیا جا رہا ہے ۔ اسے بیگانہ سمجھا جا رہا ہے ۔ چاہے وہ رعنا سے شادی کرنے کو تیار نہ تھا ۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ اس کا خالہ زاد بھائی نہیں ۔ وہ اس کا دشمن تو نہ تھا ۔

اس روز جب وہ ان کے گھر آئی تھیں ۔ اس روز بھی رعنا نے فرخ سے بڑی بے اعتنائی برتی تھی ۔ وہ اس کے روبرو نہ ہوئی تھی ۔ اور پھر خالہ منور

حسب عادت باتیں بنانے لگی تھی ۔ اے ہے لڑکی اللہ رکھے جوان ہو گئی ہے ۔ اس لیے فرخ کے سامنے آتے ہوئے شرماتی ہے ۔ اگر بات یہاں تک ہی رہتی تو بھی تھا مگر رعنا جھٹ بولی ۔ شرمانے کی کیا بات ہے ۔ امی ۔ اس پر آصفہ کہنے لگی ۔ توپھر بھائی جان کے سامنے کیوں نہیں آتی ۔ تو "بس نہیں آتی ۔ وہ بولی۔ اور اگر سامنے جاؤں تو کیا ہے ۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے ۔ اس نے یہ جملہ ایسے انداز سے کہا تھا جیسے فرخ کو کاٹ کر رکھ دیا ہو ۔

فرخ ڈٹ کر مظفر علی کے چوبارے کے سامنے کھڑا ہو گیا ۔ بہت بنتی ہے ۔ وہ دانت پیسنے لگا ۔ کیا فرق پڑتا ہے ۔ ہونہہ فرق نہیں پڑتا تو کبرا کو چق گرانے کے لئے کیوں ڈانٹتی ہے ۔ ہونہہ فرق نہیں پڑتا ۔ کیا فرق پڑتا ہے ۔ کیا فرق پڑتا ہے وہ باآواز بلند چلانے لگا تاکہ وہ سن لے ۔

ارے وہ گھبرا گیا ۔ کوئی بڑی بے پرواہی سے چق کو لپیٹ رہا تھا ۔ لمبی لمبی نوکدار انگلیاں دو گلابی باہیں ۔ سرخ پھولدار قمیض ۔ نوکیلی ٹھوڑی ۔ پتلے حساس ہونٹ اور شربتی آنکھوں پر لمبی گھنی پلکیں ۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آٹکا ۔ مگر وہ بے پرواہی سے ممتاز منزل کی طرف دیکھنے لگا ۔ سیٹی بجاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا ۔ خاصی خوبصورت ہے ۔ قد بھی موزوں ہیں اور انداز ۔ ۔ ۔ خیر خیر سبھی خوبصورت ہوتی ہیں یہ ۔ ایسیوں کے قد ایسے ہی ہوتے ہیں ۔ وہ کوشش کرنے لگا کہ کسی اور چیز کے متعلق سوچے ۔ بھئی واہ ۔ اس عمارت کی بناوٹ کیسی اچھی ہے ۔ اور یہ زرد رنگ ۔ اونہہ ۔ ذرا شوخ ہے ۔ وہ بھی تو شوخ ہے چق اٹھاتے ذرا نہیں گھبرائی ۔ میرا طعنہ سن لیا ہو گا ۔ جل گئی ہو گی ۔ ایسیوں کے ساتھ ایسا سلوک ہی کرنا چاہیے ۔ ہوں تو ممتاز منزل کی پانچ منزلیں ہیں ۔ بڑی اونچی بلڈنگ ہے یہ ۔ وہ بھی تو اونچی لمبی ہے ۔

اس کے بعد جب بھی فرخ کوٹھے پر جاتا تو منڈیر کے پاس جا کر بے نیازی سے اِدھر اُدھر یوں دیکھتا جیسے اسے مظفر علی کے چوبارے کی کھڑکیوں سے قطعی دلچسپی نہ ہو ۔ اور کھڑکی کے عین وسط میں کرسی پر بیٹھی ہوئی رعنا اس وقت مطالعے میں اس حد تک مصروف ہو جاتی کہ اسے احساس ہی نہ ہوتا کہ فرخ وہاں کھڑا ہے ۔

ایک روز جب فرخ منڈیر کے پاس کھڑا بڑی احتیاط سے مظفر علی کے چوبارے کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا تو چپکے سے آصفہ نہ جانے کہاں سے آ موجود ہوئی اور بھائی کی طرف دیکھے بغیر اس کے پاس کھڑی ہو گئی ۔ اس نے رعنا کو آواز دی ۔ رعنا ۔ فرخ نے حیرانی سے آصفہ کی طرف دیکھا ۔ مگر وہ یوں کھڑی تھی جیسے فرخ کے وجود کا احساس ہی نہ ہو ۔ عجیب بات تھی ۔ فرخ تو اسے دیکھ کر گھبرا گیا تھا ۔ اس کا خیال تھا کہ اسے وہاں کھڑے دیکھ کر آصفہ فتنہ کھڑا کر دے گی ۔

کھڑی سے رعنا کا سرخ و سپید چہرہ نکل آیا ۔ تم ہو آصفو ۔ فرخ رعنا کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ وہ اسے دیکھ کر گھبرا جائے گی ۔ لیکن رعنا نے اسے در خورِ اعتنا ہی نہ سمجھا ۔ جیسے وہاں اکیلی آصفہ ہی کھڑی ہو ۔

"آؤ گی آج" ۔ آصفہ نے پوچھا ۔

"جی چاہا تو وہ بولی ۔

"تو میں آ جاؤں ۔ آصفہ نے پوچھا ۔

"جی چاہے تو ۔ وہ ہنسی اور پھر ہنستی ہوئی غائب ہو گئی ۔

اس پر آصفہ بھی مسکرائی اور مسکراتی ہوئی فرخ کی طرف دیکھے بغیر نیچے اتر گئی ۔ خواہ مخواہ فرخ کا منہ غصے سے لال ہوتا گیا ۔ ہوں تو اب ہم کسی گنتی شمار میں ہی نہیں ۔ بھئی واہ ۔ بڑی بے نیاز ہیں ۔ وہ ہنسا ۔ ایک تو اللہ میاں بے نیاز ٹھہرے اور دوسرے جناب ۔ کسی کی خبر ہی نہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے ۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسا ۔

مجھے کیا معلوم ، نیچے آصفہ چلائی ۔ یہیں کہیں ہوں گے بھائی فرخ ۔

"اے ہے" اماں بولی "ابھی تو کوٹھے پر گیا تھا ۔"

"میں نے تو نہیں دیکھا ۔ آصفہ نے بے پرواہی سے کہا ۔

فرخ یہ سن کر غصے سے غرانے لگا ۔ "یہ بھی اسی کے نقش قدم پر چلنے لگی ۔" پھر وہ دوڑ کر نیچے اتر آیا ۔

ماں اسے دیکھ کر مسکرائی ۔ لو یہ آصفی کہہ رہی تھی تمہاری کچھ خبر ہی نہیں ۔

"جی ، وہ طنزیہ انداز سے بولا ۔ جب سے اس کی چہیتی سہیلی آئی ہے اسے تو اپنی بھی خبر نہیں ۔ بنتی ہے یہ اس کی طرح"۔

" وہ کون ؟" آصفہ نے مسکرا کر پوچھا ۔

"وہی خالہ منور زادی ۔ رعنا صاحبہ ۔"

"دفعہ کر"ماں نے ہاتھ چلا کر کہا ۔ نام نہ لے میرے سامنے ۔ ہائے میں کیا سمجھتی تھی اور وہ کیا نکلی ۔ وہ تو چھوٹے موٹے کو خاطر میں ہی نہیں لاتی ۔

"یہ تو ٹھیک ہے" آصفہ مسکرا کر بولی ۔ واقعی وہ چھوٹے موٹے کو خاطر میں نہیں لاتی ۔ اس نے بامعنی انداز سے فرخ کی طرف دیکھا ۔ ہے نا بھائی جان ۔ صفو ۔ وہ چلایا ۔

مگر آپ کے لیے کیا فرق پڑتا ہے ۔ آصفہ کے الفاظ میں دھار تھی ۔

لو سنا تھا کبھی ۔ کہتی ہے میں رشتہ داروں میں شادی کرنا پسند نہیں کرتی ۔ جیسے رشتہ دار منتیں کر رہے ہوں ۔ ماں نے ہاتھ چلا کر کہا ۔

لو اماں یہ تو اپنی اپنی مرضی ہے ۔ بھائی فرخ بھی تو یہی کہتے ہیں ۔ صفو بولی ۔

صفو ۔ ۔ ۔ فرخ نے اس کی طرف گھونسا چلایا ۔

جھوٹ کہہ رہی ہوں کیا ۔

بس آج سے خبردار جو رعنا کو یہاں بلایا ۔ فرخ غرانے لگا۔

آصفہ کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی ۔ جناب کو کیا تکلیف ہے ۔

میں نہیں چاہتا کہ وہ یہاں آئے ۔ میں نہیں چاہتا وہ میرے سامنے آئے ۔

ڈیوڑھی میں سے ہنسی کی آواز آئی ۔ صفو ۔ رعنا کی آواز سنائی دی فرخ صاحب سے کہو کہ وہ پردہ کر لیں ۔ میں آ رہی ہوں ۔

فرخ کا دل ڈوب گیا ۔ وہ کرسی کو ٹھوکر سے گرا کر اپنے کمرے کی طرف بھاگا ۔

رعنا ہنستے ہوئے اندر داخل ہوئی اور صفو اور صادقہ اسے لے کر اندر جا بیٹھیں ۔

ابھی وہ بیٹھی ہی تھیں ۔ کہ خالہ منور اندر داخل ہوئی ۔ اے ہے بیٹی تو یہاں ہے ۔ وہ بآواز بلند کہنے لگی ۔ برا نہ ماتنا صفو لیکن رعنا کے ابا پسند نہیں کرتے کہ لڑکی کہیں جائے ۔

تو کیا ہمارے ہاں آنے پر بھی اعتراض ہے ۔ آصفہ کی ماں غصے میں چلائی ۔

اے ہے ۔ خالہ منور بولی چاہے اپنا ہی بیٹا ہے پر اللہ رکھے جوان ہے ۔ یہ کہہ کر منور نے مسکرا کر بامعنی انداز سے بہن کی طرف دیکھا ۔

لو فرخ بھائی تو آپ رعنا سے پردہ کرتے ہیں ۔ آصفہ نے بآواز بلند کہا ۔

ہاں ان کا کیا ہے ۔ رعنا نے مسکرا کر کہا ۔ جیسے آصفہ ویسے ہی فرخ صاحب ۔

یہ سن کر فرخ کی کنپٹیاں تھرکنے لگیں ۔ اور وہ دیوانہ وار گھر سے باہر نکل گیا ۔

اگلے روز فرخ بار بار سیڑھیاں چڑھتا اور کوٹھے پر آصفہ اور ماں کو بیٹھے ہوئے دیکھ کر واپس آ جاتا ۔ نہ جانے اس روز ماں آصفہ کو کیا سمجھا رہی تھی ۔ ضرور کوئی پرائیویٹ بات تھی ۔ تبھی تو سر جوڑے باتیں کر رہی تھیں ۔ اور صفو مسکرائے جاتی تھی ۔

ماں نیچے اتری تو وہ بھاگا بھاگا اوپر پہنچا ۔ صفو بڑے مزے میں بیٹھی گنگنا رہی تھی ۔ آج کئی ایک دن کے بعد اس نے صفو کو گنگناتے سنا تھا ۔ بلکہ وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ آصفہ نہ جانے کیوں اداس رہتی ہے ۔ لیکن آصفہ نے یک دم گویا رنگ بدل لیا تھا کتنی مسرور تھی وہ ۔ اس کے باوجود وہ جان بوجھ کر فرخ کے وجود سے منکر تھی ۔ اور یوں ماندے ڈیرے آ جا گا رہی تھی جیسے واقعی کوئی ڈیرے پر آگیا ہو ۔

”صفو“ ۔ فرخ اس کے قریب بیٹھ کر بولا ۔

”اوہ ۔ آپ ہیں ؟“ آصفہ نے بناوٹی تعجب سے کہا ۔

”صفو وہ چلایا صفو تم بھی ۔ اس کی نگاہ میں التجا تھی ۔ تم تو ایسے نہ کرو ۔ صفو تمہارے لیے تو فرق پڑتا ہے ۔

میرے لیے تو بہت فرق پڑتا ہے بھائی جان ۔
سچ ۔ فرخ کی آنکھیں گویا بڑی بڑی جھیلوں میں تیر رہی تھیں۔
اس لحاظ سے وہ بڑی بری ہے ۔
صفو ۔ اس نے تڑپ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ۔
نہیں صفو ۔ نہیں یہ نہ کہو۔
آصفہ نے فرخ کی طرف دیکھا ۔ ۔ ۔ لیکن فرخ اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ کر نیچے لے گیا ۔ ماں نے کنکھیوں سے انہیں آتے دیکھا اور یوں بے خبر بیٹھی رہی جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو ۔ لیکن صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ دبی دبی مسرت سے بھرپور تھی ۔ جب فرخ اور آصفہ دونوں نے کمرے میں داخل ہو کر اندر سے دروازہ بند کر لیا تو ماں چپکے سے غلام حسین کے کمرے میں داخل ہو گئی ۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر میاں سے کہا ۔ ”چپ ، کچھ آصفہ سے کہہ رہا ہے ۔ ابھی ابھی کوٹھے سے آیا ہے ۔ میں نے آصفہ کو سب بات بتا دی تھی “۔ ”اور اگر آصفہ نے بھانڈا پھوڑ دیا تو“ وہ بولے ۔ لو توبہ کرو اس نے کلیجہ تھام لیا ۔ کبھی ایسا ہو سکتا ہے ۔ صفو تو بلکہ آپ چاہتی ہے ۔ اس کے لیے اس سے بڑی خوشخبری کیا ہوگی ۔ ذرا سنیں تو کیا باتیں کر رہے ہیں ۔
کچھ دیر تک وہ دیوار سے کان لگائے سنتے رہے ۔
”دیکھا ۔ میاں تنک کر بولے ابھی سے منتیں کرانے لگا ہے ۔ یہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے ۔“
”ہائے مجھے کیا معلوم تھا ایسا ہوتا ہے ۔“
”تجھے معلوم نہیں تو کسی اور کی بات مان لیا کر ۔“
”میں ادھر جا کر سنتی ہوں ان کی باتیں ۔“
”اونہہ ۔ وہ بولے ادھر نہ جانا ۔ آصفہ سے پوچھ لینا ۔ بعد میں ۔
اے ہے اللہ کرے جلد خوشخبری سنوں ۔“
فرخ اور آصفہ کمرے سے باہر نکلے تو آصفہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی ۔ اور وہ گنگنا رہی تھی ۔

”سج رہے بنرا سج لے“

جب غلام حسین باہر گئے تو آصفہ ماں سے کہنے لگی ۔ امی ۔ کئی بار کہا ہے ہمیں گملے منگوا دو ۔ دیکھو تو پھولوں کے بغیر گھر کس قدر سُونا ہے ۔

"کہوں گی تیرے ابا سے" ماں بولی ۔

"اور یہ دیکھو سفیدی بالکل اتر گئی ہے امی ۔ کتنا گندا ہے ہمارا گھر ۔"

"یہ گھر ہے کیا ؟" فرخ آکر چلانے لگا ۔ "یہ تو کباڑ خانہ ہے کباڑ خانہ ۔"

"بیٹا اب تو بہو آئے گی تو گھر کی شکل نکلے گی ۔ میں تو اب بوڑھی ہو گئی ۔

"ہونہہ بوڑھی" فرخ نے پیار سے ماں کو شانوں سے پکڑ لیا ۔

"لیکن بہو کیسے آئے ۔ تم تو میری بات سنتے ہی نہیں ۔ تمہیں تو بیاہ کرنے سے نفرت ہے ۔ ماں نے فرخ سے کہا ۔

خواہ مخواہ آصفہ ہنسی ۔ فرخ بھائی تو کب سے چاہتے ہیں۔

"صفو" فرخ نے اسے گھورا ۔

"لو دیکھ لو ۔" ماں بولی ۔ بیاہ کی بات کرو تو گھورنے لگتا ہے ۔

"واہ" آصفہ ہنسنے لگی ۔ اب کیا وہ دکھانے کو بھی نہ گھوریں ۔

"آصفہ" فرخ پھر چلایا ۔

"اماں تو یہ سمجھتی ہے فرخ بھائی جو منہ سے کہتے ہیں وہی دل سے چاہتے ہیں ۔"

""توبہ ہے ۔ اماں بولی ۔ جب سے اس کی خالہ آئی ہے ، صفو کی زبان ڈیڑھ گز لمبی ہو گئی ہے ۔

"ہاں ، وہ ہنسی لیکن بھائی فرخ کو کیوں چپ لگ گئی ہے ۔ کہہ دو بھائی جان ۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے جی ۔ کہہ دو "

صفو ۔ وہ اس کی طرف جھپٹا ۔

"بھائی تو خواہ مخواہ بگڑتے ہیں مجھ سے ۔ اچھا اماں تو میں رعنا کی طرف سے ہو آؤں ۔ آصفہ نے پوچھا ۔

نام نہ لے اس کلموہی کا ۔ ماں بولی ۔ شکر ہے ابھی بات پکی نہ ہوئی تھی ۔ ورنہ اس گھر میں آجاتی وہ تو ۔ ۔ ۔ ۔

"اماں ۔" فرخ بے تابانہ چلایا ۔
"سچ کہتا تھا فرخ ۔" ماں نے اپنی ہی دھن میں کہا ۔
لیکن اماں فرخ بولا اور پھر چپ ہو گیا ۔
کچھ کہے گا بھی یا ۔ ۔ ۔ ماں نے ہاتھ چلا کر کہا ۔
آصفہ ہنسنے لگی پھر گنگنا کر بولی ۔ کاسے کہوں جی کی بتیاں ۔
میری سمجھ میں نہیں آتیں تمہاری باتیں ۔
سمجھنے کی ضرورت کیا ہے ۔ آصفہ نے کہا ۔ بس ایک بھابی لا دو ہمیں ۔
سچ ، وہ چلائی کیوں فرخ ۔"
اب وہ کیا اپنے منہ سے ہاں کہہ دیں ۔ آصفہ ہنسی ۔
اے ہے اب مجھ سے شرمانے لگا ہے کیا ۔
کبھی کبھی آ ہی جاتی ہے شرم صفو نے منہ پکا کر کے کہا ۔
رعنا سے ہی کر دو اماں ان کا بیاہ قصہ ختم ہو ۔
فرخ کی آنکھیں گویا سرخی میں ڈوب گئیں ۔
نام نہ لے اس کا ۔ ماں نے ہاتھ چلا کر کہا ۔
اماں ۔ فرخ کی آواز میں منت تھی ۔
کچھ کہو گے بھی ۔ وہ بناوٹی غصے سے بولی ۔
دراصل اماں ۔ تم مجھ سے ناراض ہو ۔ اس لیے کہ میں نے تمہارا کہا نہیں مانا ۔ اور میں نہیں چاہتا کہ تم ناراض ہو جاؤ ۔
لہذا آصفہ بولی ۔ بھائی جان اپنی پیاری ماں کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہیں ۔
لو میں کیا ناراض ہوں تم سے ماں نے کہا ۔
جھوٹ آصفہ چلائی جب تک بھائی رعنا سے شادی نہ کریں گے اماں کبھی ان سے خوش نہ ہو گی ۔
لیکن میں تو نہیں چاہتی کہ فرخ کا بیاہ رعنا سے ہو ۔
"میں جو چاہتا ہوں" ۔ فرخ کے منہ سے نکل گیا ۔
"ہائیں ۔ ۔ ۔" وہ گویا حیران رہ گئی ۔ لیکن کیوں ۔

ہماری مرضی کہہ کر فرخ لپک کر اپنے کمرے میں جا داخل ہوا ۔

اس شام کو بند کمرے میں پھر خالہ منور آصفہ کی ماں اور باپ کی سرگوشیاں ہو رہی تھیں ۔

"میں نے تم سے کہا نہ تھا یہی ایک طریقہ ہے" ۔ غلام حسین نے حقے کا ایک لمبا کش لیا ۔

"لو مجھے کیا معلوم تھا ۔" خالہ منور نے ہونٹ پر انگلی رکھ لی ۔

"یہ آج کل کے نوجوان اپنی مرضی کے متوالے ہیں" ۔ غلام حسین ہنسے ۔

"لو یہ بات سنی تھی کبھی" ۔ آصفہ کی ماں بولی ۔

"شکر ہے بیل منڈھے چڑھی بہن ۔" خالہ منور نے کہا ۔

"آہستہ بولو ۔ وہ سن رہے ہیں ۔ غلام حسین نے اشارہ کیا ۔ پھر باآواز بلند کہنے لگے ۔ بھئی میں اس معاملے میں دخل نہیں دیتا ۔ تم جانو اور تمہاری بہن ۔"

"میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا" ۔ منور اونچی آواز سے بولی ۔ لیکن ۔"

"لیکن ویکن کوئی نہیں" آصفہ کی ماں نے شور مچایا ۔ میرے بیٹے کا بیاہ ہو گا تو رعنا سے ورنہ ہو گا ہی نہیں ۔ سن رکھو میں بھی بات کی پکی ہوں ۔"

ملحقہ کمرے میں فرخ نے ماں کی بات سنی تو اس کا منہ مسرت سے دمک اٹھا ۔ ورنہ ہو گا ہی نہیں اس نے دہرایا اور آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر بال بنانے لگا ۔

عین اس وقت آصفہ داخل ہوئی وہ گویا انجانے میں گنگنا رہی تھی ۔

"سج لے بنرا سج لے"

فرخ نے مڑ کر دیکھا مگر آصفہ کچھ تلاش کرنے میں مصروف تھی ۔

"بھائی جان وہ بولی میری پنسل تھی یہاں ۔"

"ٹھہر تُو شیطان ۔" وہ اس کی طرف لپکا ۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔ اور وہ دونوں میز کے گرد بھاگنے لگے ۔

ہائے ان نوجوانوں کی مرضی ، بند کمرے میں خالہ منور ہونٹوں پر انگلی رکھے کہہ رہی تھی ۔

○..........

جوار بھاٹا

جوار بھاٹا ختم ہو چکا تھا اور اپنے عقب میں ایک سیال کیفیت چھوڑ گیا تھا ۔ چاروں طرف چھوٹی چھوٹی لہریں رواں تھیں ۔ چاروں طرف سے یہ لہریں اس نامعلوم مرکز کی طرف بڑھتیں ۔ اور اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتیں ، دور بہت دور ڈولتا ہوا مرکز جسم کی گہرائیوں میں پیراک پیپے کی طرح ڈول رہا تھا تیر رہا تھا ۔ اور لہروں کے تھپیڑوں سے یوں دھپ دھپ بج رہا تھا جیسے جنگل کے گھنے پراسرار سایوں تلے جنگلی اقوام دف پر ضرب لگا رہی ہوں ، ناچ رہی ہوں ۔

دھپ ۔ دھپ ۔ دھپ ۔

گول مٹول سی مبہم اشکال ناچتیں ۔

ابھار رقص کرتے ۔

اور پھر وہی کیفیت ، وہی طوفان ، وہی جوار بھاٹا گویا کوئی بارود کو آگ دکھا دیتا انگاروں کا فوارہ چھوٹتا ۔ اور چاروں طرف پھول جھڑیاں پھیل جاتیں ۔ پھر مہیب دف کی آواز ابھر آتی ۔ گونجتی جس کے عقب میں وہی سیال کیفیت وہی لہریں ، وہی ڈولتا ہوا پیراک پیپے کا مرکز ۔

ہاں وہ جوار بھاٹا ختم ہو چکا تھا ۔

مرجانہ کی نگاہوں میں گردو پیش کا دھندلکا نکھرتا جا رہا تھا ۔

بنچ کے نیچے لمبی لمبی گھاس کھڑی تھی ۔ گھاس کے ڈنٹھلوں میں کس قدر تناؤ تھا ۔ جیسے ہریاول نے اپنے دشمن کو تباہ کرنے کے لیے تیر تان رکھے ہوں ۔ اس نے ایک نظر اپنے بادامی سوٹ کی طرف دیکھا ۔ ان جانے میں اس کے ہونٹوں سے ایک دبی ہوئی آہ نکلی ۔ پھر نہ جانے کیوں وہ تڑپ کر بنچ سے اٹھ بیٹھی اور گھاس پر دھم سے گر پڑی ۔ ڈنٹھل صابون کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے ۔ گویا ریشم کے تاگوں کے بنے تھے ۔ مرجانہ پر ایک بے نام سی مایوسی چھا

گئی ۔

مرجانہ کا جی چاہتا تھا کہ سامنے کی خاردار جھاڑی پر جاکر لیٹ جائے ۔ اس نے جھاڑی پر نگاہ ڈالی ۔ کانٹے ریشم کے ریشوں کی طرح لٹکے ہوئے محسوس ہونے لگے ۔

کیوں ؟ اس کے دل میں مبہم سا سوال ابھرا ۔ اس کی زندگی میں ایسے طوفان کیوں آتے تھے ۔ وہ جوار بھاٹے کیا تھے ! ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر ایک تانگے والا !!

قحبہ ۔ قحبہ ۔ درخت پر بیٹھا ہوا کوا چلّایا ۔

وہ تڑپ کر مڑی ۔

ہاں آں آں آں ۔ سڑک پر آتا ہوا چھکڑا اسے چھیڑنے لگا ۔

کہیں دور ڈھولک چلا چلا کر اس کا مذاق اڑا رہی تھی ۔

"لاریاں توں پُچھ چن وے ۔"

گیت کے بول اس کے دل میں چٹکیاں لے رہے تھے ۔

فاحشہ ۔ ۔ ۔ ۔ فاحشہ

مہیب دف پھر سے گونجنے لگی ۔

دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ وہ ننگی ہے ۔ اس ریشمی بادامی سوٹ کے باوجود ننگی ہے ۔ اس چلتی ہوئی سڑک کے کنارے ننگی ۔ دفعتاً گویا ایک پردہ سا اٹھ گیا اور قہقہہ مار کر ہنس پڑی ۔ جیسے اپنی عریانی پر نازاں ہو ۔ جیسے صدیوں کی تاریکی نکل کر دفعتاً روشنی میں آگئی ہو ۔ جیسے وہ خود ہی روشنی کی ایک کرن میں تبدیل ہو گئی ہو ۔ اس نے شدید خواہش محسوس کی کہ اٹھ کر کولہے مٹکاتی ہوئی ، ابھاروں کو تان کر سڑک پر جا کھڑی ہو ۔ اور پھر آنکھیں مٹکا کر اُس جاٹ کی طرف دیکھے جو ستانے کے لیے درخت تلے بیٹھا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بائیں ہاتھ پر موٹر ڈرائیور سے شانہ لڑائے اور دیکھے کہ اس کی کھڑی مونچھ کہیں ریشم کے تار کی تو نہیں بنی ہوئی ۔

اُس کی نگاہ گھوڑے پر جا پڑی ۔

فضا میں ایک سرخ فوارہ چھوٹا ۔ سرخ خونیں فوارہ ۔

دھپ ، دھپ ، دھپ ۔
دف کی گونج ابھری ۔
گھبرا کر اس نے اپنی نگاہ دوسری طرف پھیر لی ۔
جاٹ کا ننگا پاؤں کس قدر بھدا تھا ۔ اور اس کا انگوٹھا بڑھنے لگا ۔ بڑھتا گیا ۔
پریشان ہو کر اس نے نگاہ پھیر لی ۔
گھاس کے تیر تنے ہوئے تھے جھاڑی کے کانٹے لپک رہے تھے ۔
اس نے محسوس کیا گویا اس کا جسم ان کی طرف بڑھ رہا تھا ۔ بڑھے جا رہا تھا۔

دھپ دھپ
ڈھکی چھپی دھکنی ہوا دینے لگی ۔ مخروطی غبارے پھٹے جا رہے تھے جیسے اڑا کر جھاڑی پر جا پھینکیں گے اور وہ ان نوکیلے خاروں سے چھد کر لہولہان ہو جائے گی ۔
یہ احساسات اس کے لیے بالکل نئے تھے اور وہ اپنی جرأت اور بے شرمی پر حیران تھے ۔ لیکن اس کے باوجود اس کے دل کے کسی کونے میں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ احساس نیا محسوس ہونے کے باوجود پرانا ہے بے حد پرانا ۔ اور وہ ہمیشہ دل ہی دل میں اس کیفیت سے مانوس تھی ۔ اگرچہ اس نے ذہنی طور پر کبھی تسلیم نہ کیا تھا ۔ آج تو اسے اس ڈھکے چھپے جذبے کو اپنانے میں لذت محسوس ہو رہی تھی ۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی مدتوں کا بھولا بھٹکا ہوا راہی گھر پہنچ گیا ہو ۔
دفعتاً اسے منصب کا خیال آگیا ۔ منصب جس سے آج اس کا نکاح ہونے والا تھا اور جس مقصد کے لیے وہ تانگے پر بیٹھ کر جا رہی تھی ۔ جبکہ گھوڑا بدک گیا اور تانگے والے نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں تھام لیا تھا کہ وہ گر نہ جائے ۔
اور وہ سمجھتی تھی اسے منصب سے محبت ہے ۔
اس کا سر شرم سے جھک گیا ۔ اور وہ گہری سوچ میں پڑ گئی ۔

دو مرتبہ اس کی زندگی میں اس قسم کے جوار بھاٹے آ چکے تھے ۔ دو مرتبہ ایک اس روز جب وہ پہلی مرتبہ منصب سے ملی تھی ۔ اس کا خیال تھا کہ وہ محبت کا جوش تھا۔ پہلی نظر پر ہی اسے منصب سے محبت ہو گئی تھی ۔ اگرچہ اس ملاقات میں "نظر" کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ۔ کیونکہ اس وقت کمرے میں گھپ اندھیرا تھا ۔ لیکن اس وقت تو اس کا بند بند گویا آنکھ بنا ہوا تھا ۔ ایسی آنکھ جسے اندھیرے میں دیکھنے کی قوت حاصل ہوتی ہے ۔ پھر منصب کی شخصیت کی چمک جس نے اس کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیا تھا ۔ وہ تو روحانی جوار بھاٹا تھا ۔ اسی لیے وہ اس کی نوعیت سے واقف نہ ہو سکی تھی ۔

ان دنوں جے ۔ اے ۔ وی پاس کرنے کے بعد وہ نئی نئی شگوفہ پور کے سکول میں معلّمہ کی حیثیت سے آئی تھی ۔ شگوفہ پور کا سکول دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی ۔ چار دیواری کے اندر وسیع میدان میں جب وہ پہلی مرتبہ داخل ہوئی تو اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں ۔ چاروں طرف چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں پر گلابی پنکھڑیاں جھول رہی تھیں ۔ کیاریوں میں ۔ روشوں پر گراؤنڈ میں ، گملوں میں حتیٰ کہ دیواروں اور چھتوں پر بھی ۔ اس طوفان رنگ و بو نے اسے حیران کر دیا ۔ پہلے تو وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتی رہی ۔ پھر رنگ و بو کے اس طوفان سے وارفتہ ہو کر دیوانہ وار اس وسیع میدان میں ٹہلنے لگی ۔

اور مدرسوں میں بھی اس نے پھولوں کے تختے دیکھے تھے ۔ لیکن شگوفہ پور تو تمام کا تمام پھولوں بھرا ایک وسیع خطہ دکھائی دیتا تھا ۔ گلیوں میں ، بازاروں میں ، ڈھلانوں پر ، کھنڈروں میں ، ہر جگہ گلابڑی کی جھاڑیاں رینگتی ہوئی چلی گئی تھیں ۔ وہ تو واقعی شگوفہ پور تھا ۔ بنفسِ نفیس ۔ وہاں پر ہر چیز پھوٹ کر شگوفہ بن جاتی تھی اور ہر شگوفہ بھینی بھینی مہک اور گلابی گلابی رنگ سے لد جاتا تھا۔ اور پھر یوں دکھائی دیتا جیسے ان بلندیوں اور نچانوں پر رنگ و بو کا میلہ لگا ہو ۔

شگوفہ پور میں پھول اگانے کی بجائے انہیں ۔ ۔ ۔ جگہ جگہ اگنے سے روکنے کے لیے محنت کرنی پڑتی تھی ۔ لوگ انہیں روشوں ، چھتوں اور آنگنوں سے صاف کرتے ۔ لیکن جلد ہی وہاں نئی جھاڑیاں اگ آتیں ۔

سڑکوں کی ہی بات نہیں ۔ جھونپڑیوں اور کچے گھروں میں بھی شگوفے پھوٹ آتے تھے ۔ گڑیوں سے کھیلتی چھوٹی چھوٹی لڑکیاں دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہو جاتیں ۔ بدن انگڑائی سی لیتا ۔ اعضاء پھوٹ کر نکل آتے گالوں پر شگوفے پھوٹ آتے اور گھر والوں کو بیٹھے بٹھائے ایک جوان لڑکی کے بیاہ کی فکر پڑ جاتی ۔

جب مرجانہ شگوفہ پور پہنچی تو بلوغت کے باوجود اس کا جسم لڑکوں سا تھا ۔ پتلا دبلا بدن جس پر شباب نے کوئی نقش کاری نہ کی تھی ۔ دو ماہ کے قیام کے بعد دفعتاً نہ جانے کیا ہوا شگوفہ پور نے گویا اس پر اپنا افسوں پھونک دیا ۔ جسم کے خم و پیچ نمایاں ہونے لگے ۔ پتلے دبلے اعضاء میں رنگ اور اس کی لہر دوڑ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ لڑکی سے مٹیار بن گئی ۔

اس کے ساکن جسم میں ان جانے فوارے پھوٹنے لگے ۔ زمین دوز چشمے ابلنے لگے ۔ عجیب سی لہریں رینگنے لگیں ۔ ڈھیلی تاریں گویا تن گئیں ۔ اس تناؤ میں ایک کرب تھا ۔ ۔ ۔ ایک مظلوم اور مبہم لذت ۔ پھر کوئی ان جانا ہاتھ ان تاروں کو چھیڑنے لگا ۔ نغمے لہرانے لگے جیسے چاندنی رات میں پہاڑی کے دامن پر گلابڑی کی جھاڑی کے وسیع پھیلاؤ میں سانپ رقص کر رہے ہوں ۔ خواہ مخواہ دل میں انوکھی خواہشات ابھر آئیں ۔ ایسی خواہشات جنہیں وہ پسند نہ کرتی تھی ۔ ایسی خواہشات جو اس کے ضمیر میں کانٹا بن کر چبھی رہتیں ۔ مرجانہ کی کیفیت ایک ایسے حاکم کی سی ہو گئی ۔ جس کے اہلکاروں اور عوام نے اس کے خلاف بغاوت کر رکھی ہو ۔

پھر وہ واقعہ رونما ہوا ۔

اس واقعہ کی تمام تر ذمہ داری مس سمائلز کی مسلسل مسکراہٹوں پر عاید ہوتی ہے ۔ مس سمائلز مرجانہ کی ہم کار تھی ۔ ملیح رنگ اور بھدے خدوخال کے باوجود اس کی شخصیت بیحد جاذب تھی ۔ اس کی رگ و پے میں تازگی اور بشاشت رواں دواں رہتی تھی ۔ ہونٹ مسلسل مسکراہٹ میں کھلے رہتے تھے ۔

مرجانہ اور مس سمائلز کا آپس میں گہرا دوستانہ تھا ۔ یہ دوستانہ اس قسم کا نہ تھا جو عام طور پر زنانہ مدرسوں میں پایا جاتا ہے ۔ ان دونوں کو اس قسم کے تعلق

سے قطعی طور پر دلچسپی نہ تھی ۔ دن بھر وہ دونوں سکول میں پڑھاتیں ۔ شام کو سکول کے میدان میں کھیلتیں اور جب سورج اپنی سرخ شعاعوں سے مغربی وادی میں آگ سی لگا دیتا تو وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ٹہلتیں ، مسکراتیں اور زیرِ لب کوئی گیت گنگناتیں ۔

پھر جب چاند ادھر کی پہاڑی سے سر نکال کر ڈولتا ار نچان پر بچھے ہوئے پھول چاندنی میں جھلملاتے تو دفعتاً مس سمائلز اس کا ہاتھ جھٹک دیتی ۔ لو بھئی ہم تو چلے ۔ اس وقت اس کے انداز میں بیگانگی پیدا ہو جاتی اور وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں جا بیٹھتی ۔ اس کا کمرہ بورڈنگ کے مین بلاک سے ہٹ کر تھا ۔ چاردیواری کے قریب چیڑ کے درختوں کے جھنڈ تلے ۔

گئی رات تک بورڈنگ کے مین بلاک میں ہنگامہ مچا رہتا ۔ لڑکیاں روز کوئی نہ کوئی سوانگ بھرتیں یا دیر تک استانیوں اور لڑکیوں کی محفل لگی رہتی یا گانے کی مجلس منعقد ہو جاتی ۔ سمائلز نے اس شور شرابے میں کبھی حصہ نہ لیا تھا ۔ دو ایک مرتبہ لڑکیاں اکٹھی ہو کر اس کے پاس گئیں بھی ۔ اسے محفل میں شرکت کرنے کی دعوت دینے کے لیے لیکن اس کے ماتھے پر تیوری دیکھ کر اور آواز میں درشتی محسوس کر کے وہ سب چپ چاپ لوٹ آئیں ۔ وہ سب حیران تھیں کہ یہ مس سمائلز ہیں جس کی موجودگی سے دن بھر مدرسے میں زندگی اور بشاشت کی لہر رواں دواں رہتی ہے ۔ جس کی باتوں پر قہقہے لگتے ہیں ۔ جس کے معمولی اشارات بھی رنگینی سے بھرے ہوئے ہیں ۔ وہ حیران تھیں آخر کیا بات ہے کہ سورج غروب ہوتے ہی مس سمائلز مس فراونز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ Miss Frowns میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔ اس انکشاف کے بعد لڑکیوں نے صبح کے وقت اسے سمائلز اور رات کو مس فراونز کہنا شروع کر دیا تھا ۔ لیکن اس کے باوجود رات کی تیوریوں کا راز سربستہ ہی رہا ۔

اگر اس رات مرجانہ کی طبیعت خراب نہ ہوتی تو وہ بھی اس راز سے آشنا نہ ہوتی ۔ نہ جانے اس رات اسے کیا ہو گیا تھا ۔ طبیعت میں بے وجہ اداسی امڈی چلی آتی تھی ۔ جی چاہتا تھا کہ تنہائی میں جا بیٹھے ۔ اور منہ پر لحاف ڈال کر رو پڑے ۔ لیکن بورڈنگ کی گہما گہمی میں تنہائی اور سکون ممکن نہ تھا ۔ دفعتاً اسے

خیال آیا ۔ مس سمائلز کا کمرہ ۔ اس روز مس سمائلز ایک دن کے لیے شہر گئی ہوئی تھی ۔ اور اس کا کمرہ خالی پڑا تھا جس کی دوسری چابی مرجانہ کے پاس تھی ۔

لڑکیوں کی نظریں بچا کر وہ چپ چاپ بغلی دروازے سے نکل کر چاردیواری کے سائے تلے چھپتی ہوئی سمائلز کے کمرے تک جا پہنچی ۔ کچھ دیر تک وہ برآمدے میں کھڑی ہو کر باغیچے کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھتی رہی ۔ پھر تالہ کھول کر اس ڈر کے مارے اندر چلی گئی کہ کوئی لڑکی اسے دیکھ نہ لے ۔ بستر بچھا دیکھ کر وہ سوچے بغیر اس میں گھس گئی ۔

دیر تک وہ کروٹیں بدلتی رہی لیکن نیند اس کی آنکھوں سے گویا کافور ہو چکی تھی ۔ لحاف اوڑھ کر رونے کے باوجود اسے سکون حاصل نہ ہوا ۔ بلکہ ان دو ایک آنسوؤں نے اور مضطرب کر دیا ۔ اور وہ گھبرا کر پھر اٹھ بیٹھی اور دروازہ کھول کر کھڑی ہو گئی ۔

اس کے روبرو بے حد خوبصورت منظر پھیلا ہوا تھا ۔ اوپر چاند چھوٹی چھوٹی بدلیوں میں جھول رہا تھا ۔ نیچے ایک سبز کٹورہ ڈول رہا تھا ۔ دور کوئی گا رہا تھا ۔ "گھونگھٹ میں گوری جلے ۔" اور وہ بغیر گھونگھٹ کے جل رہی تھی ۔ جانے کیسی جلن تھی جو رینگتی ہوئی لہروں کی طرح اس کے جسم میں ابھر سمٹ رہی تھی ۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ گلابڑی سے کوئی ناگ پھن پھلائے نکل آئے اور اس کے بدن کے گرد لپٹ کر ، بل ڈال کر اس شدت سے دبائے کہ اس کی ہڈیاں چلچلانے لگیں۔ہائیں ۔ اس نے گھبرا کر پیچھے ہٹنے کی کوشش کی ۔ لیکن گرفت اور بھی شدید ہو گئی ۔ مضبوط باہوں کے دباؤ تلے اس کی ہڈیاں چلچلانے لگیں ۔

پیشتر اس کے کہ وہ چیخ مارے وہ چلچلاہٹ جوار بھاٹے میں تبدیل ہو چکی تھی ۔ کشتی کے بادبان تن گئے اور وہ ڈولنے لگی۔ رقص کرنے لگی ۔ جیسے وہ اسی رقص کے لیے طوفان کی آمد کی متمنی تھی ۔ منتظر تھی ۔ طوفان کے تھپیڑے اسے تھپکنے لگے ۔

دھپ ، دھپ ، دھپ ۔

دور ڈھولک کی آواز اس کے دل میں گونج رہی تھی ۔ اور یہ گونج ہر ساعت بلند ہوتی جا رہی تھی ۔

"طوفان میں کشتی چلے ۔"
گیت کی لَے تیز ہوتی جا رہی تھی ۔
دھپا دھپ ۔ دھپا دھپ ۔
کنڈھ کھوہ کے تانگے رقص کر رہے تھے ۔
پھر اسے معلوم نہیں ۔ ایک ارغوانی دھندلکے نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا ۔ ایک ان جانی پرکیف اذیت نے اسے پچھاڑ دیا ۔ پھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
پھر کائنات کا ربط ٹوٹ رہا تھا ۔ شیرازہ بکھر رہا تھا ۔ اس طوفانِ نوح کی تندی سے دنیا فنا ہو چکی تھی ۔ اندھیرے اجالے ایک دوسرے سے ٹکرا گئے تھے ۔ شور اور نغمے خلط ملط ہو گئے تھے ۔
پھر اس کے پہلو سے ایک حسین خالق ابھر آیا اور اس تباہ شدہ کائنات کو ازسرِنو ترتیب دینے لگا ۔ اس کی حرکات میں زندگی تھی۔ آواز میں تعمیری لَے تھی ۔ لمس میں جادو تھا ۔ نگاہوں میں تجدید کی امنگ تھی ۔ کمرے کی فضا اس قادر مطلق کے وجود سے بھری ہوئی تھی ۔ اس کی رگ و پے میں اس کا لمس لہریں لے رہا تھا ۔ ہوا میں خوشبو کا روپ دھارے جھوم رہا تھا ۔
پھر وہ رنگین تموّج رک گیا ۔ ناؤ کنارے لگ گئی ۔
اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک نئی کرن کھیلنے لگی اور پھیل کر مسکراہٹ میں بدل گئی ۔
اور خالق انسان کے روپ میں اس کے روبرو جلوہ گر ہو گیا ۔
پھر اسے یاد آیا کہ وہ مرجانہ تھی ۔ شگوفہ پور کے سکول کی مرجانہ سمائلز کے کمرے میں ۔ اور وہ انسان وہ اجنبی ۔ ۔ ۔ ؟
ٹک میز کا لمپ روشن ہو گیا ۔
"ہائیں ۔ ۔ ۔ "منصب حیرانی سے چلایا ۔
مرجانہ نے منہ چادر میں لپیٹ لیا ۔
کمرے میں طویل خاموشی چھائی رہی ۔
"بولو ۔ ۔ ۔ ۔ بولو !" باہر پرندے چہچہانے لگے ۔
"کتنی حسین ہو تم ۔" منصب مسکرایا ۔

"وحشی جانگلی ۔" وہ پیچھے ہٹ گئی ۔ غصے سے اس کے گال تمتما گئے ۔

"کس قدر پیاری ہو ۔" وہ قریب آ بیٹھا ۔

"جاؤ ۔ چلے جاؤ۔" وہ چلائی ۔ "چور ۔ بدمعاش" پھر وہ رونے لگی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔ وہ روتی رہی ۔ وہ مناتا رہا ۔ وہ گھورتی رہی وہ مسکراتا رہا ۔ پھر دفعتاً جیسے کسی بھولے کو راستہ مل گیا ۔ وہ محبت جتانے لگا ۔ اس پر اور بھی جھنجھلائی ۔ اور وہ اور بھی سنجیدہ ہو گیا ۔ مرجانہ کا رونا سسکیوں میں بدل گیا ۔ اور اس نے منصب کے شانے پر سر رکھ کر سسکیاں لینا شروع کر دیں ۔ ۔ ۔ پھر وہ باتیں کرنے لگے ۔

"مجھے تم سے محبت ہے ۔" وہ بولا۔

وہ مسکرا دی ۔ آنسوؤں بھری مسکراہٹ ۔

وہ ہنس پڑا ۔ "تفریح کے لیے آنا اور محبت کے جال میں پھنس جانا ۔ عجیب تماشہ ہے ۔"

"محبت ۔" وہ زیر لب بولی۔ اس کی آواز میں طنز تھی ۔ "اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو یا مجھے ۔"

"کتنا رنگین دھوکا ہے ۔" وہ ہنسا ۔ "خدا کرے دھوکا ہی ہو ۔"

"اب اس کے علاوہ اور کیا ہی کیا جا سکتا ہے ۔" وہ بولی ۔

"بڑی حقیقت شناس ہو تم" وہ مسکرایا مگر جلد ہی سنجیدہ ہو گیا ۔

"تمہارا نام کیا ہے ۔ بتاؤ"

"اب نام پوچھ کر کیا کرو گے ؟"

"اس میں ہرج کیا ہے ؟"

"اپنے دوستوں کو اپنے کارنامے سنانے کے لیے ہے نا !"

"نہیں نہیں ۔ تم مذاق سمجھ رہی ہو۔ لیکن میں ۔۔۔ اب میں کیسے یقین دلاؤں تمہیں ۔ کاش ۔ ۔ ۔ لیکن چاہے تم کوئی بھی ہو تم بے حد پیاری ہو ۔ اچھا پھر ملیں گے ۔ ہاں ضرور ملیں گے ۔ پھر ممکن ہے میں تمہیں اپنی محبت کا یقین دلا سکوں ۔"

"خدا کے لئے اب جائیے ۔ جائیے ۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو ۔" وہ بولی ۔

"صرف ایک بار کہہ دو تم مجھ سے ناراض نہیں ۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا ۔

"ناراض" ! مرجانہ کی مسکراہٹ میں طنز تھی ۔ میری ناراضگی کر ہی کیا سکتی ہے ۔ اب خدا کے لیے جائیے ۔"

"کتنی صاف گو ہو تم ۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسا ۔ "اچھا الوداعی ہاتھ تو ملا لو ۔" اس کا ہاتھ پیار سے دبا کر وہ چپکے سے باہر نکل گیا ۔ اور دیوار پھلانگ کر باہر چلا گیا ۔ اور مرجانہ کھوئی کھوئی نگاہوں سے کھڑکی سے باہر دیکھتی رہ گئی ۔ حتّٰی کہ صبحِ کاذب کی دھندلی روشنی نے پھیل کر اس خوبصورت منظر کو دھندلا دیا ۔ اور شگوفے سر جھلا جھلا کر اشارے کرنے لگے ۔ پتّیاں سمٹ سمٹ کر مسکرانے لگیں ۔ اور کوئل چلانے لگی ۔ کہہ دوں ؟ کہہ دوں ؟

اور وہ ٹھٹھک کر اُٹھ بیٹھی ۔ اور چپکے سے دروازہ بند کر کے اپنے کمرے کی طرف چل پڑی ۔

اس روز کے بعد شگوفہ پور کے سکول کی روزمرّہ زندگی میں عجیب و غریب انقلاب پیدا ہوگیا ۔

چند ایک روز تو مس سمائلز کھوئی کھوئی رہی ۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس طرح اپنی مسکراہٹ کو قائم رکھے ۔ اسے قائم رکھنے کی شدید کوشش ہی اسے فنا کئے جا رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ وہ کوشش ایک مسلسل تیوری بن کر اس کے ماتھے پر کنڈل مار کر بیٹھ گئی۔ اور دن کی مس سمائلز خالصتاً مس فروانز میں تبدیل ہو گئی ۔ پھر اس کی رات کی زندگی میں بھی ایک انقلاب پیدا ہوگیا ۔ اُسے تنہائی سے وحشت ہونے لگی ۔ رات کو وہ اپنے کمرے کو چھوڑ کر بورڈنگ میں آجاتی اور دیر تک لڑکیوں کے جمگھٹ میں بآواز بلند قہقہے لگاتی رہتی ۔ جیسے قہقہوں کا سہارا لیے بغیر بات نہ بنتی ہو ۔ لڑکیاں حیران تھیں ۔ کہ رات کی مس فراونز مس سمائلز میں کیسے تبدیل ہو گئی ۔

ادھر مرجانہ کو چپ لگ گئی تھی ۔ سمائلز کو قہقہے لگاتے دیکھ کر اس کے ہونٹ مبہم مسکراہٹ میں کھل جاتے اور آنکھوں میں دو تھے سے شگوفے پھوٹ آتے ۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر مہر سکوت لگی رہتی ۔

وہ سبز پیالہ روپہلی چاندنی تلے ڈولتا رہا ۔ دُور پہاڑیاں پنجوں کے بل کھڑی ہو کر جھانکتی رہیں ۔ آبشار اپنا اپنا گیت گنگناتے رہے اور شگوفے جھولتے رہے ۔

دن گذرتے گئے اور ان کے گذرنے کے ساتھ ساتھ مرجانہ کے دل کا مبہم اضطراب یاس بھرے سکون میں بدلتا گیا ۔

کئی بار وہ لڑکیوں کے ہنگامے سے اکتا کر چپکے سے باہر نکل جاتی اور سمائلز کے کمرے کے عقب میں چاردیواری کے قریب سامنی پہاڑیوں کے منظر میں کھوئی دیر تک کھڑی رہتی ۔ پھر دفعتاً وہ مڑ کر چاردیواری کی طرف دیکھتی ۔ ڈر سے اس کا دل دھک سے رہ جاتا ۔ ماتھے پر پسینہ آ جاتا ۔ کوئی دیوار پھلانگ کر آ جائے تو ! اور وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے واپس لوٹ آتی ۔

پھر ایک اور واقعہ رونما ہوا ۔

ہیڈ معلّمہ نے مرجانہ کا ٹائم ٹیبل بدل دیا ۔ بڑے سکول کے علاوہ اب اسے چھوٹے سکول میں بھی پڑھانا پڑا ۔ چھوٹا سکول بڑے سکول سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر واقعہ تھا ۔

کئی بار چھوٹے سکول کو جاتے ہوئے راہ میں وہ ٹھٹھک جاتی ۔ اسے شبہ ہوتا ۔ جیسے سامنے آتا ہوا راہ گیر منصب ہے ۔ اس کے قدم لڑکھڑا جاتے اور دل دھڑکنے لگتا ۔ اس وقت وہ بھول جاتی کہ اس کی ہم کار استانیاں جو اس وقت اس کے ساتھ ہوتیں ۔ کیا کہہ رہی تھیں۔ اس کی اس کھوئی کھوئی کیفیت پر استانیاں حیران تو ہوتیں لیکن انہیں معلوم نہ ہو سکا کہ مرجانہ کی خاموشی کی وجہ کیا تھی ۔

پھر آہستہ آہستہ یہ کیفیت بھی ختم ہوتی گئی ۔ اب اسے خواہ مخواہ اپنی نگاہیں جھک جانے اور دل دھڑکنے پر غصہ آنے لگا تھا ۔ لیکن وہ بے بس تھی ۔

ایک روز جب وہ اکیلی چھوٹے سکول کو جا رہی تھی ۔ تو سڑک کے اس ویران ٹکڑے پر جہاں گھنے درخت کھڑے تھے ۔ اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے ۔ مگر اس نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور چپ چاپ ادھر ادھر دیکھے بغیر چلتی گئی ۔

مردانہ آواز سن کر مرجانہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ۔ پاؤں کی چاپ اس کی طرف تیزی سے بڑھی ۔ چند لمحوں کے بعد وہ اس کے پہلو میں چل رہا تھا ۔ "مرجانہ" وہ پر معنی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ۔

مرجانہ کا دل دھڑک رہا تھا ۔ لیکن اس نے اپنی چال تیز کر دی ۔

"صرف ایک بار مجھے ملنے کا موقعہ دو" ۔ منصب کی آواز میں منت تھی ۔

مرجانہ کے پاؤں میں چلنے کی طاقت مفقود ہوئی جا رہی تھی ۔ وہ تو محض اتفاق تھا کہ عین اسی مقام پر مسافروں سے بھری ہوئی موٹر لاری رک گئی اور لوگوں کو موٹر سے نکلتے دیکھ کر منصب وہیں رک گیا اور چھوٹے مدرسے کے پھاٹک میں داخل ہو گئی ورنہ نہ جانے کیا ہوتا ۔

مدرسے میں پہنچ کر وہ دہم سے صوفے پر جا گری ۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا ۔ پیشانی پر قطرے نمودار تھے ۔

اس کے بعد جلد ہی وہ ایک دوسرے سے ملے ۔

اس رات مرجانہ استانیوں کے ساتھ سینما دیکھنے کے لیے گئی تھی ۔

دفعتاً اس کے منہ پر خوشبو کی ہلکی سی پھوار پڑی ۔ وہ اچک کر بیٹھ گئی ۔ شاید حمیدہ نے اس سے مذاق کیا تھا لیکن ہال میں پھیلے ہوئے اندھیرے کی وجہ سے اسے کچھ معلوم نہ ہو سکا ۔ حمیدہ سینما ہال میں تو مذاق نہ کرے گی ۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ نرگس کے پھولوں کا ایک گچھا اسَ کی گود میں آگرا ۔

عین اسی وقت فلم ٹوٹ گیا اور ہال کی بتیاں روشن ہو گئیں ۔

بائیں ہاتھ کی کرسی پر منصب بیٹھا مسکرا رہا تھا ۔

غصے سے اس کے کان سُرخ ہونے لگے اور احساس بے بسی کی وجہ سے وہ غصہ اور بھی شدید ہو گیا ۔

مرجانہ نے پھولوں کا گچھا پرے پھینک دیا اور یوں حمیدہ سے باتیں کرنے میں منہمک ہو گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔

فلم شروع ہونے کے بعد وہ چپکے سے اٹھی اور ہال سے باہر نکل گئی ۔ سینما ہال سے نکل کر وہ چند قدم ہی گئی تھی کہ منصب لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آ پہنچا ۔ اسے دیکھ کر مرجانہ کا دل دھک سے رہ گیا ۔

"مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کو سکول تک پہنچا آؤں ۔" منصب نے کہا ۔ وہ خاموش رہی اور منصب بلاتکلف اس کے پہلو میں چلنے لگا ۔

"خدا کے لیے وہ چلائی اگر کسی نے دیکھ لیا تو ۔"

"تو کیا ہے۔" وہ سنجیدہ ہو گیا ۔

"کمال کرتے ہیں آپ ۔" وہ غصے سے چلائی ۔

"کمال تو آپ ہی کا ہے ۔ ورنہ منصب تو اچھا خاصہ سمجھدار آدمی ہوا کرتا تھا۔"

"نہیں نہیں" ۔ ۔ ۔ بازار کے چوک کی طرف دیکھ کر گھبرا گئی ۔ مہربانی کر کے اب جائیے ۔"

"صرف ایک شرط پر وہ بولا ۔ " اگر آج رات تم مس سمائلز کے کمرے کے پچھواڑے ملنے کا وعدہ کرو ۔ صرف ایک بار ۔ مرجانہ صرف ایک بار مجھے تم سے کچھ کہنا ہے ۔ میری زندگی اور موت کا سوال ہے وہ منتیں کرنے لگا ۔

"اچھا" وہ بولی ۔ "اب جائیے ۔"

"ملو گی نا ؟"

"ہاں ۔" اس نے سر سے اثبات میں اشارہ کیا ۔

"ضرور ملنا مرجانہ ۔ ۔ ضرور"۔ اور وہ اس ویران سڑک کے اندھیرے میں گم ہو گیا ۔

بورڈنگ میں پہنچتے ہی وہ لڑکیوں کے جھمگٹے میں جا بیٹھی ۔ میری طبیعت اچھی نہ تھی ۔ اس نے کہا ۔ اس لیے میں تو فلم ادھورا ہی چھوڑ آئی ۔ اس کے بعد وہ چہک چہک کر باتیں کرنے لگی ۔ اس روز وہ مسلسل باتیں کئے جا رہی تھی ۔ جیسے چپ چاپ بیٹھنے سے ڈرتی ہو ۔ "اچھی طبیعت خراب ہے ۔" سعیدہ نے کہا ۔ "خدا کرے آپ کی طبیعت روز ہی خراب رہے ۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔ پھر دفعتاً چپ ہو گئی ۔ گالوں پر دو قطرے ڈھلک رہے تھے ۔ "نہیں نہیں ۔ وہ آپ ہی آپ بولی ۔ میرا مطلب ہے ۔" اور پھر مطلب بتائے بغیر ہی خاموش ہو گئی ۔ جیسے وہ مطلب قابلِ اظہار نہ ہو ۔

جب استانیاں سینما سے واپس آئیں تو وہ چپ چاپ جھولا کرسی میں بیٹھی

جھول رہی تھی۔

"عجیب ہو تم" حمیدہ غصے سے چلائی چُپ چاپ ہی چلی آئی ۔

"ہاں وہ بولی میری طبیعت خراب تھی ۔ "

"تمہاری طبیعت کا کچھ پتہ بھی چلے ۔"

"نہیں نہیں "وہ چلائی ۔ میرا مطلب ہے" اور پھر خاموش ہو گئی ۔

"تمہارا مطلب تم ہی جانو یا خدا جانے "وہ ہنسیں ۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ اپنے آپ سے کہنے لگی ۔ نہیں نہیں ۔ میں اسے نہیں ملوں گی کبھی نہیں اور پھر دھم سے چارپائی پر گر پڑی ۔

ٹن ۔ ۔ ۔ ۔ گھڑی کی آواز سن کر وہ چونک کر اٹھ بیٹھی ۔ اوہ ۔ ایک ۔ ۔ ۔

دفعتاً اسے خیال آیا کہ اس کا کمرہ بھی تو سمائلز کے کمرے سے زیادہ دور نہ تھا ۔ اگر وہ وہاں پہنچ گیا تو ۔ وہ گھبرا گئی ۔ اسے خیال آیا کہ وہ ہسپتال کے کمرے میں کیوں نہ چلی جائے ۔

ہسپتال کا کمرہ بورڈنگ کے پرلی طرف تھا ۔ مس سمائلز کے کمرے سے دور جہاں پرنسپل کی کوٹھی تھی ۔ اس کمرے میں بستر بھی موجود تھا۔ ہاں اس نے سوچا اور پھر اٹھ کر چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئی ۔

منصب کو سامنے کھڑا دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی ۔ اور منصب نے بڑھ کر اسے اپنے آغوش میں لے لیا ۔

دھمپ دھمپ

ڈھکی چھپی دف کی گونج اُبھرنے لگی ۔

پھر جب دیوتا نے انسان کا روپ دہار لیا ۔ تو پہلی مرتبہ گردو پیش کو پہچان کر وہ چلائی ۔ لیکن میں یہاں کیسے چلی آئی ۔"

"تم کسی اور طرف جا بھی سکتی تھیں کیا ؟" وہ مسکرایا ۔

"میں تو ہسپتال کی طرف جا رہی تھی ۔"

"لیکن مریض تو یہاں تھا ۔" وہ بولا۔

"عجیب بات ہے ۔" وہ اپنے آپ ہی کہنے لگی ۔

"تو مجھ سے ملنے کا ارادہ نہیں تھا ۔" منصب نے پوچھا ۔

"تمہیں۔" وہ بولی۔

"مجھ سے محبت نہیں تمہیں۔"

"محبت" وہ ہنسی۔

"پھر مجھے تم سے اس قدر محبت کیوں ہے۔ بتاؤ۔"

"اس کے سوا اب کہا ہی کیا جا سکتا ہے۔" وہ مسکرائی۔

"تو کیا میں تم سے جھوٹ بول رہا ہوں۔"

"اپنے آپ سے۔"

"ارے" وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"کتنا پیارا جھوٹ ہے۔ اور تم۔ کتنی منہ پھٹ ہو تم۔ تمہاری راست گوئی نے تو مجھے بالکل ہی ڈبو دیا۔"

اس ملاقات کے بعد وہ کئی مرتبہ آپس میں ملے۔ اور بالآخر منصب نے مرجانہ کو شادی کا پیغام دے دیا۔ اس حقیقت گوئی کے باوجود جو وہ شاید اپنی شخصیت کو جاذب بنانے کے لیے استعمال کیا کرتی تھی۔ مرجانہ کے دل میں بھی منصب کے لیے گہرا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے رویّے سے منصب سے شادی کو ناممکن سمجھتی تھی۔ صرف اس لیے کہ اسے یقین نہ پڑتا تھا کہ وہ منصب کی ہو سکے گی۔ اسے ڈر تھا کہ ایسا نہ ہوا تو اسے صدمہ ہو گا۔

جب اسے معلوم ہوا کہ منصب کے والدین حقیقی نارضامندی کے باوجود نکاح میں شریک ہونے پر آمادہ ہو چکے ہیں تو اس کا وہ بظاہر بے حسی اور بے پرواہی کا پردہ پھٹ گیا اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

پھر وہ واقعہ ہوا۔ جس پر پہلی مرتبہ اپنی طبیعت کی افتاد سے واقف ہوئی۔

اس نے اپنے چھوٹے بھائی ارشد کو بلا بھیجا تھا تاکہ منصب کے پیغام کے متعلق بھائی سے بات چیت کر سکے۔ ارشد مرجانہ سے دو سال چھوٹا تھا انہیں ایک دوسرے سے ملے چار سال گذر چکے تھے۔ کیونکہ فوج میں کمیشن حاصل کر لینے کے بعد اسے فوراً کسی دور دراز مقام پر جانا پڑا تھا۔ جہاں سے وہ حال ہی میں واپس آیا تھا۔

جب وہ ملاقاتی کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے سامنے ایک اونچا لمبا فوجی افسر مسکرا رہا تھا ۔ وہ سمجھی کہ شاید وہ غلطی سے ملاقاتی کمرے میں آ گئی ہے ۔ پیشتر اس کے کہ وہ کمرے سے باہر نکل جاتی ارشد نے بڑھ کر اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا ۔

شڑاک ۔ ۔ ۔ کوئی ہوائی بجلی کی طرح اس کے جسم سے نکل کر فضا میں پھیل گئی

دھپ دھپ ۔ دھوکنی ہوا دینے لگی ۔

پیراک پیپا جھولنے لگا۔

ڈر سے اس کی چیخ نکل گئی اور وہ شدت سے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی ۔ حتیٰ کہ جب اسے یہ معلوم بھی ہو گیا ۔ کہ وہ اس کا اپنا بھائی ارشد ہے تو بھی غبارے معلق ہی رہے اور دف بجتی ہی رہی ۔ اس رات پہلی مرتبہ اسے اپنے آپ پر شکوک پیدا ہوئے تھے ۔ جب بھی اسے اس واقعہ کی یاد آتی تو دل میں اپنے سے بیزاری پیدا ہو جاتی لیکن آج تو حد ہی ہو گئی تھی ۔ ۔ ۔ آج جب وہ نکاح کی رسم کے لیے منصب کے گھر جا رہی تھی ۔ ایک معمولی سے ٹانگے والے نے ۔ ۔ ۔ آج کے واقعہ نے تو گویا اسے بالکل ہی ننگا کر دیا تھا ۔

کیوں ؟ اس کی زندگی میں ایسے جوار بھاٹے کیوں آتے تھے ۔ اپنا بھائی ۔ ۔ ۔ ایک معمولی ٹانگے والا ۔

اس کی نگاہ سامنے بازار کی نکڑ پر پڑی جہاں ایک معمولی سی میلی دوکان میں سفیدے اور سرخی سے تھپی ہوئی ایک عورت کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی ۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہو ۔ جیسے وہ اس کا راز جانتی ہو ۔ جیسے وہ اس کی ڈھارس بندھا رہی ہو ۔

نفرت کی شدت کی وجہ سے مرجانہ نے ایک جھرجھری محسوس کی اور اپنی نگاہ پھیر لی ۔

درخت تلے بیٹھا ہوا جاٹ کرسی پر بیٹھی ہوئی عورت کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا ۔ اس کی نگاہ میں کیسی عریاں چمک تھی ۔ اور اس کے پاؤں کا

انگوٹھا ہل رہا تھا جیسے وہ کسی نامعلوم لپٹی ہوئی دف کے تموّجات کا شاہد ہو، گھبرا کر وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔

تانگے والا اسے گھور رہا تھا۔ اور ساتھ ہی اپنی مونچھ کو مروڑے جا رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ باغ میں بنچ کی جگہ بازار میں کرسی پر بیٹھی ہو۔ دفعتاً اس کی نگاہ پھر بازار کے موڑ پر جا پڑی۔ کرسی پر بیٹھی ہوئی عورت یوں جھول رہی تھی۔ جیسے وہ کوئی ڈھکی چھپی دف ہو۔ یا پیراک پیپا۔

جیسے وہ دہقان کے انگوٹھے کی جنبش پر ناچ رہی ہو۔

دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ اس کا اپنا پاؤں ہوا میں اسی تال پر جنبش کر رہا ہے۔

سامنے وہ اجنبی فوجی لیفٹیننٹ آ رہا تھا۔ نہیں نہیں اس نے شدت سے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی۔ اس کے بازو پر فوجی افسر کی بانہوں کا لمس جلتے ہوئے کوئلوں کی طرح محسوس ہونے لگا تھا۔

گھوڑے کی ہنہناہٹ سن کر وہ اپنے خوابوں سے چونکی اور گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

کرسی پر بیٹھی ہوئی عورت کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔

اس کے سامنے دیوار سے لٹکی ہوئی لالٹین آپ ہی آپ روشن ہو گئی۔ پھر وہ فضا میں معلق ہونے لگی۔ اور آپ ہی آپ مرجانہ کی طرف بڑھنے لگی حتیٰ کہ وہ اس کے سامنے آ رکی۔ اس کا شعلہ لرز رہا تھا۔

دھپ دھپ دھپ۔

دف کی مدہم گونج گویا اس لالٹین کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ نہیں نہیں۔ وہ دیوانہ وار اٹھ بیٹھی۔ میں اُس کی ہوں۔ اس جاٹ کی، اس کوچوان کی، اس فوجی افسر کی، ہر کسی کی، منصب کی۔ نہیں۔ ۔ ۔ ۔ تانگہ۔ تانگہ۔ تانگے والا۔ وہ چلائی۔ ادھر آؤ۔

منصب کی کوٹھی کے دروازے پر ہی اس نے تانگہ چھوڑ دیا اور چپکے سے اندر گھس گئی۔

سامنے کمرے میں ارشد دو ایک دوستوں کے ساتھ گپیں ہانکنے میں مصروف

تھا ۔

منصب کہاں ہے ؟ اس نے پوچھا ۔ شاید دوسرے کمرے میں ہو ۔ اور وہ چپکے سے دوسرے کمرے کی طرف گھوم گئی ۔

"یہ آزاد عورتیں کسی کی نہیں ہوتیں ۔" منصب کے والد کی آواز سن کر وہ رک گئی ۔

"وہ ہر کسی کی ہوتی ہیں۔" وہ بولے ۔ "ہر کسی کی ۔"

"لیکن آپ مرجانہ کو نہیں جانتے ابا جی ۔"منصب ہنسا ۔

"اچھا ۔ جیسے تمہاری مرضی ۔ تم تو اسے جانتے ہو نا ۔" ان کی آواز میں طنز تھی ۔

"ہاں میں اسے جانتا ہوں اور آپ کو معلوم ہے وہ کون سا وصف ہے جس کی وجہ سے وہ مجھے اس قدر پیاری ہے ۔ کچھ دیر کے لیے وہ خاموش ہو گیا ۔

"صاف گوئی" ۔ وہ بلا کی صاف گو ہے ۔ منصب مسکرانے لگا ۔

ٹھن سے مرجانہ کے دل میں نہ جانے کیا ٹوٹ کر گر گیا ۔

"یقین جانئے ۔ منصب جوش میں چلایا ۔" "اگر اسے ذرا بھی شک ہو کہ وہ میری نہیں ہو سکتی تو وہ مجھ سے شادی نہ کرے گی ۔

مرجانہ کے پاؤں رُک گئے ۔ جیسے وہ لکڑی کے بنے ہوں ۔ اس کا دل ڈوب گیا ۔

صاف گو ۔ صاف گو ۔ سڑک پر چلتی ہوئی موٹر چیخنے لگی ۔

ہا ہا ہا ہا ۔ کرسی پر بیٹھی ہوئی عورت قہقہہ مار کر ہنسی اور پھر دونوں بازو اس کی طرف پھیلا دیئے جیسے اسے بلا رہی ہو ۔ آ جاؤ ۔ اپنی جگہ آ جاؤ ۔

سڑک پر جلتی ہوئی بتی نیچے اتر آئی اور لالٹین بن کر اس کے قریب آ معلق ہو گئی ۔

دھپ دھپ ۔ صاف گو ۔

دُور کوئی دف بجنے لگی ۔

مرجانہ نے اپنا رخ موڑ لیا اور چپ چاپ کوٹھی سے باہر نکل گئی ۔

دھپ دھپ ۔ دف کی گونج بلند ہوتی جا رہی تھی ۔ دھونکنی ہوا دے رہی

تھی ۔ غبارے معلق ہوئے جا رہے تھے ۔ اور اس کے سامنے فضا میں ٹنگی ہوئی
لالٹین گویا اُسے بازار کی اُس نکڑ کا راستہ دکھا رہی تھی ۔

ں ۔

اُوئی اللہ

اگر شیخ اجمل کو بے تحاشہ ہنسنے کی عادت نہ ہوتی ۔ اگر خدا بخش کو صمدو کبابئیے کے ہاتھ کے بنے ہوئے کباب کھانے کی لت نہ پڑتی ۔ اگر اسلم کو مس رنگلی کی محبت کا عارضہ اور مجھے چغتائی خطوط کا جنون نہ ہوتا تو یہ آپ بیتی کبھی معرض وجود میں نہ آتی ۔

اگر شیخ اجمل حسین کو بے تحاشہ ہنسنے کی عادت نہ ہوتی اور وہ اپنے بڑے بیٹے جمیل کے اس جواب پر اندر عورتیں بیٹھی ہیں جی ، مجھے وہاں جاتے ہوئے شرم آتی ہے ۔" اس قدر شدت سے نہ ہنستے اور حرکت قلب بند ہوجانے سے ان کا انتقال نہ ہوتا اور جملہ متعلقین ان کی وفات کے بعد بے یارومددگار نہ رہ جاتے تو اس صورت میں جمیل ۱۸ ہارڈنگ روڈ کی کوٹھی چھوڑ کر ایور گرین لاج میں ہمارے ساتھ رہنے کے لئے آمادہ نہ ہوتا ۔ اگر خدا بخش کو صمد کبابئیے کے کباب کھانے کی لت نہ پڑتی تو وہ ایڈورڈ ہوسٹل کو نہ چھوڑتا ۔ ایورگرین لاج میں آنے سے اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ صمدو کبابئیے کی دوکان کے پڑوس میں رہ سکے ۔

اگر اسلم کو رنگلی سے عشق نہ ہوتا اور وہ دن رات رنگلی کے بال روم کے گرد چکر نہ لگاتا اور یہ خبر لاہور سے چل کر ان کے گاؤں راج کوٹ تک نہ پہنچتی اور اُس کے والد موقع کی نزاکت کو محسوس کر کے اس کا عقداس کی بنتِ ام زینب سے نہ کروا دیتے تو اسلم کے سسر سید حبیب اللہ نئے محلے میں وہ مکان ہمارے لئے خالی نہ کرواتے اور ایورگرین لاج کی بنیاد ہی نہ پڑتی ۔

اگر میں چغتائی سے متاثر ہو کر دنیا کے مشہور نقوش سے چند نیم برہنہ نمونے اپنے کیوبیکل کی دیواروں پر نہ سجاتا اور سپرنٹنڈنٹ میرے خلاف پرنسپل سے شکایت نہ کرتے تو میں بورڈنگ سے سزا کے طور پر نکالا نہ جاتا ۔ اس صورت میں ایورگرین لاج بنانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا ۔ اور یہ واقعہ ظہور میں نہ آتا ۔

اس واقعے کی اہمیت کا اندازہ لگائیے ۔

اس واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کے لئے شیخ اجمل حسین کو ہنستے ہنستے جامِ اجل پینا پڑا اور توارثی طور پر جمیل کی ساخت ایسی بنائی گئی کہ وہ عورت سے دلچسپی کا اظہار شرما کر کرے ۔

اس واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کے لئے اسلم اور مس رنگلی کے عشق پر دائمی بندش قائم کی گئی خدا بخش کو کباب کھانے پر اکسایا گیا اور صمدو کو ایسے کباب بنانے اور نئے محلے میں کباب کی دوکان کھولنے پر مجبور کیا گیا ۔

اس واقعہ کو عمل میں لانے کے لئے فطرت کو کیا کیا کرنا پڑا ۔ اور پھر جمیل ، اسلم ، خدا بخش اور میرے علاوہ وہ ربڑ کی گڑیا کی طرح چیختی ہوئی بڑھیا ، اس کی پوتی مینا جسے فطرت نے چغتائی کے کسی عمل سے متاثر ہو کر بنایا تھا ۔ اور بلاضرر ہمارا نوکر بدھو جو برائے نام بدھو نہ تھا ۔

اور ان سارے واقعات کو مجتمع کرنے کے لئے مجھے ہوسٹل سے نکالے جانے کا حادثہ رونما ہوا ۔ جب میرے سپرنٹنڈنٹ مولانا نے ان نیم برہنہ تصویروں کے پیش نظر جو میں نے اپنے کیوبیکل میں ٹانگ رکھی تھیں ، پرنسپل سے شکایت کردی ۔

شام کو جب ہم اکٹھے ہوئے تو اسلم مولانا کے حکم کے متعلق سن کر غصے سے بل کھانے لگا ۔ انہیں گالیاں دینے لگا ۔

”ٹھیک ہے بیٹا“۔ خدا بخش نے سنجیدگی سے کہا ۔ ”مولانا کو بُرا بھلا کہہ کر دل ٹھنڈا تو بعد میں بھی ہو سکتا ہے ۔ اب یہ سوچو کہ کرنا کیا ہے ۔“

اسلم نے سر کھجلا کر کہا ۔ ”یار ایک مکان تو مل سکتا ہے ۔ سالے سسر سے یہ فائدہ بھی نہ اُٹھایا تو ۔۔“

”تو لعنت ہے تم پر “۔ خدا بخش تہہ بند جھاڑتے ہوئے بولا ۔

”کہاں ہے وہ مکان؟“ جمیل نے مسکرا کر پوچھا ۔

”نئے محلے میں“

”بھئی واہ ۔۔۔“ خدا بخش بولا ۔ اپنے صمدو کی دوکان کے پاس ہوا نا ۔ پھر تو دوست میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گا ۔“

اور جمیل بھی تو کوٹھی چھوڑ رہا ہے ۔ اس کی والدہ جا چکی ہیں نا ۔" اسلم نے کہا اور اس طرح ایورگرین لاج کی بنیاد پڑی ۔

آپ جانتے ہیں آج کل نوکر کا ملنا کس قدر مشکل ہے ہم نے بورڈنگ کے باورچیوں سے بات چیت کی تھی بھئی کوئی نوکر منگوا دو ۔ غلام علی نے یہ سن کر ہاتھ کا چمچہ دیگچی کے ڈھکنے پر رکھ دیا تھا "اوہ نوکر ۔۔۔۔؟" کہہ کر یوں سوچ میں پڑ گیا تھا جیسے اُسے کوہ ندا کی خبر لانے کو کہا گیا ہو ۔ احمد حسین بولا علیا تو میڈیکل کالج میں لگ گیا ہے اور گاما کلکتہ دفتر والے صاحب کے ہاں چلا گیا ہے اور وہ ہندوستانی ، اُسے کسی میجر نے پنڈی بلا لیا ہے ۔۔۔۔ اچھا بابو جی میں دیکھوں گا ۔"

ایورگرین میں چار ایک دن تک ہم نوکر کے بغیر ہی رہے ۔ پھر ایک روز جب خدا بخش صمد و کبابیے کی دوکان سے واپس آیا تو اس کے پیچھے پیچھے بدھو تھا ۔ جیسے کوئی پالتو کتا ہو ۔

"لو جناب" خدا بخش نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا ۔ "یہ دیکھ لو آپ کو ، آپ ہیں بدھو ۔ خالص بدھو" ۔

"جی ہاں ، جی ہاں" ۔ بدھو کی لمبوتری تھوڑی کھُل گئی ۔

"اب آیا یقین ۔" خدا بخش نے خطیبانہ انداز میں چاروں طرف دیکھ کر کہا ۔

"جی ہاں ، جی ہاں ۔" بدھو کا منہ کھلا اور اس میں سے تھوک کے چھینٹے دور دور تک اڑے ۔

اس کے بعد بدھو جب بھی کام کاج سے فارغ ہوتا تو چپکے سے کوٹھے پر جا بیٹھتا ۔ بلکہ چھوٹے موٹے کام بھی وہ وہیں بیٹھ کر کیا کرتا ۔ اس پر سبھی اسے ڈانٹتے ۔

"ارے بدھو" اسلم چیختا ۔ "تو بھاگ کر کوٹھے پر کیوں چڑھ جاتا ہے ۔"

"جی ہاں بابو جی" اس کی باچھیں یوں کھل جاتیں جیسے اس کی تعریف کی گئی ہو ۔

"ابے بدھو ۔" خدا بخش ہنستا ، کوٹھے پر کیا دھرا ہے ؟ دھرا ہے کچھ؟"

"جی ہاں" بابوجی کچھ بھی نہیں دھرا "جی ہاں بابو جی"

بدھو کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ چاہے اس کی تعریف کرو چاہے اُسے لتاڑو ۔ چاہے اُس پر رعب جمانے کی کوشش کرو چاہے ہاتھ اٹھانے کی ہر صورت میں اُس کی باچھیں کھل جاتیں ۔ منہ روزن کی طرح یہاں سے وہاں تک کھل جاتا ۔ تھوک کے قطرے ہوا میں اڑتے اور وہ خوش ہو کر چلاتا ۔ "جی ہاں بابوجی ، جی ہاں ۔"

اگر بدھو کو کوٹھے پر دھوپ میں بیٹھنے کی عادت نہ ہوتی تو یہ واقعہ ظہور میں نہ آتا ۔ کیونکہ اس صورت میں ہمیں کوٹھے کے جملہ اسرار کا علم ہی نہ ہوتا ۔

بدھو کی دھوپ کھانے کی عادت کو چھوڑیئے ۔ گر وہ بڑھیا عادی طور پر ربڑ کی گڑیا کی طرح نہ چیختی تو ہماری توجہ پڑوس کے مکان کی طرف مبذول نہ ہوتی ۔

"اے ہے لڑکی سر پر دوپٹہ لے ۔" ربڑ کی گڑیا چیختی اور ہمارے کان کھڑے ہو جاتے اور ہمیں شدت سے احساس ہوتا کہ کہیں پاس ہی ایک لڑکی موجود ہے ۔ ایک ایسی لڑکی جس کے سر سے ریشمی آنچل پھسل پھسل جاتا ہے ۔

"اے ہے مینا ذرا سنبھل کے بیٹھ تجھے اپنا ہوش بھی ہے ۔" اور ہمیں احساس ہوتا کہ وہ لڑکی عمر کے اس حصے سے گذر رہی ہے ۔ جب اپنا ہوش بھی نہیں ہوتا اور سنبھلنا مشکل ہوتا ہے ۔

وہ ربڑ کی گڑیا چیختی اور جمیل خواہ مخواہ شرمائے جاتا اور اسلم کے دل میں مس رنگلی کی یاد تازہ ہو جاتی اور وہ وہ دھن گنگنانے لگتا جو اس نے مس رنگلی سے سیکھی تھی ۔ فالنگ ان لو اگین اور خدا بخش تہہ بند جھاڑ کر کہتا ۔ یار بڑے گرم مصالحے ڈالنے لگا ہے صمدو کبابوں میں ، گرمی ہو گئی ہے کچھ کچھ اور میرے دل میں مینا بدوش کا عمل ابھرتا اور ہلکے دھلے دھلے رنگ دھاریاں بناتے اور خطوط ڈھلکتے اور سیاہ آنکھیں ڈولتیں ۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے کوٹھے کا راز جمیل پر کھلا تھا ۔ وہ صبح سویرے ہی لوٹا لے کر کوٹھے پر چلا جایا کرتا تھا اور پھر دیر تک نہ جانے وہاں کیا کرتا رہتا اور جب واپس آتا تو اس قدر دبے پاؤں زینے سے اترتا کہ چاپ تک سنائی نہ دیتی زینہ اُترتے ہوئے وہ آپ ہی آپ شرماتا اور مسکاتا ، شرمائے

جاتا اور مسکائے چلا جاتا ۔

اس زمانے میں مَیں اس حقیقت سے واقف نہ تھا کہ جھینپ جھینپ کر بھی اظہار محبت کیا جا سکتا ہے ۔ اس کے برعکس میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ جھینپنا اور نیچی نگاہوں سے مسکرانا نسائی خصوصیات ہیں اور عورتوں کے دل میں الٹا نفرت پیدا کرتی ہیں ۔

ان دنوں مجھے زندگی کا تجربہ نہ تھا اور میرا علم چند سستی کتابوں کے اوراق تک محدود تھا جیسے ہر کالج کے لڑکے کا ہوا کرتا ہے ۔ اس لئے میں نے جمیل کے شرمانے کو کبھی اہمیت نہ دی تھی ۔ میں سمجھتا تھا کہ عورت کی بات پر جمیل کا جھینپنا اس بات کا شاہد ہے کہ اسے عورت سے قطعی طور پر دلچسپی نہیں ۔

جمیل اونچے لمبے قد اور درمیانہ جسم کا لڑکا تھا ۔ اس کی جلد کا رنگ سنہری تھا، اس کی آنکھیں شربتی تھیں جو جھینپنے کے علاوہ نیم وا رہتی تھیں ۔ اس کے سنہری بال شاعرانہ انداز میں پریشان رہتے تھے ۔ اس کے ہاں ہر بات کا ایک ہی جواب تھا ۔ دبی دبی مسکراہٹ اور بھیگی بھیگی نظر سے وہ دل کے بڑے بڑے پیچیدہ جذبات کا اظہار کرنے کی قدرت رکھتا تھا ۔ اور نہ ہی میں اس حقیقت سے واقف تھا کہ وہ تکلم جو نگاہ اور ہونٹوں کی لطیف جنبشوں سے پیدا کیا جاتا ہے اپنا مفہوم دور دور تک نشر کر سکتا ہے ۔

جمیل کے بعد کوٹھے کے اسرار کا راز اسلم پر کھلا ۔ اس روز جب وہ نیچے آیا تو غیر از معمول کسی گہرے خیال میں کھویا ہوا تھا ۔ اور ان جانے میں "فالنگ ان لوآگین گنگنا رہا تھا ۔ لیکن اس کے گیت کی دھن سراسر بدلی ہوئی تھی ۔ بول تو انگریزی تھے لیکن دھن میں لوک گیت کا رنگ نمایاں تھا ۔ سب سے پہلے خدا بخش نے اس بدلی ہوئی دھن کو محسوس کیا ۔ حالانکہ خدا بخش کو علم و ادب اور راگ رنگ کی باریکیوں کا احساس نہ تھا ۔ پھر بھی کبھی کبھار وہ دہقانی انداز میں ایسی ایسی باتیں کہہ جاتا کہ بن سمجھے مزا آ جاتا ۔ بولا ۔ "یار اسلم آج مس رنگلی کو ہیر کا روپ دے رہے ہو تم ۔ خیریت تو ہے ۔" اسلم نے ایک لمبی آہ بھری اور بولا ۔ مغربی رقص میں مجھے ایک ہی چیز کھٹکتی ہے ۔ اور وہ ہے اس کی تشنگی اگر ٹانگوں میں مغربی رقص ہو اور نگاہوں میں مشرقی جھکاؤ تو مزا آ جائے ۔ جی

ہی ہی" خدا بخش ہنسا ۔ لو بھئی مس رنگلی کے جسم کا اوپر کا حصہ تو غائب ہوا ۔ کیوں بدھو؟

"جی ہاں بابوجی ۔" بدھو کی باچھیں کھلیں ۔

جمیل کے سنہرے رنگ پر زرد دھبے تیرنے لگے اور آنکھوں میں بوندا باندی ہونے لگی ۔

اسی شام اسلم مرقع چغتائی کی ورق گردانی کرتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا ۔ "یار کالے یہ جھکی جھکی آنکھ بھی کیا چیز ہے ۔ میرے سانولے رنگ کی وجہ سے وہ سب مذاق سے مجھ کالا یا نیگرو کہا کرتے تھے ۔

"لیکن مس رنگلی کی تو کٹورہ سی کھلی رہتی ہیں ۔" خدا بخش ہنسا ۔

"ارے یار اس کا مزہ اور ہی کچھ ہے۔" اسلم نے ایک آہ بھری ۔

"جی ہاں جی ہاں بابوجی ۔" بدھو نے سمجھا کہ اسے مخاطب کیا جا رہا ہے ۔

"نیم وا۔" جمیل مسکرایا اور پھر آنکھیں جھکا لیں ۔

"نیم وا ہو یا کٹورا سی ۔" خدا بخش نے تہہ بند جھاڑتے ہوئے کہا ۔

"سب ایک ہیں ۔ وقت آنے پر کٹورا سی نیم وا ہو جاتی ہیں ۔ اور نیم وا کٹورا سی کھل جاتی ہیں ۔ وقت وقت کی بات ہے ۔"

'جی ہاں بابوجی" بدھو کے پھٹے ہوئے منہ سے چھینٹے اڑے ۔ اور دو خالی کٹورے ہمیں گھورنے لگے ۔

سب سے آخر میں ان نیم وا آنکھوں کی بات خدا بخش تک پہنچی اور اس روز وہ دبا دبا سا رومان منظر عام پر آگیا ۔ خدا بخش نے کس بے دردی سے کشتیوں کا بھانڈا صحن میں پھوڑ دیا ۔

"ارے یار" وہ کوٹھے سے ہی چلایا"کالے ، اسلم جمیل بھئی یہاں تو مس رنگلی کا پاکستانی ایڈیشن کھلا پڑا ہے ۔ بھاگ کے آنا بھاگ کے ۔"

اور ہم سب یوں کوٹھے کو بھاگے جیسے ہمیں اس پاکستانی ایڈیشن کے متعلق کوئی علم ہی نہ ہو ۔ سب سے آگے اسلم تھا ۔ اس کے پیچھے میں اور سب سے پیچھے جمیل ایک عجیب انداز سے مسکراتا ہوا آ رہا تھا ۔

اس روز کے بعد کوٹھے کے اسرار کی حقیقت ایک کھلا راز بن گئی اور سب

نے مل کر کوٹھے پر بیٹھنا شروع کردیا ۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ ہم سب لوگ کوٹھے کے اسرار سے کما حقہٗ واقف ہو چکے تھے ۔ اگرچہ ہر کوئی اس راز کو یوں سینے سے لگائے بیٹھا تھا، جیسے وہ اس کا اپنا راز ہو ۔ ہر کوئی اس راز کو اپنانے کی دھن میں شدت سے مصروف تھا ۔ کاش یہ بات مجھے ان دنوں معلوم ہوتی ۔

پہلی مرتبہ جب میں نے مینا کو دیکھا تو میں حیران رہ گیا تھا ۔ اس روز اتفاق سے میں کالج سے جلدی آگیا تھا ۔ گھر پہنچا تو بدھو کے سوا وہاں کوئی نہ تھا ۔ بلکہ بدھو نے مجھے کہا بھی ۔ "بابوجی ! آج تو آپ سب سے پہلے آگئے ۔" کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اتفاق سے میں سیڑھیوں میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جمیل سیڑھیوں کے بالائی حصے میں کھڑا مسکائے جارہا ہے میں بہت حیران ہوا کہ میاں جمیل دیوار سے لگ کر مسکرائے کیوں جاتے ہیں ۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹھکا اور پھر معمول کے خلاف اونچی آواز میں کہنے لگا ۔ "آؤ رُک کیوں گئے ۔" اوپر جاکر میں نے چاروں طرف دیکھا لیکن وہاں جمیل کے سوا کوئی نہ تھا ۔ اور وہ اسی طرح کھڑا مسکرائے جا رہا تھا ۔ نہ جانے کیوں میں کھلکھلا کر ہنس پڑا ۔ اور اس نے مسکرانا چھوڑ لجانا شروع کر دیا ۔ اور پھر جلد ہی لوٹا اٹھا کر نیچے اتر آیا ۔

کچھ دیر تک میں بے مصرف ٹہلتا رہا ۔ ایورگرین صرف ایک منزلہ مکان تھا ۔ اس کے ایک طرف گلی تھی ۔ دو جانب تین منزلہ مکانات کی اونچی لمبی دیواریں کھڑی تھیں ۔ اور ایک طرف پرانی ساخت کی نانک چندی اینٹوں کی ایک منزلہ دیوار تھی جس میں ایک بند کھڑکی تھی ۔ جس کے اردگرد جالی دار اینٹیں لگی ہوئی تھیں ۔ لیکن پرلی جانب سے جالیوں کے سوراخ پلستر سے بند کئے ہوئے تھے ۔

جب میں اکتا کر نیچے اترنے لگا تو دفعتاً ایک حرکت ہوئی اور جالی کے سوراخ روشن ہوگئے جیسے کسی نے ان کی پشت کا پلستر توڑ کر وہاں گیس جلا دیا ہو ۔ میں رُک گیا اور غور سے ان سوراخوں کی طرف دیکھنے لگا ۔ دس پندرہ منٹ کے بعد ان سوراخوں میں دھندلے رنگدار دھبے سے دکھائی دینے لگے ۔ دو سوراخوں میں سبز دھبے چمکنے لگے ۔ ایک سیاہ دھبہ واضح ہونے لگا اور دو تین سنہری دھبے

جھلملائے ۔ سنہری دھبوں میں جنبش سی ہوئی ۔ ایک دھندلی سی مسکراہٹ جھلملائی اور گھنی پلکوں کا چھتر گرنے لگا ۔

دفعتاً ربڑ کی گڑیا بھاری آواز میں بھیں بھیں کرنے لگی ۔

"اے ہے لڑکی تو پھر یہاں کھڑکی کھول کر بیٹھ گئی ، ہزار بار کہا ہے کہ ہر وقت کتاب لے نہ بیٹھ جایا کر۔"

"اوئی اللہ ' کہیں بیٹھنے بھی دیں گی آپ ۔" ایک رنگین آواز گونجی ۔

اف وہ اوئی اللہ سارے جہاں کا حسن رنگینی ، اکتاہٹ ، نزاکت اور زندگی سمٹ کر اس اوئی اللہ میں سما گئی تھی ۔

میرا دل بیٹھ گیا ۔

کھٹ سے کوئی دروازہ بند ہوا اور جالی کے سوراخوں پر پھر سے ظلمت چھاگئی جیسے کسی نے پلستر کر کے اندر سے انہیں بند کر دیا ہو ۔

میں مبہوت کھڑا تھا ۔ دور تک ، جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی ۔ چھتوں ، منڈیروں اور دیواروں کا انبار لگا ہوا تھا جن میں مندر کا ایک سنہرا کلس بھی شام کی گلابی روشنی میں چمک رہا تھا ۔ جس پر چند ایک چیلیں خاموشی سے اڑ رہی تھیں ۔ پاس ہی ایک مسجد سفید چادر اوڑھے ہوئے سجدے میں گری ہوئی تھی ۔ آسمان پر گلابی بدلیاں یوں چمک رہی تھیں جیسے اس اوئی اللہ کی تمام تر رنگینی انہوں نے جذب کر لی ہو ۔

پھر وہ دھبے آہستہ آہستہ مجھ پر مسلط ہوتے گئے ۔ میرے ادراک میرے خیالات ، میرے جذبات پر حاوی ہوتے گئے ۔ کتاب پڑھتے پڑھتے دفعتاً چھپے ہوئے حروف میں ایک جنبش ہوئی اور عبارت میں کچھ سوراخ کھل جاتے اور پھر رنگین ، سیاہ اورسنہری دھبے ناچتے اور گھنے بالوں کا ایک چھتر گرتا ۔۔۔۔ ایک سیاہ کستی ڈولتی حتیٰ کہ میں کتاب بند کرنے پر مجبور ہو جاتا اور ان جانے میں کوٹھے پر جا چڑھتا اور سیڑھیوں کے مٹیالے اندھیرے میں کھڑا انتظار کرتا کہ کب سوراخوں کا پلستر اکھڑے اور وہ دھبے نمودار ہوں ۔ اور اس سنہرے مندر میں ناقوس بجے اوئی اللہ میں کدھر جاؤں اوراس اوئی اللہ کی رنگینی بادلوں میں منعکس ہو ۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ لیورگرین لاج میں میرے علاوہ اور بھی ایسے تھے جن کی کتابوں میں سوراخ کھل جاتے تھے اور نگاہوں تلے رنگین دھبّے ناچتے تھے۔ لیکن ان دنوں نہ جانے کیوں میں اس بات سے قطعی واقف نہ تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ ان دھبّوں کی حقیقت مجھی تک محدود ہے۔ وہ رنگین امریکہ صرف میری ہی دریافت ہے۔

مجھے اس بات کا اندازہ بھی کیسے ہوتا۔ جب کبھی چھٹی کے دن ہم سب کوٹھے پر دھوپ میں بیٹھے ہوتے تو ہم میں سے کوئی بھی ان جالیوں سے دلچسپی کا اظہار نہ کرتا تھا۔ کوئی نگاہ بھر کر ادھر دیکھتا ہی نہ تھا۔ میں تو خیر اس بات کو صیغۂ راز میں رکھنے کے لئے ادھر نہ دیکھنے پر مجبور تھا۔ میری بات چھوڑیئے۔

اسلم عام طور پر اپنے محبوب رسالہ لائف کی ورق گردانی کیا کرتا تھا۔ اور کبھی کبھی اِن لَوَاگین" گنگنانے لگتا۔ اور گنگناتے وقت سرسری طور پر ادھر دیکھ بھی لیتا۔ لیکن یہ تو معمولی بات تھی۔ جمیل تو ہمیشہ ادھر پیٹھ کرکے بیٹھتا تھا۔ اگرچہ وہ گھسیٹ کر اپنی کرسی احتیاط سے اس مقام پر کرلیا کرتا تھا۔ جہاں سے وہ جالیوں میں سے بخوبی نظر آسکے۔ یہ بات قابل توجہ نہ تھی۔ کیونکہ دلچسپی تو دیکھنے سے ظاہر ہوتی ہے۔ اپنا آپ دکھانے سے نہیں۔ اور خدا بخش تو زیادہ تر اوپر بیٹھتا ہی نہ تھا۔ چند ایک منٹوں کے لئے کوٹھے پر ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر یوں گھومتا جیسے شیر پنجرے میں قید ہو۔ اور پھر نیچے اتر جاتا اور کچھ دیر کے بعد ازسرنو اوپر آکر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر گھومنا شروع کر دیتا۔ تہہ بند جھاڑتا۔ بدن کھجاتا اور آپ ہی آپ گنگناتا۔ بہت ہی مصالحے ڈالنے شروع کردیئے ہیں صمدو نے گرمی ہوگئی ہے کچھ کچھ۔۔"

البتہ جب کبھی اس مندر میں اوئی اللہ کا ناقوس بجتا تو سب کے کان کھڑے ہو جاتے۔ اسلم کے ہاتھ سے پرچہ چھوٹ جاتا۔ جمیل کا رنگ نہ جانے کیوں زرد پڑ جاتا، آنکھوں میں بوندا باندی ہونے لگتی۔ مگر وہ چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ اور خدا بخش گرمی سے بے حال ہو کر تہہ بند جھاڑتا اور صمدو کبابئے کو گالیاں دیتا۔ وہ بھیں بھیں کرنے والی ربڑ کی گڑیا چیختی اور دھپ سے دروازہ بند کرنے کی آواز آتی اور ان جالیوں پر ظلمت چھا جاتی، اور پھر۔۔۔۔۔ پھر مجھے لوگوں کی طرف

دیکھنے کا ہوش نہ رہتا اور میری نگاہ میں مکانوں ، منڈیروں اور دیواروں کا وہ انبار کانپتا اور مندر کا کلس چمکتا، چیلیں منڈلاتیں اور بادل رنگ چھلکاتے ۔۔۔ اور ربڑ کی گڑیا چیختے چلی جاتی ۔

ان حالات میں کیسے شک کر سکتا تھا کہ ان رنگین سنہرے دھبوں کا راز ان پر آشکار ہے اور اگر آشکار بھی تھا تو وہ اس میں دلچسپی لیتے تھے ۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے میں اس راز کے تحفظ کے خیال سے ان جالیوں میں کسی قسم کی دلچسپی ظاہر نہ کیا کرتا تھا ۔ لیکن میرا دل دھک دھک بجتا رہتا اور کیفیت ایسی ہوتی جیسے کوئی ہمہ تن گوش ہو ۔ صبح اور شام کے وقت جب بھی موقع ملتا میں دبے پاؤں کوٹھے پر چڑھ جاتا اور سیڑھیوں کے اختتام پر سائے میں کھڑا ہو کر سگریٹ سلگا لیتا ۔

سائے میں کھڑے ہونے سے میرا مقصد اپنے آپ کو اس نقش چغتائی سے نہیں بلکہ اس چیختی ہوئی بڑھیا سے چھپانا ہوتا تھا ۔ جو چیل کی طرح اس سنہرے کلس پر چھائی رہتی تھی ۔ اس کی حفاظت کے لئے چوکس رہتی تھی ۔ دو ایک بار میں نے دھوپ میں کھڑے ہونے کی جسارت بھی کی تھی ۔ مگر اس کے فوراً بعد ہی دھپ سے عقبی دروازہ بند اور جالی کی وہ آنکھیں بے نور ہو کر رہ گئی تھیں ۔ ظاہر ہے کہ مینا یہ پسند نہ کرتی تھی کہ میں روشنی میں کھڑا ہو کر اس سنہرے مندر کے سامنے سیس نواؤں ۔ اس لئے میں سیڑھیوں کے اندھیرے ہی میں کھڑا رہتا اور اسے اپنی دھندلی موجودگی کا احساس دینے کے لئے سگریٹ سلگا لیتا ۔ اور سگریٹ سلگتے ہی جالیاں روشن ہو جاتیں اور وہ "جگسا پزل" منظرِ خاص پر آ جاتا ۔ پھر میں اس تصویر کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے جوڑنے میں مصروف ہو جاتا ۔ اب تو وہ ٹکڑے بے حد روشن اور رنگین ہو چکے تھے ۔ یا میری نظر مشاق ہو چکی تھی ۔ بہر حال میری سب سے بڑی خواہش تھی کہ کسی روز دیوار کی وہ بند کھڑکی کھلے اور مینا چند ساعت کے لئے وہاں آ کھڑی ہو ۔ وہ گھنی پلکیں جھلکیں اور آنکھوں کے سیاہ کونوں میں چمک لہرائے گوری بانہیں لٹکیں لمبی لمبی انگلیاں ایک شانِ بے نیازی سے کائنات پر چھا جائیں ۔ اور مینا کی گھومتی بل کھاتی لکیریں کائنات کو اپنے آغوش میں لے لیں ۔

ایورگرین والوں کو قطعی طور پر معلوم نہ تھا کہ میں کسی حسین راز سے واقف ہوں ۔ یا ان گھومتی ہوئی لکیروں کی لپیٹ میں آگیا ہوں بلکہ وہ تو کہا کرتے تھے ۔ "کالے تیرا کوئی چانس نہیں ۔ پنجاب کی لڑکی افریقی رنگ اور نقوش پسند نہیں کرتی ۔ سمجھے نیگرو"۔ اور وہ ہنستے ۔

وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ لڑکیاں سانولے رنگ کو پسند نہیں کرتیں ۔ بیوقوفوں کو معلوم نہ تھا کہ رنگوں کا تضاد سب سے زیادہ کشش کا باعث ہوتا ہے ۔ کرشن کنھیا کی ہی مثال لیجئے ۔ انکا رنگ سانولا پیش کیا جاتا ہے اور پھر گوپیاں بار بار انہیں سانورے کنھیا کیوں کہتی تھیں ۔ لیکن میرے ساتھی ان باتوں کو کیا جانتے بیچارے میں نے اپنے کئی ایک دوستوں سے اس بارے میں تحقیق کی تھی مثلاً رفعت حسین کو ہی لے لیجئے ۔ کتنا گورا چٹا رنگ ہے اس کا ، سارے کا سارا خاندان ہی فیس پاؤڈر سے لت پت ہو رہا ہے لیکن جب اس کے ابا نے ایک گوری چٹی حسینہ سے اس کا رشتہ کرنے کی کوشش کی تو وہ میرے پاس آکر رو دیا ۔ "یار تباہ ہو گیا میں ، سفید پھٹک رنگ ہے اس کا ۔ اتنا چوڑا اور سُرخ منہ جیسے چقندر ہو ۔" اور بالآخر اس نے ایک کالی کلوٹی چھوکری سے محبت لگالی ۔ جو عشق کے درجے تک جا پہنچی تھی ۔

لیکن ایورگرین کے ساتھیوں کی یہ غلط فہمی میرے حق میں بڑی مفید تھی ۔ لہٰذا میں نے اس موضوع پر ان سے کبھی بحث نہ کی تھی ۔ بحث کرنا تو الگ رہا ۔ حالت یہ تھی کہ ان کے پاس بیٹھنا بھی میرے لئے دوبھر ہوتا جارہا تھا ۔ جی چاہتا کہ تنہائی میسر ہو ۔ اور میں سگریٹ سلگا کر سیڑھیوں میں کھڑا ہو جاؤں ۔۔۔۔۔ اب تو مینا میری موجودگی محسوس کرکے بار بار مسکراتی اور بہانے بہانے ایسی ایسی باتیں کر جاتی کہ میں دل مسوس کے رہ جاتا ۔ وہ اپنی چھوٹی بہن پینا سے کھیلتی ، باتیں کرتی ، اسے چھیڑتی اور ذرا خاموش نہ ہوتی ۔ جب تک وہ آفت کی پر کالہ بڑھیا خدا اُسے غارت کرے بھیں بھیں شروع نہ کر دیتی اور وہ بڑھیا تو یہ ہے جب بات کرنے پر آجاتی تو گویا گھر میں زلزلہ آجاتا ۔ جیسے بگڑا ہوا ریڈیو شائیں شائیں کر رہا ہو ۔ "اے لڑکی تجھے کسی کا خیال نہیں کسی کا لحاظ نہیں" اس پر مینا مسکرا کر مدھم آواز میں کہتی ۔ اوئی اللہ اتنا خیال تو ہے ، ہر

دم لگا رہتا ہے" اور میری طرف معنی خیز انداز سے دیکھتی اور وہ بڑھیا اور بھی بگڑتی "توبہ کتنی باتیں بنانی آگئی ہیں ۔ اور پھر مندر کا کلس تیئے انداز سے چمکتا اور وہ چیل اس کے گرد چکر لگاتی اور میرا دل بلیوں اچھلتا ۔ اچھلے جاتا ۔

پھر وہ واقعہ جس نے ہماری محبت کو ہمیشہ کے لئے استوار کردیا اور اس کی تابانی کو دوام بخش دیا ۔

ایک روز جب ہم سب کوٹھے پر بیٹھے تھے اور ہوا زوروں پر تھی اورجالی کے سوراخ منور تھے تو نہ جانے کدھر سے کاغذ کا ایک ٹکڑا اڑتا ہوا آیا اور میں نے تفریحاً اسے دبوچ لیا وہ رسالے کا ایک ورق تھا ۔ جس پر ایک رنگین تصویر چھپی ہوئی تھی ۔ میں نے اس کاغذ کو اس بند کھڑکی کے نیچے دیوار کے ابھرے ہوئے حصے پر رکھ کر اس پر ایک اینٹ رکھ دی ۔ ایسا کرنے سے میرا کوئی خاص مقصد نہ تھا ۔ اور نہ ہی مجھے اس بات کا اندازہ تھا کہ یہ چھوٹی سی تفصیل ہمارے رومان میں اتنی بڑی حیثیت اختیار کرے گی ۔

اگلے روز جب میں کوٹھے پر گیا تو کچھ دیر کے بعد میری نگاہ اس اینٹ پر پڑی جس کے نیچے میں نے کاغذ تہہ کرکے رکھا تھا لیکن اینٹ تلے کاغذ دکھائی نہ دیا ۔ خیر میں نے اس بات کو قطعی اہمیت نہ دی ۔ لیکن جب میں نے سیڑھیوں کے اختتام پر کھڑے ہوکر حسب معمول سگرٹ جلایا اور وہ جالی بقعۂ نور ہوئی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مینا وہی کاغذ تھامے ہوئے بیٹھی تھی ۔ کیونکہ اس پر وہی تصویر صاف دکھائی دے رہی تھی ۔ وہ کاغذ کی طرف اشارے کرکے مسکرا رہی تھی ۔

پہلی مرتبہ مجھے خیال آیا کہ وہ بند کھڑکی کھل سکتی ہے' کھلتی ہے اور مینا نے اسے کھول کر وہ کاغذ اٹھایا ہے، اور ۔۔۔ اور کاغذ بھی اسی طریق سے مینا کے پاس پہنچائے جا سکتے ہیں ۔ یہ سوچتے ہی میں نیچے اُتر آیا اور اندر سے کمرا بند کرکے مینا کو خط لکھنے میں مصروف ہوگیا ۔ میرا خیال تھا کہ میں چند ایک سطریں لکھ کر ختم کردوں گا ۔ لیکن نہ جانے کیا ہوا مجھے نہ جانے کہاں سے جذبات امڈتے چلے آئے اور میں ورق پر ورق سیاہ کرتا چلا گیا ۔ خط ختم کرنے کے بعد مجھے اپنے جذبات کی شدت کا احساس ہوا ۔ ایک تفریحی کھیل ایک محض دل لگی

میرے لئے کس قدر اہمیت حاصل کرچکی تھی ۔ اس روز پہلی مرتبہ میں اپنے جذبات کی حقیقت اور شدت سے واقف ہوا ۔

سیڑھیوں کے سائے میں کھڑے ہوکر سگریٹ کے سلگتے انگارے کی روشنی میں مَیں نے مینا کو وہ خط دکھایا اور پھر شام کے جھٹپٹے میں اُسے اسی اینٹ کے نیچے چھپا دیا جو بند کھڑکی تلے بنے ہوئے چھجے پر رکھی تھی ۔ اگلے روز صبح سویرے میں کوٹھے پر چڑھا ۔ اینٹ اٹھائی ۔ خط غائب تھا ۔ میرے دل میں انبساط کی لہر دوڑ گئی ۔

میرے لئے وہ دن گذارنا مشکل ہوگیا ، رہ رہ کر خیال آتا، کیا مینا جواب دیگی ، اگر اس نے جواب نہ دیا تو ، اگر وہ ناراض ہوگئی تو، اگر اس نے عقبی دروازہ کھولنا بند کردیا تو ۔ سارا دن مجھے اسی قسم کے خیال ستاتے رہے۔ رات بھر نیند نہ آئی ۔ اور میں نے کروٹیں بدل بدل کر رات کاٹی پھر صبح سویرے ہی میں لوٹا لے کر اوپر بھاگا ــــــ۔ اینٹ کے نیچے کاغذ کا ایک کونا دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے ۔

کمرے میں واپس پہنچ کر دروازہ بند کرکے میں نے وہ کاغذ کھولا ۔ کاغذ پر صرف ایک لائن لکھی ہوئی تھی ۔ اوئی اللہ اگر یہ کسی اور کے ہاتھ پڑ جاتا تو ؟"

اس کے بعد اس کے خط آہستہ آہستہ طویل ہوتے گئے اور ایک مہینے کی خط وکتابت کے بعد تو وہ دبے دبے الفاظ میں اظہارِ محبت بھی کرنے لگی ۔ لیکن ہمارے خطوں میں نہ تو عنوان ہوتا تھا اور نہ ہم ایک دوسرے کا نام لکھا کرتے تاکہ اگر وہ کسی کے ہاتھ پڑ جائے تو بھی حقیقتِ حال کا پتہ نہ چلے ۔

ہم باری باری خط لکھا کرتے تھے ایک روز وہ لکھ کر اینٹ تلے رکھ دیتی اور اگلے روز میں اس کا جواب لکھ کر وہیں چھپا دیتا جسے وہ رات کے وقت کھڑکی کھول کر اٹھا لیتی تھی ۔ کیسے پیارے دن تھے وہ ، ان رنگدار دھبوں نے اس جھکی جھکی آنکھ نے اس نغمہ ریز اوئی اللہ نے اور ان اشارات بھرے خطوط نے زندگی کے سادہ ورق کو سنہری بنا دیا تھا ۔ یہ کیفیت صرف مینا کے خطوط کا نتیجہ نہ تھی ۔ میرے اپنے جذبات میرے لیے انوکھے اور پر کیف معلوم ہوتے ۔ جب میں اُسے خط لکھتا تو میرے دل سے نئے نئے انوکھے خلوص بھرے جذبات ابھرتے

اور میں ان کی سنجیدگی اور خلوص پر حیران ہوتا ایسے جذبات جن کے وجود کا مجھے خود علم نہ تھا جو نہ جانے دل کی کن گہرائیوں سے ابھرتے تھے ۔ ان ہی جذبات کی وجہ سے یا نہ جانے کیوں اس دور کے تعلق میں جو محض وقت کٹی اور تفریح کے لئے پیدا ہو گیا تھا ۔ ایک بے نام سنجیدگی اور پاکیزگی پیدا ہوتی گئی ۔ نہ جانے کیا وجہ تھی ۔ ایک ماہ کے قلیل عرصے میں ایورگرین کے تمام افراد سنجیدہ ہو چکے تھے ۔ جمیل نے بالکل ہی چپ سادھ لی تھی ۔ اگرچہ وہ طبعی طور پر خاموش لڑکا تھا اور اس کا بڑا سے بڑا اظہار بھی ایک خاموش مسکراہٹ یا ایک مدھم سرگوشی تک محدود ہوتا تھا ۔ یا زیادہ سے زیادہ اس کی آنکھوں میں بوندا باندی سی ہونے لگتی تھی ۔ لیکن اب تو وہ بالکل ہی خاموش ہو چکا تھا ۔

وہ صبح سویرے بیدار ہوتا اور ہمارے جاگنے سے پہلے ہی تمام ضروریات سے فارغ ہو کر بیٹھ جاتا۔ کالج سے واپسی کے بعد وہ چپ چاپ میز پر بیٹھ کر مطالعے میں مصروف رہتا ۔ اسلم نے کرکٹ کھیلنے کی نئی مصروفیت پیدا کر لی تھی اور زیادہ تر وقت اسی میں بسر کرتا تھا ۔ خدا بخش حسبِ معمول یا تو صمدو کی دوکان پر چلا جاتا اور یا بدھو سے باتیں کرنے میں مشغول رہتا اور اوئی اللہ کی آواز سن کر تہبند جھاڑتا اور کہتا "میاں بدھو کچھ سنا جناب نے" اور بدھو کی پھوٹ پھس سے کھل جاتی اور چھینٹوں کا فوارہ چلتا ۔ "جی ہاں جی ہاں بابوجی ۔" "لیکن بدھو ۔" خدا بخش کھجاتے ہوئے جواب دیتا ۔"یہ تو پیڑ گنّے کا بکھیڑا ہے اور ہم ٹھہرے آم چوسنے والے" اور بدھو بے سوچے سمجھے ہنستا اور ربڑ کی گڑیا چیختی اور میری نگاہوں میں سنہرے کلس پر چیلیں منڈلاتیں ۔

پھر وہ منحوس دن طلوع ہوا ۔

اس روز جب میں کالج سے واپس آرہا تھا تو گلی میں مینا کے مکان کے صدر دروازے پر وہ بڑھیا برقعہ پہنے کھڑی چلا رہی تھی ۔ "لڑکی ذرا خیال رکھنا پینا کو باہر نہ جانے دینا میں شام تک لوٹ آؤں گی ۔"

بڑھیا کو باہر جاتے دیکھ کر میں سمجھا کہ مطلع صاف ہے اور بھاگ کر سیدھا کوٹھے پر جا چڑھا اور سیڑھیوں کے دھندلکے میں کھڑا ہونے کے بجائے باہر دھوپ میں جا کھڑا ہوا ۔ جالی کے سوراخ روشن تھے ۔ اور مینا حسب معمول کرسی

پر بیٹھی مینا سے کھیل رہی تھی ۔ اس کے بال کھلے تھے ۔ حسب معمول گردن ایک طرف جھکی ہوئی تھی اور نگاہیں جھکی جھکی تھیں ۔ دفعتاً اس نے سر اٹھایا ۔ پہلی مرتبہ سورج کی روشنی میں مَیں دیوی کو سیس نوانے کے لئے جھک گیا ۔

عقبی دروازہ بند ہونے کی آواز آئی اور میں چونکا ۔ جالیوں پر ظلمت طاری تھی ۔ چند لمحوں کے لئے تو میں حیران کھڑا رہا ۔ پھر چپ چاپ نیچے چلا آیا ۔

پھر بیٹھے بٹھائے دفعتاً مجھے خیال آیا ۔ شاید بڑھیا کے علاوہ گھر میں کوئی مہمان آیا ہوا ہو ۔ جس کے سامنے مینا کو تشہیر گوارا نہ ہو ۔ اس خیال سے مجھے تسلّی سی ہوئی ۔ لپک کر کوٹھے پر گیا ۔ لیکن میرے سگریٹ سلگانے کے باوجود جالیاں روشن نہ ہوئیں اس روز میں کئی ایک مرتبہ کوٹھے پر گیا لیکن بے سود ۔

میرا جی چاہتا تھا کہ کمرے میں بیٹھ کر آنسوؤں سے اُسے ایک خط لکھوں لیکن اس روز مینا کی باری تھی اگلے روز مجھے اس کا خط ملنا تھا ۔

نہ جانے اگلی صبح میں نے مینا کا خط اینٹ تلے سے نکال کر مٹھی میں کیوں دبا لیا ۔ مجھے ایک نامعلوم سا ڈر محسوس ہو رہا تھا ۔ ایک گھٹن سی تھی جو میری رگ رگ میں سرایت کرتی جا رہی تھی میں نے بند کمرے میں اسے کھولا ۔ غیر از معمول صرف چند ایک فقرے لکھے ہوئے تھے ۔

"آپ کا یہ کالا کلوٹا دوست کون ہے ۔ خواہ مخواہ مجھے اشارے کرتا ہے ۔
کل اس نے مجھے سلام کیوں کیا؟ اسے منع کر دیجئے ۔"

میری نگاہوں تلے دھند لکا چھا گیا اور دل ڈوب گیا ۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اس کا مطلب کیا ہے ۔ کون ہے وہ کال کلوٹا ۔ سلام تو میں نے کیا تھا ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا ۔

اس گتھی کو سلجھنے کے لئے میں باہر نکل گیا اور دیر تک آوارہ پھرتا رہا ۔ حتّٰی کہ میں خود اس میں الجھ کر کھو گیا ۔

آہستہ آہستہ میرے شکوک تقویت پکڑتے گئے ۔ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ خطوط محبت کے جذبات سے دہکتے ہوئے خطوط نہیں ۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا لیکن پھر وہ کال کلوٹا ۔ ۔ وہ خوش نصیب گورا کون ہو سکتا ہے ۔ کون ہو سکتا ہے وہ ۔ کون ۔ ضرور وہ کوٹھے پر جاتا

ہوگا ۔ ضرور ۔

اس راز کو جانتے کے لئے میں نے فیصلہ کرلیا کہ ایک دن چھپ کر کوٹھے پر بیٹھا رہوں وہاں ایک چھوٹا سا کمرہ تو تھا ہی جو خالی پڑا تھا اور جہاں چھپ کر میں درزوں سے سب کچھ دیکھ سکتا تھا ۔

وہ رات میں نے جاگ کر گذاری پھر تین بجے کے قریب چپکے سے کوٹھے پر چڑھ کر میں اس کمرے میں جا بیٹھا اور طلوع آفتاب کا انتظار کرنے لگا ۔ سات بجے کے قریب نیچے سے آوازیں سنائی دیں ۔ کوئی جاگ چکا تھا اور میں چوکس ہو کر دروازے سے لگ کر بیٹھ گیا ۔ کوٹھے پر ویرانی چھائی ہوئی تھی اور اس مقام سے قطعی طور پر دکھائی نہ دیتا تھا کہ آیا مینا کے کمرے کا عقبی دروازہ کھلا ہے اور جالی کے سوراخ روشن ہیں یا نہیں ۔

پھر دبے پاؤں کسی کے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آئی ۔ سیڑھیوں میں ایک دھندلی سی شکل دکھائی دی ۔ کوئی اوپر آرہا تھا ۔ سیڑھیوں کے بالائی حصے میں وہ رک گیا عین اسی جگہ جہاں میں کھڑا ہوا کرتا تھا ۔

اس نے سگریٹ سلگایا ۔ دیا سلائی کی روشنی میں جمیل کی دبی دبی مسکراہٹ واضح ہوئی اس کی آنکھوں میں وہی بوندا باندی ہو رہی تھی ، پھروہ کھڑا ہو کر مسکرانے لگا ۔

ناگاہ میری نظر جالیوں کی طرف پڑی ۔ اس سوراخ سے ایک پتلی لمبی گلابی انگلی باہر نکلی ہوئی تھی ۔ اور یوں لہرا رہی تھی جیسے پاس بلا رہی ہو ۔ پھر مجھے معلوم نہیں کیوں گردوپیش پر ایک دھندلکا چھا گیا ۔ چاروں طرف سے ایک خلا نے مجھے گھیر لیا اور پھر بوند بوند گر کر دل میں غم کی ایک جھیل پھیلتی گئی ۔

تو میں ہی وہ کالا کلوٹا ہوں ۔ یہ خیال آتے ہی کلیجے پر سانپ لوٹ گیا ۔ لیکن پھر وہ خط ، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا اور آ بھی جاتا تو کیا ہوتا ۔ اب تو زندگی میں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی چاروں طرف ایک ویرانہ پھیلا ہوا تھا ۔ جس میں نہ تو امید کی کرن تھی اور نہ آرزو کی حرکت ۔

ان حالات میں لاہور رہنا بے کار تھا ۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ چند دنوں

کے لئے گھر چلا جاؤں لیکن جانے سے پہلے جمیل سے تمام واقعہ بیان کر دوں ۔

جمیل سے مختصر طور پر تمام واقعہ بیان کرنے کے بعد میں نے کہا ۔ ”جمیل مینا تمہاری ہے میری نہیں، مجھے افسوس ہے کہ غلطی فہمی کی وجہ سے میں نے اسے تم سے چھیننے کی کوشش کی ۔ یہ کہہ کر میں نے اس کے سامنے مینا کے تمام خطوط رکھ دئے ۔ جمیل حیرانی سے میری طرف دیکھ رہا تھا ۔ اس کی آنکھوں کی بوندا باندی نے کوئی اور ہی رنگ اختیار کر لیا تھا ۔ جیسے بوندیں بڑی ہوگئی ہوں اور ان کا تواتر ٹوٹتا جا رہا ہو اور ان میں دکھ کی جھلک پیدا ہوگئی ہو ۔ دفعتہً ایک بوند اس کے گال پر آکر گری اور اس نے منہ موڑ لیا اور میں وہ خطوط وہیں چھوڑ کر باہر چلا آیا اور سوٹ کیس اُٹھا کر بس کے اڈے کی طرف چل دیا ۔

بس جا رہی تھی ۔ ویرانے میں درخت سر جھکائے پیچھے سرکتے جا رہے تھے زرد کھیتوں میں پودوں نے سر جھکا رکھے تھے خوشوں کی مڑی ہوئی انگلیاں اشارے کر رہی تھیں ۔ جاؤ چلے جاؤ ۔ دور ، اور گدلے آسمان پر اداس دھند لکا چھایا ہوا تھا ۔

گاؤں میں درختوں کی چھاؤں میں چارپائی پر پڑے پڑے میری نگاہ پتوں کی طرف منعطف ہو جاتی ۔ سبز پتوں میں سوراخ سے روشن ہو جاتے اوئی اللہ ۔ دور، دور کوئی پرندہ چلاتا ۔ اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ۔ اور اندر گھر میں جا کر تھے سے کھیلنے کی کوشش کرنے لگتا ۔ باہر دادی اماں چلاتی ۔ ”اے ہے لڑکیو ۔ ابھی ہنڈیا نہیں چڑھائی تم نے اور مجھے محسوس ہوتا کہ ربڑ کی گڑیا چیخ رہی ہے ۔ پھر نگاہوں کے سامنے رنگین دھبے ناچنے لگتے ۔ اور میں گھبرا کر باہر نکل آتا ۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر جمیل کو مجھے بلانے کی کیا ضرورت پڑ گئی ۔ وہ جالیوں والا واقعہ تو ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا تھا ۔ اس کے بارے میں تو اب بات کرنا بے کار تھا ۔ وہ بات تو ہو ہی نہ سکتی تھی ۔ نہ جانے پھر کیا وجہ تھی ۔ بہر حال میں نے سوچا ، جانا ضرور چاہیے ورنہ جمیل کیا کہے گا اور جمیل کا قصور بھی تو کوئی نہیں ۔ اگر مینا جمیل سے محبت کرتی ہے تو اس میں جمیل کا کیا قصور ۔ جب جمیل ایورگرین پہنچا تو گھر میں بدھو کے سوا کوئی نہ تھا ۔ بدھو نے میری طرف دیکھا اور وہ پھوٹ کھلی ”ہی ہی ہی بابو جی آ گئے ۔“ میں

نے پوچھا ۔ "بدھو گھر میں کوئی نہیں ؟"
"جی ہاں کوئی بھی نہیں ۔" وہ بولا ۔
اتفاق سے میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا ۔ دروازے میں جمیل کھڑا مسکرا رہا تھا ۔
"ارے بدھو ! جمیل صاحب تو یہ رہے ۔"
"جی ہاں ۔" بدھو ہنسنے لگا ۔ "جمیل صاحب یہیں ہیں ۔"
"کیوں خیریت تو ہے ؟" میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے جمیل سے پوچھا ۔
"ہاں" جمیل نے کہا ۔ "میں جا رہا ہوں ۔" ساتھ ہی اس نے بدھو کو آواز دی ۔ "بدھو جا کر تانگا لے آؤ ۔"
"کہاں جا رہے ہو ؟"
"اماں نے بلایا ہے !"
"کب آؤ گے ؟"
"معلوم نہیں ۔ جب اماں اجازت دے گی ۔" اور کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے ۔
"آخر کیا بات ہے جس کے لئے مجھے بلایا ہے"۔
"بہت ضروری بات ہے۔ بے حد ضروری وہ مسکرانے لگا ۔ لیکن اس کی آنکھوں میں بہار نہیں بھادوں کا سا عالم تھا ۔
"بتاؤنا ۔" میں نے بیتابی سے پوچھا ۔
" ذرا ٹھہرو ۔" وہ بولا ۔ "بڑا اچھا کیا تم آ گئے بہت اچھا کیا ۔ مجھے معلوم تھا تم میری بات نہ ٹالو گے ۔"
اس کی آواز عجیب سنائی دے رہی تھی جیسے حلق میں کچھ پھنسا ہوا ہو ۔ اور اسکی مسکراہٹ میں مجبوری کی واضح جھلک تھی ۔
"تانگہ آگیا بابوجی ۔" بدھو چلّایا ۔
جمیل نے سوٹ کیس اُٹھا لیا ۔
"لیکن وہ بات ۔" میں نے بے تابانہ پوچھا ۔

"میرے ساتھ آؤ ۔" اس نے چاروں طرف حسرت بھری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ آجاؤ ۔۔۔۔"

تانگے میں بیٹھ کر اس نے جیب سے ایک لفافہ نکالا ۔ یہ لو اس میں سب کچھ تحریر ہے ۔ اور پھر آخری بار مسکرانے کی شدید کوشش کی ۔

تانگے کے روانہ ہونے کے بعد میں لاج کی طرف بھاگا اور کمرے میں داخل ہو کر اندر سے کنڈی بند کر کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کھولا اور جمیل کا وہ مختصر خط پڑھنے لگا ۔

"مینا تمہاری ہے، میری نہیں ۔ اسے تمہارے جذبات سے عشق ہے ۔ شکل وصورت کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی ۔

میں نے تمہارے جانے کے بعد صرف ایک خط اسے لکھا تھا اس کا جواب ملفوف ہے پڑھ لو ۔"

میں نے جلدی سے ملفوف خط نکالا ۔ لکھا تھا ۔

"آپ اس کالے کلوٹے کو منع کیوں نہیں کرتے یہ دیکھئے آج اس نے مجھے خط لکھنے کی جسارت کی ہے ۔ اس کی اتنی ہمت ۔ ایسا خط لکھتے ہوئے اسے شرم نہیں آئی ۔ جیسا اس کا رنگ ہے ۔ ایسے ہی اس کے خیالات ہیں ۔ آپ اسے منع کردیجئے ورنہ ۔۔۔۔۔۔"

میں نے پھر سے جمیل کا خط پڑھنا شروع کیا ۔

مینا تمہاری ہے ، میری نہیں ، میں جارہا ہوں ہمیشہ کے لئے ۔ مینا کے سب وہ خطوط جو تم مجھے دے گئے تھے، ملفوف ہیں ۔ خدا حافظ ۔"

"مینا میری ہے ۔" مجھے یقین نہ آتا تھا ۔ وہ ایک کالے کلوٹے کی کیسے ہو سکتی ہے ! نہیں وہ میری نہیں ۔ ان خیالات کے باوجود میں کوٹھے پر چڑھتا چلا گیا اور سیڑھیوں کے بالائی حصّے کے اندھیرے میں پہنچکر رک کر جالیوں کی طرف دیکھنے لگا ۔۔۔۔ ہائیں ! مینا کو بیٹھے دیکھ کر میں حیران رہ گیا ۔ اس کا چہرہ زرد تھا ۔ منہ ستا ہوا، بال پریشان تھے اور وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے

ہوئے اِدھر دیکھ رہی تھی ۔ جیسے کسی کے انتظار میں تباہ حال ہو ۔

نہ جانے شدت شوق سے یا آزمانے کے لئے میں سیڑھیوں کے اندھیرے سے نکل کر باہر دھوپ میں جا کھڑا ہوا ۔ دفعتاً اس کے چہرے پر غصے اور نفرت کے آثار بجلی کی طرح چمکے اور وہ اُٹھ کر باہر نکل گئی ۔

یہ دیکھ کر میں پھر سے سیڑھیوں کے اندھیرے میں جا کھڑا ہوا اور سوچنے لگا ۔ وہ میری نہیں ہو سکتی کبھی نہیں میرے اردگرد چھتوں دیواروں اور مکانوں کا وہی ویرانہ پھیلنے لگا ۔ وہی یاس وہی مردنی کتنا بدنصیب تھا میں، میں نے ہنسی کھیل میں اپنی زندگی تباہ کرلی تھی ۔

جمیل، میں اور ۔۔۔ دفعتاً مجھے خیال آیا ۔ ایک نیا خیال ۔ میرے ذہن میں تصویر کا ایک نیا رُخ اُبھرنے لگا ۔ ہم دونوں سے زیادہ تباہ حال مینا ہے ۔ جسے ایک شخص کی شکل و صورت اور دوسرے کے جذبات سے محبت ہے ۔ اور جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ دو الگ الگ اشخاص ہیں ۔

میری نگاہ جالی کی طرف منعطف ہو گئی ۔ مینا پھر وہیں عقبی دروازے کے پاس اسی طرح تباہ حال پریشان بیٹھی تھی پلکیں جھکی ہوئی نگاہیں کھوئی ہوئی جیسے مینا خالی ہو چکی ہو ۔" اے لڑکی تو یہاں کیا کر رہی ہے ۔" دفعتاً ربڑ کی گڑیا چیخنے لگی ۔ "نہ جانے کیا کرتی رہتی ہے ۔"

"اوئی اللہ میں کیا کروں ۔" مندر کا ناقوس یوں بجا جیسے ٹوٹ چکا ہو ۔

○ ــــ

احمق

"رفی" احمد نے مبہم آہ بھر کر کہا ۔ "بہت خاموش ہو تم ؟ ۔۔۔۔۔۔ ہے نا؟" احمد نے اسے اپنے قریب تر کھینچ لیا ۔ اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر جھولنے لگا ۔ "نہیں تو" وہ مسکرائی ۔ "دیکھو نا وہ اپنی ہی دھن میں بولتا گیا ۔ ۔ میں نے تمہیں کس قدر افسردہ بنا رکھا ہے ۔ یاد ہے جب میں پہلے روز تمہارے پاس آیا تھا ۔ "ہاں ۔ وہ بولی ۔ کتنی شوخی تھی تم میں ۔ دبی دبی شوخی اور اب جیسے ڈال جھک کر پھول کو سرنگوں کر دیتی ہے ۔ سمجھتی ہو نا ؟"

رفی نے نیم نگاہ سے اسے دیکھا اور اس کی مژگاں ڈھلک گئیں ۔

"لیکن فکر نہ کرو ۔ اب تو قصہ ختم ہوگیا ۔ آج میرا آخری دن ہے ۔ کل میں چلا جاؤں گا اور تم وہی رفعت بائی بن جاؤ گی ۔ وہی ریشمی جوڑا وہی گھنگھرو وہی "اکیلی ڈرلاگے" فکر نہ کرو ۔"

احمد نے آہ بھری ۔

رفی نے اس کی طرف ایک نظر دیکھا ۔

کاش ! میرے پاس روپیہ ہوتا ۔ صرف پانچ سو اور ایک مہینہ اور صرف ایک مہینہ ۔

رفی نے گھبرا کر آنکھیں اٹھائیں اس کے انداز سے عجیب سی گھبراہٹ ہویدا تھی پھر وہ صندوق پر پڑے ہوئے سبز رومال کی طرف دیکھنے لگی ۔ جس میں کوئی چیز لپٹی ہوئی تھی ۔

"لیکن بے کار ہے ۔ ایک مہینہ اور بھی کیا ۔ اس سے تو بہتر ہے کہ پانچ سو کا بالائی کا برف کھا لوں ۔ کھا کھا کر یخ بستہ ہو جاؤں جیسے برف کا ڈلا ۔ بے حس و حرکت ڈلا ۔ جیسے تم ہو ۔ تم"

"میں" ۔ وہ مسکرائی ۔

"جیسے ناچنے والیاں ہوتی ہیں ۔ نہیں ہوتیں کیا؟"

اس نے مسکرا کر آنکھیں جھکالیں ۔ "شاید " اور وہ اُٹھ کھڑی ہوئی ۔

ہائیں ۔ اس نے حیرانی سے رفی کی طرف دیکھا ۔ "کہاں چل دی؟"

"ابھی آئی" وہ رومال اٹھاتے ہوئے بولی اور باہر نکل گئی ۔

"ہوں ۔" احمد نے جھرجھری لی ۔ اور اپنے خیالات میں غرق ہوگیا ۔

احمد کو تو آپ نے دیکھا ہی ہو گا ۔ صبح کو سیکرٹریٹ کو جاتے ہوئے یا پانچ بجے کے قریب وہاں سے لوٹتے ہوئے یا شام کے وقت کسی ہوٹل کے کسی ایک کونے میں چائے کے پیالے کو گھورتے ہوئے یا دیوار کے پار دیکھنے میں کھوئے ہوئے دفتر سے نکلتے وقت بھی اس کا انداز عام کلرکوں سے قطعی مختلف ہوتا ہے ۔ چپ چاپ ۔ اکیلا ۔ چھاتی ابھارے ۔ گردوپیش کو گھورتے ہوئے وہ کھوئے ہوئے انداز سے چلے جاتا ہے ۔

وہ تو محض اتفاق کی بات تھی کہ ایک مختصر سا مکان اس محلے کے قریب اسے الاٹ ہوگیا تھا جہاں رقاصائیں رہتی تھیں ۔ ورنہ وہ تو شاید کبھی بھی اس کوچے کی طرف نہ جاتا ۔ اگر رفعت بائی کا مکان اس کی راہ میں نہ پڑتا تو وہ کبھی رفعت سے روشناس بھی نہ ہوتا یا اگر رفعت عام رقاصہ ہوتی تو بھی اسے رفعت سے ملنے کا خیال نہ آتا ۔ مگر رفعت تو رقاصہ دکھائی ہی نہ دیتی تھی ۔ رقص کا لباس پہننے اور ساز کے ساتھ گانے کے باوجود اس کے چہرے کے خطوط میں احمد کو غم کی مبہم سی جھلک محسوس ہوتی ۔ اس کی مسکراہٹ بھیگی بھیگی دکھائی دیتی ۔ قریب ہونے کے باوجود وہ دور نہ جانے کہاں کھوئی نظر آتی ۔

رفعت بائی کا مکان اگر محلے کے وسط میں ہوتا یا اس کوچے کی بڑی گلی کی طرف ہوتا ۔ جہاں لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے ۔ تب بھی احمد وہاں جانے کی جرأت نہ کرتا ۔ مگر وہ مکان بھی تو گویا رفی کی طرح چپ چاپ خاموش اور کھویا کھویا سا تھا ۔ محلے سے دور تماش بینوں کی نگاہوں سے دُور ۔ ان کے قہقہوں سے دور ۔

اسی وجہ سے یا شاید اسے احمد کے شدید احساسِ تنہائی سے بھی تعلق ہو ۔ ایک روز وہ آن جانے میں ادھر مڑگیا ۔ اور دروازے پر جاکر پریشان ہوکر رک

گیا۔

"آئیے" رفی نے کھڑکی سے سر نکال کر کہا۔ اندر تشریف لائیں۔"

"نہیں نہیں۔" وہ بڑبڑانے لگا۔ میرا مطلب ہے ۔۔۔۔"

"بات تو سنئے۔" وہ یوں بولی جیسے گھنگھرو بج رہے ہوں۔

وہ رک گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں وہ باہر آگئی۔ "آئیے نا"۔ وہ بولی۔ اور وہ دونوں اندر چلے گئے۔

"بسم اللہ" اندر میراثی اُسے دیکھ کر بڑبڑایا۔ گانا سنئے گا۔ اور وہ سارنگی بجانے لگا۔

"نہیں نہیں۔" وہ زیر لب بولا۔ "میں تو وہ" اس نے بے کسی سے رفی کی طرف دیکھا۔

"آپ ٹھہریں گے کیا" وہ بولی۔

احمد نے کونے میں بیٹھے ہوئے میراثیوں کی طرف دیکھا۔

"آئیے اوپر چلیں۔" اور وہ اسے کوٹھے پر لے گئی۔

کچھ دیر تک تو وہ اس کی باتیں سنتی رہی۔ عجیب باتیں تھیں اس کی جن سے وہ بالکل واقف نہ تھی۔ رفی کے ہونٹوں میں تمسخر انگیز مسکراہٹ دبی ہوئی تھی۔ اس کی متبسم آنکھیں گویا رقص کر رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ اشارے کر رہے تھے۔ مگر وہ ان باتوں سے بے خبر اس کی کمر میں ہاتھ دیئے باتیں کئے جارہا تھا۔ اور اس کے ساتھ چارپائی پر بیٹھے جھول رہا تھا۔ جیسے سکول سے بھاگا ہوا بچہ ہو۔

"لیکن آپ تو ٹھہرنے کے لئے آئے ہیں نا۔" وہ اکتا کر بولی۔

"ہاں" وہ مسکرایا۔ "ٹھہرا ہوا تو ہوں۔ یہ جھولنا پسند نہیں آپ کو تو نہ سہی۔" اس نے جھولنا بند کر کے پلنگ سے لٹکتی ٹانگوں کو جھلانا شروع کر دیا۔

"لیکن آپ تو یہ باتیں کر رہے ہیں۔" اس نے طنزیہ انداز سے کہا۔

"ہاں ہاں مجھے تو آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔" مثلاً آپ کی مسکراہٹ بھیگی بھیگی سی کیوں ہوتی ہے۔ آپ کے رقص میں غم کی لہریں کیوں ہیں۔ آپ کے ہونٹوں میں کراہ سی کیوں دبی رہتی ہے۔"

دفعتاً رفی کی آنکھیں ساکن ہوگئیں "توکیا" اس نے چتون چڑھا کر کہا۔ آپ رات بھر ٹھہریں گے۔"

"توکیا ابھی چلا جاؤں۔" وہ بولا۔

"چالیس روپیہ ہوں گے۔" وہ بے رُخی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"اوہ۔" وہ بولا۔ "ٹھیک تو ہے۔ تمہارے لئے تو میں چالیس روپے کی تھیلی ہوں۔ اور بس۔"

وہ تڑپ کر مڑی۔ اُس نے یہ بات اس سے پہلے کبھی نہ سنی تھی۔ لیکن وہ نوٹ گننے میں مصروف تھا۔ تیس چالیس۔ اس نے چار نوٹ میز پر پھینک دئے۔

وہ پھر اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

"میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ تم رقاصہ ہو؟" اس نے ہنسنے کی کوشش کی۔ "کیا بے وقوف ہوں میں۔"

"اب چھوڑیئے بھی" رفی نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیئے۔

"لیکن میں بھی کیا کروں۔ تم رقاصہ دکھتی بھی تو نہیں جیسے رقص کے آسمان پر چاندنی میں ایک بادل کھویا ہوا تیر رہا ہو۔"

وہ اسی طرح چارپائی تلے پاؤں لٹکائے، رفی کی کمر میں ہاتھ دیئے جھولتا ہوا باتیں کرتا رہا۔ باتیں کرتا رہا۔ وہ ہنستی رہی۔ اس کے ساتھ سمٹی ہوئی چپکے بیٹھی سنتی رہی۔ اس کے لئے یہ ایک عجیب تجربہ تھا پہلے تو وہ اکتا گئی تھی۔ لیکن پھر اس مسلسل پیار بھری گرفت نے نہ جانے اسے کیا کردیا۔ یہ تسلسل اس کے لئے ایک انوکھی چیز تھی۔ وہ تو صرف شدید جذبے سے واقف تھی۔ شدید لمس اور بے رُخی۔ اس کے لئے یہ تسلسل بھری مٹھاس انوکھی تھی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کی زندگی کے بکھرے ہوئے پھول ایک دھاگے میں پروئے جارہے ہوں جیسے اندھیرے اور اجالے کے دھبے مل کر ایک روپہلی سحر کی تعمیر کررہے ہوں۔ اس نے حیرانی سے اس خبطی کی طرف دیکھا۔ جو اسے پہلو سے بھینچے رکھنے کے باوجود دُور نہ جانے کہاں کھویا ہوا تھا۔

"یہ خوشبو بہت تیز ہے۔ یہ تمہارے جسم سے ہم آہنگ نہیں اور یہ

سرخی اونہوں اسے تمہارا جزو بدن ہونا چاہیے ۔ یہ انداز تمہاری طبیعت سے ہم رنگ نہیں ہے ۔ "اور یہ"

رفی نے جمائی لی ۔ ہمیں نیند آتی ہے ۔" وہ بولی ۔

" تو سو جاؤ" احمد نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا ۔ "تمہارے جسم میں رقص ہے ۔ لیکن" وہ اسے تھپکتے ہوئے بولا ۔ "تم نے اسے اپنے اعضا میں منجمد کر رکھا ہے ۔ تمہارے انداز میں رقص نہیں، روانی نہیں ، جیسے تم نے اسے زبردستی روک رکھا ہو ۔"

جب وہ جاگی تو اس نے دیکھا کہ وہ چارپائی پر اکیلی پڑی ہے ۔ وہ اٹھ بیٹھی ۔ معاً اسے یاد آیا ۔ ہاں وہ آیا تھا ۔ وہ اسے جُھلا رہا تھا ۔ تمہارے جسم میں رقص ہے ۔ یہ سرخی اونہوہ ۔

جب اسے معلوم ہوا کہ احمد جا چکا ہے تو اسے ہلکا سا صدمہ ہوا ۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا ۔ ہائیں صرف ساڑھے بارہ ۔ مایوسی میں وہ یوں لیٹ گئی گویا کسی نے اس کے جسم کے ہار سے تاگا کھینچ لیا ہو ۔ اور پُھول یہاں وہاں بکھر گئے ہوں ۔

اگلے دن جب وہ ہونٹوں پر سرخی لگا رہی تھی ۔ کسی نے چپکے سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا رفی یہ تمہارے جزو بدن نہیں ہوگی ۔ وہ رک گئی اور لپ سٹک میز پر رکھ دی ۔

رات کو جب وہ پلنگ پر بیٹھی تو یوں جھولنے لگی جیسے کوئی اسے جھلا رہا ہو ۔ میز پر بکھرے ہوئے پھولوں کو وہ انجانے میں دائرے میں چننے لگی ۔ پھر آپ ہی آپ ہنس پڑی ۔

آپ کی مسکراہٹ بھیگی بھیگی سی ہے ۔

وہ لیٹ گئی ۔ سرہانہ کھسک کر اس کی بغل میں پھسل گیا ۔ اُس نے اپنا منہ سرہانے میں گاڑ دیا ۔ کوئی اسے تھپکنے لگا ۔

پھر ایک شام کے جھٹپٹے میں جب وہ کھڑکی میں کھڑی اردگرد پھیلے ہوئے مکانوں کو دیکھ رہی تھی ۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک دوسرے سے دور تھے بہت دور ۔

"رفی ۔" اندھیرے میں سے اس کی آواز سن کر وہ چونک پڑی ۔
پچھلے چند ایک دنوں میں اُس نے وہ آواز کئی مرتبہ سنی تھی ۔ وہ گھبرا گئی ۔ کیا وہ آواز اس کے ذہن پر اس قدر مسلّط ہوچکی تھی ۔ اَن جانے میں اس نے ہونٹ نکال کر انہیں دیکھنے کی کوشش کی ۔ نہیں آج اس نے سرخی تو نہ لگائی تھی ۔

رفی ۔ سایہ اس کے قریب آگیا ۔

اسے دیکھ کر وہ مسکرا دی "آئیے آئیے" وہ بولی ۔

"میں سوچ رہا تھا اگر کوئی آپ کے ساتھ ایک مہینہ ٹھہرنا چاہے تو ۔"

"ایک مہینہ" رفی کے ماتھے پر پسینہ آگیا ۔

"کیوں اس میں کیا برائی ہے" ۔ احمد نے پوچھا ۔

"آپ اندر آئیے نا" وہ بولی ۔

"میرے پاس صرف پانچسو روپیہ ہے ۔ صرف پانچسو ۔"

"اندر تو آئیے آپ ۔"

"بسم اللہ ۔ بسم اللہ ۔" میراثی پانچسو کا نام سن کر چلانے لگا ۔

نہ جانے کیوں رفی کے دل پر ٹھیس لگی ۔ آپ آئیں بھی تو وہ بولی لیکن وہاں کوئی بھی نہ تھا ۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کھڑکی سے کود کر اُسے ڈھونڈے ۔ مگر وہ چپ چاپ کھڑی رہی حتیٰ کہ بتیاں روشن ہوگئیں ۔ اور بڑے کوچے سے قہقہوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں پھر دفعتاً اس کا سرچکرانے لگا ۔ اور وہ سر درد کا بہانہ بنا کر اوپر چلی گئی ۔

"مجھے بے حد افسوس ہے ۔" پاس ہی کوئی بڑبڑایا ۔ احمد کی آواز سن کر وہ چونک کر اٹھ بیٹھی ۔

"آپ ہیں ۔"

"نہیں نہیں آپ آرام کیجئے ۔ میں پھر آجاؤں گا ۔"

"آئیے نا ۔" اس نے لپک کر احمد کا ہاتھ پکڑ لیا ۔

"اچھا"۔ وہ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا ۔ اور پھر جیب سے نوٹ نکال کر چارپائی پر رکھتے ہوئے کہنے لگا ۔ "صرف پانچسو ہیں ۔ بس یہی ہیں ۔ صرف ایک

مہینہ۔"

اور آج اس کا آخری دن تھا۔

سارا مہینہ اس نے رفی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر جھولنے میں بسر کر دیا تھا۔ وہ اس کے بازو سے کپڑا سرکا کر اسے چھوتا۔ کتنا ملائم اور کس قدر شفاف۔ خون کی جھلک صاف نظر آرہی ہے۔ اور گوشت کس قدر جاندار ہے کتنی گرفت ہے اس میں"۔ وہ مسلسل باتیں کرتا رہا تھا۔ رفی کی باتیں اپنی باتیں زندگی خوشی اور غم کی باتیں۔ شاید رفی اس کی بے تکی باتوں سے اکتا جاتی۔ لیکن اس کا بازو رفی کو کمر سے تھامے ہوئے اسے اپنے پہلو سے چمٹائے رکھتا۔ یا اس کے سر کو اپنے شانے پر رکھ کر اس کا گال تھپکتا رہتا۔ "سمجھتی ہو رفی" ۔۔۔۔ وہ اس کے بالوں کو تھپکتے ہوئے پوچھتا۔ "لیکن تم کیسے سمجھ سکتی ہو۔ کیسے سمجھ سکتی ہو۔ یہ زندگی بھرا جسم۔ تم اس کی گرفت میں ہو۔ تمہیں کیا پڑی کہ سمجھو۔ سمجھنے کی لذت سے جینے کی لذت کہیں زیادہ ہے۔"

یونہی اس نے ایک مہینہ بسر کردیا تھا۔ اور آج اس کا آخری دن تھا۔

"رفی" وہ چلایا۔ "کہاں چلی گئی ہو۔"

"آگئی میں۔" رفی چائے کا ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی۔

"چائے؟"

"وقت ہو گیا ہے نا۔"

"اوہ"۔ وہ ہنسا "تم نے میری عادتیں بگاڑ دی ہیں۔ بیٹھو یہاں مجھے پریشان کرنے کے لئے تم میری عادتیں بگاڑ رہی ہو۔" احمد نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ "یہ چائے ہے۔ اب کھانا ہے یہ مخملی جسم ہے۔ یہ مخروطی ابھار ہیں۔ یہ سب میری عادتیں بگاڑنے کے سلمان ہیں۔ تمہیں معلوم نہیں۔" وہ ہنسنے لگا۔ "تمہیں معلوم نہیں اور، اور تمہارے پاس ٹھہرنے کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی۔ اسی لئے میں یہاں آیا تھا۔ اور وہی بات میں نے تم سے آج تک نہیں کی۔ کوئی انتہا ہے حماقت کی ۔۔۔۔۔۔ جانتی ہو وہ کیا بات ہے۔" اس نے آہ بھری" آج تک مجھ سے کسی نے محبت نہیں کی کسی نے بھی نہیں۔ مجھ میں وہ بات نہیں جو لڑکیوں کو مائل کرتی

ہے ۔ وہ جو ہر نہیں ۔ وہ چمک نہیں ۔ اسے جو چاہو کہہ لو ۔ وہ مجھ میں نہیں ۔ میری خالہ زاد تھی ۔ اگرچہ وہ کچھ بھی نہیں تھی ۔ اس میں کوئی بات ہی نہ تھی ۔ سارا دن چوکی پر بیٹھ کر سویٹر بننے میں لگی رہتی تھی ۔ اور میں پاس چلا جاتا تو بالکل ہی نگاہیں سویٹر میں گاڑلیتی کمبخت کو سر اٹھانا بھی گوارا نہ تھا ۔ ایک دن میں نے اسے کہہ دیا ۔ میں نے کہا ۔ ثریا تمہارا جسم کس قدر خوبصورت ہے ۔ جیسے بیر بہوٹیاں رینگ رہی ہوں ۔ وہ سمٹ گئی ۔ اور پھر گھور کر میری طرف دیکھا ۔ جیسے میں نے نہ جانے کتنا بڑا گناہ کر دیا تھا ۔ اس کے بعد وہ میرے پاس کبھی نہیں بیٹھی کبھی نہیں ۔ اور پھر سعید آگیا ۔ سعید میرا ماموں زاد ہے ۔ اور دو ہی دن میں نہ جانے اُس نے کیا کردیا ۔ کہ وہ دونوں الگ بیٹھ کر سرگوشیاں کرنے لگے ۔ نہ جانے سعید میں کیا ہے ۔ اسے لڑکیوں کو راغب کرلینے میں کمال حاصل ہے ۔ اس میں وہ چیز ہے جس سے میں بالکل محروم ہوں ۔ اگرچہ دیکھنے میں اس کی شکل بے حد عامیانہ ہے بے حد عامیانہ کبھی تو گھن آتی ہے ۔ اسے دیکھ کر ۔

پھر وہ کالج میں مس اختر تھی ۔ اسے تو مجھ سے چڑ تھی جانے کیوں میں نے کئی ایک مرتبہ اسے غور سے دیکھا تھا ۔ اس پر وہ بہت بپھرتی ۔ غصے سے اس کا منہ لال ہو جاتا ۔ پھر وہ نفرت سے منہ موڑ لیتی ۔ آخری دنوں میں تو اس نے میری طرف دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا ۔ کسی دوسرے لڑکے سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے نیچی نظر سے میری طرف دیکھتی ۔ جیسے مجھے جلانے کی کوشش کر رہی ہو ۔" وہ ہنسنے لگا ۔

"عجیب ہوتی ہیں یہ لڑکیاں ۔ نفرت جتانے میں کس قدر تیز ہوتی ہیں ۔" اس نے آہ بھری ۔

"لیکن تم ان باتوں کو کیسے سمجھ سکتی ہو ۔ تمہیں کیا معلوم ۔"

"کیوں" اس نے نیچی نگاہ سے اسے دیکھا ۔

"تمہارے لئے تو ہر مرد بٹوے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ۔"

"اچھا ۔" رفی کی آواز مدھم پڑ گئی ۔

"مجھے تو محبت بھرا لمس چاہئے جذباتی لمس ۔ ذہنی لمس ۔ جسمانی لمس ۔"

"اچھا ۔" وہ اس کے قریب تر ہوگئی۔

"لیکن مجھ میں وہ بات نہیں ۔ جس سے لڑکیاں متاثر ہوتی ہیں ۔" وہ خاموش ہوگیا ۔

"اور" دفعتاً وہ بولا ۔ "بہت تنگ جگہ ہے ۔ تمہارے لئے" وہ پیچھے سرکتے ہوئے کہنے لگا ۔ ادھر سرک لو۔ اور ادھر اطمینان سے بیٹھ کر میری کتھا سنو ۔ بڑی لمبی کتھا ہے ۔۔۔۔۔۔ اچھا رفی پہلے یہ بتاؤ بات کیا ہوتی ہے جو لڑکیوں کو متاثر کرتی ہے ۔ میرا مطلب ہے مرد میں ۔۔۔"

وہ بے پروائی سے سبز رومال کی طرف دیکھنے لگی ۔

"بڑی بے پروائی سے بیٹھی ہو ۔ وہ گنگنایا ۔ ہاں تمہیں ان باتوں میں کیا دل چسپی ہو سکتی ہے۔"

"ہاں مجھے کیا رفی کی آواز میں تلخی تھی ۔۔

"جو خوشی بیچے اسے غم سے کیا تعلق ۔ اور جو غم سے آشنا نہیں ۔ اسے خوشی سے کیا واسطہ" وہ خاموش ہوگیا ۔

وہ چمچے سے کھیلنے میں مصروف ہوگئی ۔

"رفی" وہ بولا ۔ "اس دھندے میں پڑ کر نسائیت کیوں ختم ہو جاتی ہے ۔"

رفی نے آن جانے میں پلنگ سے لٹکتے ہوئے ہار کا تاگا توڑ دیا ۔ اور گرتے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر ہنسنے لگی ۔

"ہنستی کیوں ہو" اس نے رفی کو قریب تر کھینچتے ہوئے کہا ۔

"اور کیا روؤں ۔ رفی نے مسکرا کر کہا ۔

"رفی کیا تم رو سکتی ہو ۔"

رفی نے نگاہ بھر کر اس کیطرف دیکھا اور نفی میں سر ہلادیا ۔ اور پھر دوسری طرف منہ موڑ لیا ۔

"بہت کم لوگ رو سکتے ہیں ۔ بہت کم لوگ ۔"

"آپ ؟" رفی کی نگاہ میں نفرت کی ہلکی سی جھلک تھی ۔

"میں" ۔ ایک ساعت کے لئے وہ سوچ میں پڑ گیا ۔

"شکر ہے میں رو نہیں سکتا ۔ ورنہ ۔۔۔۔۔"

"ہاں"۔ اس نے لمبی آہ بھری ۔

"ہے نا ۔" احمد چمکا ۔

رفی نے اثبات میں سر ہلا دیا ۔

"شکر ہے تم اتنا تو سمجھتی ہو ۔ لیکن اس میں تمہارا کیا قصور۔ ماحول ۔ شور مچاتا ہوا طبلہ ، چیختی ہوئی سارنگی اور "مانڈے ڈیرے آجا۔" بلاتی ہوئی آنکھیں ۔ دیا بجھانے والا پلو ۔ اس کے بعد گھپ اندھیرا تو ہونا ہی ہوا ۔ وہ خاموش ہو گیا ۔ اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر جھولنے لگا ۔

"عجیب بات ہے ۔" وہ آپ ہی بڑبڑانے لگا ۔ "اس کے باوجود میرا جی چاہتا ہے کہ میرے پاس پانچسو اور ہو ۔"

رفی بے تابی سے سبز رومال کو گھورنے لگی ۔ جس میں نہ جانے کیا لپٹا ہوا تھا ۔

"حماقت" وہ ہنسا ۔

"اور کیا"۔ وہ مسکرانے لگی ۔ حماقتیں تمہیں پیاری ہوں گی ۔ وہ روپے کا روپ دھار لیتی ہیں نا ۔"

"اوہ" وہ اٹھ بیٹھی اور سبز رومال کو اٹھا کر اس سے کھیلنے لگی ۔

میں نے کہا۔ بائی ۔ باہر سے میراثی کی آواز آئی ۔

"کون ہے" رفی نے پوچھا ۔

"میں نے کہا" میراثی اندر داخل ہوتے ہوئے بولا ۔ "سیٹھ صاحب آئے ہیں ۔ دو گیت سننے کے لئے کہتے ہیں وہ" میں نے تو کہا تھا پر وہ تکرار کئے جا رہے ہیں ۔ اگر آپ اجازت دے دیں تو ۔ وہ رک گیا ۔ اوہ رفی چونک کر بولی ۔ اور پھر احمد کی طرف دیکھ کر کہنے لگی ۔ طبیعت اچھی نہیں ۔"

اوہ ۔ احمد اٹھ بیٹھا ۔ "میری طبیعت کی فکر نہ کرو ۔ میں اچھا بھلا ہوں ۔ ہمیشہ یہاں رہتا تو نہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔"

"نہیں نہیں ۔" وہ چلائی

"ٹھیک ہے ۔" وہ ہنسا کیسے ممکن ہے ہمیشہ یہاں رہنا پھر پانچسو

روپیہ ۔

"اوہ ۔" رفی نے وہ سبز رومال احمد کی طرف بڑھا دیا ۔ میری طرف سے" وہ رک گئی جیسے کوئی جرم کر رہی ہو ۔

"ہوں ۔ وہ ہنسا یہ نشانی ہے ۔ تاکہ پھر آنے پر اکسائے ۔ پانچسو جمع کرنے پر مائل کرے ۔"

رفی نے رومال پلنگ پر پھینک دیا ۔ اور کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔

"اچھا میں جاتا ہوں ۔" احمد نے آہ بھری ۔

"مگر ۔۔۔۔" وہ رک گئی ۔

"ایک دن اور رہ لوں تو بھی کیا ۔ کاش تم سمجھ سکتیں ۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسی "میرے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے " وہ پھر ہنسنے لگی ۔

"ہاں ہاں ہنسو "۔ وہ مسکرایا ۔ "ہنسنے سے ہی تو ہوتا ہے نا ۔" اور وہ سیڑھیاں اترنے لگا ۔

اندھیری گلی میں چلتے ہوئے احمد کو دور سے ساز کی آواز سنائی دی ۔ اور پھر کوئی چیخ چیخ کر گانے لگی ۔ "ہنستے ہنستے جینا"۔ وہ مسکرایا ۔ " اور میں محبت خریدنے گیا تھا ۔ احمق !"

○

موقعہ

قاسم اور شہزاد پہلے دو روز تو جام کے منظر کی دلفریبی میں کھوئے رہے ۔ قاسم بے اختیار کھڑکی سے سر نکال کر دیکھتا ۔ اُف یہ سبز بلوری جام !! ضدی! ذرا دیکھو تو جھیل کا پانی آبِ حیات کی طرح چمک رہا ہے ۔ آؤ نا ضدی ۔ وہ دیکھو ۔ چاروں طرف ٹیلوں پر دیوار کے اونچے ، لمبے درخت یوں استادہ ہیں جیسے آب حیات کی حفاظت کے لئے دیو چوکیدار کھڑے ہیں ۔ اُف! ــــــ کیوں ضدی !؟" ـــــ وہ شہزاد کے شانے جھنجھوڑ کر اضطراب سے پوچھتا ۔"ہاں" وہ مسکرا کر خاموش ہو جاتی ۔ اس کی مسکراہٹ میں آنسوؤں کی نمی جھلکتی ۔ اور ۔ وہ ـ۔ وہ دیکھو جھیل کے کنارے پر چینی ساخت کا چھوٹا سا محل دیکھ رہی ہو نا ؟" "ہاں" وہ سرسری نظر ڈال کر پھر اپنی جگہ پر سرک جاتی ۔ اور قاسم اپنی ہی دُھن میں کہے جاتا ۔ "جیسے دیوتاؤں نے زندگی کی دوشیزہ کو لا کر محل میں قید کر رکھا ہو ۔" جذبات کی شدت سے مضطرب ہوکر وہ دیوانہ وار کمرے میں گھومنا شروع کر دیتا ۔ جیسے وہ مختصر سا کمرا ایک لق و دق صحرا ہو ۔ "اب میں کیا کروں! اب میں کیا کروں !!" وہ بڑبڑاتا ۔ اور بالآخر دروازے سے باہر نکل کر پھر سے منظر کو دیکھ کر چلانے لگتا ۔ اف ! یہ سبز پیالہ ۔ رنگ بھرا پیالہ ، ضدی ضدی !! "وہ شہزاد کو پیار سے ضدی کہا کرتا تھا ۔" ضدی کیا بن رہی ہو تم ۔ فضول ۔ اٹھو بھی نا !!"

انہیں جام آئے ہوئے ابھی صرف دو دن ہوئے تھے ۔

ڈلہوزی سے جام کی طرف آتے ہوئے اس گھبرائی ہوئی ، کھوئی ہوئی ڈنڈی پر چلتے چلتے سرسبز مگر سنسان ٹیلوں تلے تنگ گھاٹیوں کو رینگتے دیکھ کر ڈھکے چھپے کوہستانی چشموں کی مسلسل کراہ سن سن کر ان ٹیڑھی ، بل کھاتی ہوئی چٹانوں کو دیکھ دیکھ کر جو پہاڑی سے شاخوں کی طرح پھوٹ کر اِدھر اُدھر نکل جاتی تھیں ۔

اور جن کے پیچ و خم میں نگاہ مقید ہو کر رہ جاتی تھی، قاسم اور شہزاد پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی تھی ۔ ایک بے نام اضطراب ایک غم زدہ مسرت ، ایک تکلیف دہ ہیجان ۔

شہزاد پالکی میں بے حد مضطرب تھی ۔ گھبرا کر چاروں طرف دیکھتی ۔ پھر سہم کر اپنا سر ٹیک دیتی اور ان قلیوں کو گھورنے لگتی جو پالکی اٹھائے جا رہے تھے ۔ اُن کی رفتار میں پُراسرار روانی تھی ۔ چہرے خیال یا جذبے کی چمک سے کورے تھے ۔ منہ کی کرختگی اور جھریوں کو دیکھ کر ایسے محسوس ہوتا جیسے انہیں زندگی سے دور کا تعلق بھی نہ ہو ۔ جیسے وہ کوئی غول بیابانی ہوں ۔ انہیں دیکھ کر خواہ مخواہ شہزاد کے دل میں خیال پیدا ہوتا کہ وہ مر چکی ہے اور وہ عجیب و غریب شکلیں اسے اٹھائے نہ جانے کہاں لئے جا رہی ہیں ۔ زمان ومکان سے دور ۔ حیات وممات سے دور ۔ اس خیال پر وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھتی اور کسی اور طرف دیکھنے لگتی ۔

سامنے عجیب و غریب پودوں سے ڈھکے ہوئے ٹیلوں پر پگڈنڈیاں ہونک ہونک کر چڑھے جا رہی تھی ۔ اونچے لمبے درختوں تلے پُر اسرار سائے دبکے بیٹھے دکھائی دے رہے تھے ۔ دوسری طرف بے پناہ گہرائیاں محسوس کر کے اس کے دل میں ہول سے اٹھتے ۔ دل دھک دھک کرنے لگتا ۔ اور ہتھیلیوں میں وہی پرانی سرسراہٹ محسوس ہونے لگتی ۔ ہتھیلی کو ہاتھ سے دباتے ہوئے وہ چوری چوری قاسم کی طرف دیکھتی اور ہاتھوں کو چھپائے رکھنے کی کوشش میں لگ جاتی ۔ قاسم اپنے خیال میں مگن چلا جا رہا تھا ۔ وہ محسوس کر رہا تھا ۔ جیسے وہ بے ڈھب اور ویران پہاڑیوں کے چکر میں پھنس گیا ہو ۔

دفعتاً ڈنڈی نے چکر کھایا ۔ اور وہ پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچے ۔ "ہائیں !!" فرطِ حیرت سے قاسم کے منہ سے چیخ نکل گئی ۔ چوٹی کی وسیع پیالہ نما کوکھ پر مخملی گھاس کا فرش بچھا ہوا تھا ۔ جس کے عین درمیان میں ایک چھوٹی سی جھیل کا نقرئی پانی یوں چمک رہا تھا جیسے وہاں سے سورج طلوع ہونے والا ہو ۔ جھیل کے اردگرد چاروں طرف سبز پیالے کی دیواروں پر دیودار نشے سے سرشار گویا جھوم ناچ رہے تھے ۔ "ضدی" قاسم چلایا "ضدی" وہ ۔ وہ دیکھو ۔ ادھر !! اف !!!"

جام کو دیکھ کر وہ اچنبھے کے عالم میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا تھا ۔ اُسے بھول گیا تھا ۔ کہ وہ سات بہنوں کا واحد بھائی ہے ۔ اور اس کے والد نو افراد کی کفالت کا بوجھ اس کے کندھوں پر ڈال کر راہیٔ ملک عدم ہو چکے ہیں ۔ وہ بھول گیا تھا کہ اس کی بڑی بہنوں اور ماں کو دل کا روگ لگا ہوا ہے اور وہ شہزاد کو وہاں تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے لایا ہے تاکہ چیلوں اور دیوداروں کے پتوں میں چھنی ہوئی ہوا اسکے دل کو تقویت پہنچائے ۔ تاکہ کہیں شہزاد بھی زبیدہ اور ثریا کیطرح دائم المریض نہ ہو جائے ۔ وہ بھول گیا کہ اس کی پیاری بہن شہزاد مریضہ ہے ۔

شہزاد کو مریضہ سمجھنا ، ایسا ہی ناممکن تھا جیسے سورج کو داغدار سمجھنا ۔ اگر آپ شہزاد کو دیکھ پاتے تو چلتے چلتے رک جاتے ۔ ایک ساعت کے لئے قطعی بھول جاتے کہ آپ کہاں جارہے ہیں ۔ یا ۔۔۔۔۔ لیکن شہزاد کو دیکھ کر راہ چلتے چلتے رک جانے کا سوال تو پیدا ہی نہیں ہوتا تھا ۔ کیونکہ وہ ایسے خاندان کا چشم و چراغ ہے ۔ جس کے افراد عورتوں کے بازار میں چلنے پھرنے کو باعث ننگ سمجھتے ہیں ۔ شاذونادر کہیں باہر نکلنا بھی ہوتا ۔ تو برقعے میں لپٹ لپٹا کر اور برقع بھی جو خیمہ نما ہونے کے علاوہ جسم کو مکمل طور پر ڈھانپ لیتا ہے ۔ اس کے خم و پیچ کو واضح نہیں کرتا ۔ پہاڑوں کے اس ویرانے میں بھی شہزاد کو یہ نہ سوجھا تھا کہ یہاں برقعہ اٹھا کر چلنے کا امکان ہے ۔ برقعہ اٹھانا تو الگ رہا ۔ اسے تو کوئی ایسی حرکت بھی گوارا نہ تھی جو آنے جانے والوں کے لئے جاذب توجہ ہوتی ۔ ایسی صورت میں اگر آپ اسے سڑک کے کسی کنارے پر چلتے ہوئے دیکھ پاتے تو ایک نگاہ غلط انداز کے بعد منہ موڑ کر پرلی طرف اٹھلاتی ہوئی مس صاحبہ کی طرف متوجہ ہو جاتے ۔

کوٹھے پر سے بھی شہزاد کو ایک نظر دیکھنا آسان نہ تھا ۔ ان کا مکان بہت اونچا تھا ۔ اور چاروں طرف قد آدم پردے تھے ۔ کھڑکیاں تو گویا تھیں ہی نہیں ۔ کیونکہ مکان کی کھڑکیوں کو کسی نے کبھی کھلتے نہ دیکھا تھا ۔ بالفرض محال اگر آپ کوٹھے پر سے اسے دیکھ بھی پاتے تو پیشتر اس کے کہ آپ اسے غور سے دیکھنے کے لئے سنبھلتے ، وہ آپ کی طرف دیکھے بغیر نظریں جھکائے گزر جاتی ۔

دیکھنا تو جب ہوتا ہے جب وہ بھی آپ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے ۔ لیکن چاہے ایک ثانیہ کے لئے ہی ہو ۔ چاہے عدم توجہی کی اوٹ سے ہی دیکھا جائے ۔ چاہے نہ دیکھنے کے انداز سے دیکھے ۔ لیکن دیکھے ضرور ۔ اور خود نہ بھی دیکھے تو کم از کم اسے یہ احساس تو ہو کہ اسے دیکھا جارہا ہے ۔ اس کے بغیر آپ قد دیکھ لیں گے ۔ رنگ دیکھ لیں گے ۔ خدوخال دیکھ لیں گے شاید آنکھوں پر جھکی ہوئی پلکیں بھی دیکھ لیں ۔ لیکن آپ کو یہ احساس نہ ہوگا ۔ کہ آپ نے کسی کو دیکھا ہے ۔

گذشتہ چند ماہ کے اندر اندر شہزاد پر یوں جوانی چھاگئی تھی جیسے ساون میں دیکھتے دیکھتے آسمان پر گھٹائیں چھا جاتی ہیں ۔ دیکھتے دیکھتے اس کے جسم میں اک جوار بھاٹا اٹھا اور جسم کے پیچ و خم نمایاں ہوگئے ۔ بند بند میں شگفتگی دوڑ گئی ۔ سفیدی میں سرخی کی جھلک آگئی ۔ اعضاء میں تناؤ لہریں لینے لگا ۔ لیکن اس کے باوجود اس کی نگاہیں جھکی جھکی اور انداز گھٹا گھٹا ہی رہا ۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا صبر آزما شباب اس سے انتقام لے رہا ہو ۔

پھر ایک روز جب قاسم اتوار کی چھٹی پر گھر آیا اور چپ چاپ رہائشی کمرے میں جا گھسا تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ۔ ”ضدی“ وہ حیرت سے چلایا ۔ اماں ۔“

شہزاد چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی ماں ، زبیدہ اور ثریا اس کے اردگرد بیٹھی تھیں اور اس کے ہاتھ دبا رہی تھیں ۔ ماں قاسم کو دیکھ کر بھونچکی رہ گئی ۔ پھر سنبھل کر بولی ۔ ”کچھ بھی نہیں ، ذرا دل کمزور ہے ۔“

”دل کمزور ہے“ قاسم نے حیرانی سے دہرایا ۔ سبھی کا دل کمزور ہے کیا ۔

دل کی کمزوری سے اسے چڑ تھی ۔ دل کی کمزوری کی بات سن کر وہ غصے میں آجاتا تھا ۔ اور ماں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگتا ۔ نہ جانے ماں کیا سازش کر رہی ہے ۔

قاسم کے بدلے ہوئے تیور بھانپ کر ماں اٹھ کھڑی ہوئی اور کھینچ کر اسے دوسرے کمرے میں لے گئی ۔ اور حسب عادت بولی ”تم خواہ مخواہ فکر کرتے ہو ۔ کہا جو ہے لڑکی کو دل کی کمزوری کی شکایت ہے“ ۔

"لیکن کیوں، وہ چلایا میں ڈاکٹر کو بلا کر لاتا ہوں ۔"

"نہ نہ !" ماں نے اس کا بازو پکڑ لیا ۔ "میں اس گھر میں ڈاکٹر نہ آنے دوں گی ۔"

"لیکن ضدی جو بیمار ہے ۔" قاسم جھلا کر بولا ۔

"ڈاکٹر کیا جانیں عورتوں کی بیماریوں کو ۔" ماں نے پُراسرار تبسم سے کہا ۔ اور ان کی دوائیاں اللہ ماری خالص گرمی اور خشکی ۔ لڑکی کا مزاج تو پہلے ہی صفراوی ہے ۔"

"لیکن اماں علاج نہ کراؤ گی تو ۔۔۔۔۔"

"اپنے حکیم صاحب کا علاج جو کروا رہی ہوں ۔" ماں نے قاسم کی بات کاٹ کر کہا ۔

"حکیم صاحب کا" قاسم نے برا سا منہ بنا لیا ۔

"تم تو خواہ مخواہ فکر کرتے ہو" وہ ہنسی ۔ ذرا سی تکلیف ہے ابھی آرام آجائے گا ۔ اس روز قاسم نے شدت سے محسوس کیا کہ ماں واقعی کوئی چال چل رہی ہے ۔ اس سے کوئی راز چھپا رہی ہے لیکن وہ کر ہی کیا سکتا تھا ۔ گھر میں صرف ماں کی چلتی تھی ۔ بہنیں بھی تو صرف ماں کی ہاں میں ہاں ملانا جانتی تھیں ہر بات پر ماں کا ساتھ دیتی تھیں چاہے قاسم انہیں کے بھلے کی بات کہتا ۔ لیکن وہ اسکی بات کو خاطر میں نہ لاتی تھیں ۔ ان حالات میں ماں کے خلاف شکائت کرنا بے کار تھا ۔ اس لئے قاسم کسمسا کر چپ ہو رہا اور پھر دل ہی دل میں کڑھتا رہا ۔ قاسم جانتا تھا کہ ماں لڑکیوں کے معاملات پر یوں پردہ ڈال دیتی ہے جیسے مرغی بچوں کو پروں تلے چھپا لیتی ہے ۔ قاسم کو اس بات پر ماں کے خلاف غصہ محسوس ہوتا ۔ اسے ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ ماں نہیں بلکہ جادوگرنی ہے ۔ جس نے جادو کے زور سے اس کی بہنوں کو بکریاں بنا رکھا ہے ۔ یہ محسوس کر کے وہ غصے سے پیچ وتاب کھاتا ۔ پھر گھبرا کر باہر نکل جاتا اور کوئی نہ کوئی دل بہلاوے کا سامان پیدا کرلیتا ۔ اور پھر چھٹی ختم ہو جانے پر واپس لاہور جاکر دفتر کے کام میں کھو جاتا ۔ اور اس دلخراش احساس سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیتا ۔

اپنی ماں کے خلاف پہلی مرتبہ اس نے اس روز غصہ محسوس کیا تھا ۔ جب زبیدہ کی شادی کا پیغام آیا تھا ۔ اس روز اتفاق سے وہ گھر آیا ہوا تھا ۔ جب اس نے سنا کہ ظہیر صاحب کی طرف سے زبیدہ کے رشتے کے لئے پیغام آیا ہے تو اسے بے حد خوشی ہوئی ۔ اس کی خواہش تھی کہ جلدازجلد دونوں بہنوں کی شادیاں کردی جائیں ۔ لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ ماں نے بات ٹال دی ہے تو وہ غصے سے تڑپ اٹھا ، اور ماں پر برس پڑا ۔ ماں نے بات ہنسی میں ٹالنا چاہی ۔
"اے ہے آنکھیں کیوں دکھاتے ہو مجھے ۔ لڑکی کو گھر سے نکالنے کا ایسا شوق بھی کیا ۔ اس کی عمر ہی کیا ہے ؟"
"اماں!" وہ چلایا "تم نے خواہ مخواہ عمر کا ڈھونگ رچا رکھا ہے ۔ کیا میں جانتا نہیں کہ وہ ۲۵ سال کی ہوچکی ہے ۔"
ماں یہ سنکر جلال میں آگئی بولی ! "تو کیا لڑکی کو چار کپڑوں میں گھر سے نکال دوں ۔ برادری والے کیا کہیں گے ۔ سسرال میں کیا عزت رہ جائے گی ۔ عمر ضائع ہونے کا اتنا ہی خیال ہے تو کہیں سے کما کر کیوں نہیں لاتے ۔ آخر تمہیں نے ان سب کے بیاہ کرنے ہیں ۔ ایک پر چار ہزار کا خرچ ہو تو کل ۲۸ ہزار روپیہ چاہیئے ۔ اللہ رکھے سات بہنوں کے اکیلے بھائی ہو وہ تو کچھ چھوڑے بغیر چپکے سے سدھار گئے ۔ ان سات چڑیلوں نے مجھے دن رات روگ لگا رکھا ہے ۔ ہر گھڑی ان کی فکر میں گھلتی رہتی ہوں ۔ اس پر تم بھی آنکھیں دکھاتے ہو"۔
"اٹھائیس ہزار ۔۔۔۔۔۔۔ !" قاسم سکتے میں رہ گیا ۔
اس نے ہر ممکن طریقے سے ماں کو سمجھانے کی کوششیں کیں ۔ دلیلیں اور مثالیں دے کر اسے سمجھایا ۔ مسلے مسائل بیان کرکے اسے یقین دلانے کی ترکیب نکالی ۔ سیرۃ النبیؐ میں سے کئی ایک ٹکڑے پڑھ کر سنائے اس پر بھی ماں کی رائے نہ بدلی تو منتیں کرنے لگا کہ ناک کی خاطر لڑکیوں کی زندگی تباہ نہ کرے ۔ لیکن ماں نے اس کی ایک نہ سُنی ۔ پھر وہ مایوس ہوکر خاموش ہو گیا ۔ اس کی نگاہ میں ماں کی شکل بدلنے لگی ۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ ماں کے روپے میں وہ جادوگرنی ہے اور وہ جادو کی بکریاں اس کی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور ہوں ۔ اسے اپنی ماں سے نفرت ہوگئی ۔ زبیدہ اور ثریا کو وہ شک کی

نظر سے دیکھنے لگا ۔ اس روز سے اس کی تمام تر محبت شہزاد پر مرکوز ہوگئی ۔ جو ان دنوں محض ایک بھولی بھالی بچی تھی ۔ اور زبیدہ اور ثریا کی طرح ماں کے گال سے گال جوڑ کر کھسر پھسر کرنے کی عادی نہ تھی ۔

جب کبھی وہ گھر آتا تو ماں، زبیدہ اور ثریا میں سے کسی نہ کسی کو ضرور چارپائی پر لیٹے ہوئے دیکھتا اور باقی دونوں کو اس کے پاس بیٹھ مٹھی چاپی کرنے میں مصروف پاتا ۔ کمرے کے دروازے بند ہوتے ۔ وہ تینوں سر جوڑ کر باتیں کیا کرتیں ۔ جیسے کوئی سازش کر رہی ہوں ۔ ایسے وقت میں بچوں کو خاص ہدایت ہوتی کہ کمرے میں داخل نہ ہوں اور کوئی ملنے والی آجائے تو اسے دوسرے کمرے میں بٹھا کر ماں کو اطلاع کر دیں ۔۔۔۔۔۔۔ دو ایک بار قاسم نے کوشش کی تھی کہ اس انوکھی پُراسرار تیمارداری کی حقیقت معلوم کرے ۔ ماں نے پہلے تو رازدارانہ انداز سے منہ پر انگلی رکھ کر کہا ۔ "لڑکی کی طبیعت اچھی نہیں ۔" قاسم کے مزید اصرار پر وہ چڑ کر بولی ۔ "اب میں تمہیں کیا بتاؤں کیا ہوتی ہیں عورتوں کی تکلیفیں ۔" یہ کہہ کر وہ پھر بند کمرے میں جا داخل ہوئی ۔ دو ایک مرتبہ اس نے زبیدہ اور ثریا سے پوچھنا چاہا ۔ لیکن وہ دونوں اس کی بات سن کر مسکرا دیتیں ۔ اور پھر کام میں لگ جاتیں ۔ ان کی مسکراہٹ میں تمسخر کی جھلک ہوتی جسے محسوس کرکے اس کے دل میں ان کے خلاف نفرت پیدا ہوتی ۔ حتیٰ کہ اس کے لیے ان دونوں سے بات کرنا بھی ناگوار ہوگیا تھا ۔ جوں جوں وہ ان تینوں سے مایوس ہوتا گیا ، توں توں اس کے دل میں شہزاد کی محبت بڑھتی گئی ۔

لیکن اس روز شہزاد کو چارپائی پر لیٹے اور ان تینوں کو اس کے گرد حلقہ ڈالے دیکھ کر وہ سر پیٹ کر رہ گیا ۔ اسے کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ ایک دن شہزاد پر بھی ماں کا جادو چل جائیگا اسے یقین تھا کہ شہزاد زبیدہ اور ثریا کی طرح بھیگی بلی نہیں ہے ۔ اس کی طبیعت سازشوں سے پاک ہے ۔ اس کی نفسیت میں کوئی الجھاؤ نہیں ۔

اس روز اس کے دل میں ایک خاموش ارادہ قائم ہوگیا ۔ وہ شہزاد کو ماں کے ہاتھ کی کٹ پتلی نہیں بننے دے گا ۔ اُسے اس جادوگرنی کی گرفت میں نہیں

آنے دے گا ۔ چونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ ماں کے خلاف آواز اٹھانا بیکار ہے ۔ اس لئے وہ خاموش ہو رہا ۔ اس خاموشی نے اس کے ارادے کو اور بھی تقویت پہنچائی ۔ اور وہ شہزاد کو بچانے کے لئے تجویزیں سوچنے لگا ۔

اس کے بعد قاسم نے شہزاد کو اپنے اثر میں لینے کی کوششیں شروع کردیں ۔ بہانے بہانے اس نے شہزاد کو لاہور لے جانے کی کوشش کی لیکن وہ رضامند نہ ہوئی ۔ اس کی نارضامندی اس قدر مبہم ہوتی کہ اسے انکار سمجھنا بھی ممکن نہ ہوتا ۔ ہنس کر کہتی ۔ "ہم سب کو لاہور لے چلئے نا ۔ صرف مجھے ہی کیوں ۔" اس بات پر قاسم نے مناسب عذر پیش کئے ۔ لاہور میں اتنا بڑا گھر کہاں سے ملے گا ۔ جس میں ہم سب سما سکیں ۔ مناسب جگہ ملنے پر سبھی کو لے جاؤں گا لیکن اس وقت تو تم چلو نا ۔ صرف تم" "تو صرف اماں کو بھی ساتھ لے جائیں ۔" وہ ہنستی "اماں کو لے جانے سے فائدہ ۔" قاسم نے جواب دیا ۔ "کیوں؟ کیا وہ کھانا نہ پکا سکے گی ۔" شہزاد بولا ۔ "بوڑھی جان کو تکلیف دینا؟" اور وہ ہنسنے لگی ۔ "یہاں تو پھولوں کی سیج پر بیٹھی ہے ؟" قاسم چڑ گیا ۔ "بڑی ضدی ہو تم ۔ ضدی میں تمہاری ضد توڑ کر رہوں گا ۔" قاسم اس کے شانے جھنجھوڑنے لگا ۔ اور وہ ہنسنے لگی ۔ اس کے بعد اس نے شہزاد کو سیرو تفریح اور کھیلوں کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی مگر بے سود ۔ شاید اس کے بعد وہ شہزاد سے مایوس ہو جاتا ۔ مگر اس کے انکار کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہوتی کہ اسے انکار سمجھنا مشکل ہو جاتا تھا ۔ اس کی لطیف اور خاموش مسکراہٹ ۔ قاسم کے دل میں امید کی ان جانی کرن روشن کر دیتی تھی ۔ اسی لئے اس کے مسلسل انکار کے باوجود قاسم کے دل میں شہزاد کی محبت جوں کی توں قائم رہی ۔

پھر ایک مرتبہ جب وہ گھر آیا تو باتوں ہی باتوں میں ماں کے منہ سے وہ بات نکل گئی ۔ "حکیم صاحب نے کہا ہے اگر لڑکی کو پہاڑ پر لے جایا جائے تو شاید طبیعت سنبھل جائے ۔" یہ کہتے ہوئے ماں کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں ۔ "یہاں مشکل سے گزارہ ہوتا ہے ۔ پہاڑ پر جانے کی توفیق کہاں ۔" قاسم کے دل میں مرجھائی ہوئی امید پھر سے لہلہا اُٹھی ۔ شہزاد سے ماں کا اثر دور کرنے کی امید پر

وہ بلا سوچے سمجھے بولا ۔ "میں اسے پہاڑ پر لے جاؤں گا میں ۔۔۔۔۔ !" ماں کو یہ امید نہ تھی کہ وہ اتنی جلدی بہن کو پہاڑ پر لے جانے کے لئے تیار ہو جائے گا ۔ کل ایک سو روپیہ تو اس کی تنخواہ تھی ۔ جس میں سے پچاس روپے وہ اپنی ذات پر خرچ کرتا تھا ۔ اور پچاس روپے گھر دیا کرتا ۔ پچاس روپے میں اس کا اپنا گزارہ نہ ہوتا تھا ۔ وہ تو شکر ہے اسے فضول خرچی کی عادت نہ تھی ورنہ نہ جانے ان کا کیا حال ہوتا ۔ اس صورت میں وہ بہن کو پہاڑ پر کیسے لے جاسکتا تھا ۔ ماں کی حیرانی بجا تھی ۔ بولی "آخر مجھے بھی معلوم ہو ۔ کہ روپیہ کہاں سے آئے گا ؟"

"روپے کا انتظام ہو جائے گا ۔" وہ بے پروائی سے بولا ۔

"لیکن ہو گا کیسے"

"روپے کی تو ضرورت ہی نہیں ۔" قاسم نے پینترا بدلا ۔ صرف کرایہ چاہیئے ۔

"تو کیا وہاں جا کر بھیک مانگو گے ۔" ماں ہنس پڑی ۔

"وہاں میرا دوست رہتا ہے ۔" معاً اسے سُوجھی ۔

"دوست ۔" ماں نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا ۔ "بہن کو دوست کے ہاں لیجاؤ گے ؟"

اسے دوست کے لفظ سے چڑ تھی کیونکہ وہ سمجھتی تھی ۔ کہ دوست بدمعاش کا دوسرا نام ہے ۔

"واہ! ماں ۔" قاسم نے اپنی غلطی محسوس کرتے ہوئے کہا ۔ "وہ اکیلا رہتا ہے کیا وہاں ؟ گھر بار ہے بال بچے ہیں ۔"

یہ سنکر ماں نے بھی پہلو بدلا ۔ "تو پھر میں بھی ساتھ چلتی ہوں "

قاسم گھبرا گیا ۔ "نہیں نہیں اماں ! کسی پر اتنا بوجھ ڈالنا اچھا نہیں ۔

ماں لڑکی کو بھائی کے ساتھ اکیلے بھیجنے سے گھبراتی تھی ۔ اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ انکے ہمراہ جائے ۔ جب اس نے دیکھا کہ قاسم رضامند نہیں ہوتا تو سرے سے بات ٹالنے کی کوشش کی ۔ لیکن قاسم اپنی ضد پر بدستور اڑا رہا ۔ آخر وہ چاروں بند کمرے میں جا بیٹھیں اور سر سے سر جوڑ کر نہ جانے کیا کیا

باتیں کرتی رہیں ۔ یہ دیکھ کر قاسم غصے سے بھوت بن گیا ۔ اس نے باآواز بلند گھر والوں کو صلواتیں سنانا شروع کردیں ۔ شور سن کر ماں بھاگی بھاگی آئی ۔ خدا کے لئے ساری دنیا کو تو نہ سناؤ ۔ لوگ کیا کہیں گے ۔ اڑوس پڑوس والے سُن کر کیا سمجھیں گے ؟"

"میں تو چاہتا ہوں کہ لوگ سنیں" قاسم غرایا ۔ انہیں معلوم ہو کہ تم لڑکیوں کی زندگیاں تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہو ۔ تم ان ناسوروں میں پیپ بھر رہی ہو ۔"

یہ سن کر ماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔ اس پر بے حد ہنگامہ برپا ہوا اور بالآخر نتیجہ یہ ہوا کہ ماں شہزاد کو پہاڑ پر بھیجنے پر تیار ہوگئی ۔ قاسم چھٹی لینے کے لئے لاہور چلا گیا اور وہ سب شہزاد کو لے کر بند کمرے میں داخل ہوگئیں ۔ اور اسے مناسب ہدایات دینے لگیں ۔

کچھ دیر تک تو قاسم اس شاندار فتح پر خوشی سے پھولا نہ سمایا ۔ پھر دفعتاً اسے یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ بہن کو لے جائیگا کہاں ۔ وہ گھر بار اور بال بچوں والا دوست تو محض بہانہ تھا ۔ پہاڑ پر جانے کے لئے روپے کی ضرورت تھی ۔ اور اس کے پاس تو صرف بارہ آنے کی بچی ہوئی رقم تھی ۔ قرض ! اس نے سوچا ۔ اتنا قرض اسے کون دے گا ۔ دو روپے مانگنے کی بات اور تھی ۔ لیکن اتنی رقم ۔ اور اگر انتظام نہ ہوا تو ۔ ماں کیا کہے گی ۔ گھر والے اس کا مذاق اڑائیں گے ۔ لیکن انتظام کیسے ہوگا ۔ اسی ادھیڑ بن میں وہ لاہور جا پہنچا ۔

لاہور پہنچکر وہ دیوانہ وار اِدھر اُدھر گھومتا رہا ۔ کسی سے براہِ راست صاف بات کرنے کی اُسے ہمت نہ پڑی ۔ ہاں سرسری طور پر کسی سے ہل سٹیشن کے اخراجات کے متعلق پوچھتا ۔ بہانے بہانے پہاڑ کی بات چھیڑ دیتا ۔ اور پھر غفور سے سنتا رہتا ۔ وہ ہل سٹیشن کے اخراجات سنکر یقیناً مایوس ہوگیا ہوتا ۔ اگر اتفاق سے اختر سے ملاقات نہ ہو جاتی ۔

اختر سے نہ رہا گیا بولا ۔ "بات کیا ہے آخر ؟ یہ جو تم ہل سٹیشن کا قصہ لئے بیٹھے ہو ۔ وہاں جانے کا ارادہ ہے کیا ؟"

"نہیں نہیں !" وہ گھبرا گیا ۔ "میرا مطلب ہے ممکن ہے کبھی جانا

پڑے ۔"

"ممکن ہے جانا پڑے ۔ کیا مطلب ہے تمہارا بھئی صاف بات کرو تو کچھ پتہ بھی چلے ۔"

"میرا مطلب ہے میرا مطلب یعنی ۔ ہمشیرہ بیمار ہے ۔"

"ہمشیرہ بیمار ہے ؟" اختر فکر میں پڑ گیا ۔ "تو پھر فوراً لے جاؤ اُسے ۔ جام میں اپنا گھر جو خالی پڑا ہے ۔ والد صاحب نے اسی سال خریدا ہے۔ بڑی اچھی جگہ ہے ۔ اگرچہ پہلے وہاں ایک آوارہ سی عورت رہتی تھی ۔ لیکن ہم نے اسے نکال دیا ہے ۔۔۔۔۔۔ جام بڑی اچھی اور سستی جگہ ہے ۔ زیادہ سے زیادہ تیس چالیس روپے ماہوار خرچ آئے گا وہاں ۔"

"ہاں ہاں ۔ جام میں بس چار ایک مکان ہیں اور دو ایک دوکانیں ۔ ریاست کا گاؤں ہے جہاں آج گھی دو روپے سیر بکتا ہے ۔"

"دو روپے" وہ بڑ بڑایا ۔ "لیکن پھر بھی خرچ تو ہوگا ہی نا ۔" قاسم نے آہ بھر کر کہا ۔

"تو تنخواہ پر مجھے ادا کر دینا" یہ کہہ کر اختر چپ چاپ اندر چلا گیا اور کچھ دیر کے بعد ساٹھ روپے کے نوٹ اور مکان کی چابی لاکر قاسم کے ہاتھ پر رکھ دی ۔

اس طرح وہ جام پہنچا تھا ۔ اور وہاں پہنچکر سبھی کچھ بھول گیا تھا ۔ اچنبھے سے اس سبز پیالے کی طرف دیکھتا ۔ پھر جھیل کی طرف اٹھ بھاگتا ۔ اس معلق پل پر جا کھڑا ہوتا جو جھیل کے آرپار جھولے کی طرح ڈولتا رہتا تھا ۔ جھیل کے پانی کو ہاتھوں میں اٹھالیتا' چینی محل کو غور سے دیکھنے لگتا اور پھر چاروں طرف استادہ دیواروں کو دیکھ کر ان جانے میں انگڑائیاں لینے لگتا ۔ پھر شدت جذبات سے گھبرا کر گھر کی طرف اٹھ بھاگتا ۔ "ضدی ، ضدی!" شہزاد اسے مضطرب دیکھ کر سہم جاتی ۔ چونک کر اپنے ہاتھ چھپا لیتی ۔ اور منہ موڑ کر بیٹھ جاتی ۔ اس کے دل میں بھائی کے متعلق شبہات پیدا ہو رہے تھے ۔

ویسے تو شہزاد بھی اس خوبصورت منظر کو دیکھ کر متاثر ہوئی تھی ۔ سبز پیالے کو دیکھ کر اس کے دل میں بھی خوشی کی ایک رَو اٹھی تھی ۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ خوشی محسوس کرنے پر خواہ مخواہ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آتیں ۔ دل پر

ٹھیس لگتی ۔ سینے پر بوجھ پڑ جاتا اور ہتھیلیوں میں سرسراہٹ ہونے لگتی ۔ اور وہ چونک کر بھائی سے ہاتھ چھپالیتی اور اس کی نظروں سے اوجھل ہو جانے کی کوشش کرتی ۔ اسی لئے تو وہ جام کو بغور دیکھنے سے ہچکچاتی تھی ڈرتی تھی کہ کہیں اس کی طبیعت قابو سے نکل نہ جائے ۔ بھائی کے سامنے اسے دورہ نہ پڑ جائے ۔ شاید اسی لئے اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی مشرقی کھڑکی پر چق ڈال دی تھی ۔ اور اپنے آپ کو جام کے منظر سے محفوظ کرلیا تھا ۔ پھر وہ کونے میں جا بیٹھی تھی اور کچھ بننے میں مصروف ہوگئی تھی ۔ قاسم اپنے آپ اور جام میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ اس نے شہزاد کی خاموشی اور مصروفیت کا خیال نہ کیا ۔ اگرچہ وہ اسے باربار بلاتا ۔ بار بار بھاگا بھاگا اس کی طرف آتا ۔ لیکن پھر جلد ہی منظر کے طلسم میں ازسرنو کھو کر اسے بھول جاتا ۔

آہستہ آہستہ قاسم کا وہ خوشی بھرااچنبھا معدوم ہوتا گیا ۔ مسرت تو وہ اب بھی محسوس کرتا تھا ۔ لیکن اس کے جذبے میں وہ شدت نہ رہی تھی وہ اضطراب نہ رہا تھا ۔ پھر آہستہ آہستہ طبیعت پر اداسی چھانے لگی ۔ ضدی کی موجودگی کے باوجود شدید تنہائی کا احساس اس کی رگ وپے میں سرایت کرتا گیا ۔ قاسم اس سبز پیالے کی طرف دیکھتا اور چلانے یا دوڑنے کی بجائے آہ بھر کر گھاس پر بیٹھ جاتا ۔ اور پھر ٹھوڑی کو ہاتھوں کے پیالے پر رکھ کر جام کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا ۔ پھر آہستہ آہستہ تنہائی کا یہ احساس کرتا گیا اور ایک روز دبے ہوئے طوفان کی طرح پھوٹ نکلا ۔ ایک بار پھر اس پر اضطرابی کیفیت طاری ہوگئی ۔ یہ کیفیت پہلی کیفیت سے کسی قدر مختلف تھی ۔ اپنی شخصیت کے اخراج سے مسرت حاصل کرنے کی بجائے اس کی توجہ گردوپیش سے سمٹ کر اپنے آپ پر مرکوز ہونے لگی ۔ بند بند میں الجھنیں محسوس ہونے لگیں ۔ ناقابل برداشت تناؤ کی وجہ سے اعضاء درد کرنے لگے ۔ اور وہ شہزاد کے قریب جانے سے ہچکچانے لگا ۔

پہلے تو قاسم نے اس کیفیت سے بے نیاز رہنے کی کوشش کی ۔ لیکن جذباتی اضطراب ہر ساعت واضح سے واضح تر ہوتا گیا ۔ قاسم نے اسے دبانے کی کوشش کی لیکن اس کے جسم کی نسیں پھڑک پھڑک کر اسے جھٹلانے لگیں ۔

آنکھوں میں سرخ ڈورے ابھر آئے ۔ جسم سے شرارے پھوٹنے لگے حتیٰ کہ مجبور ہو کر وہ اٹھ بیٹھا ۔ اوران جانے میں جیب میں ہاتھ ڈال کر دو روپوں کو انگلیوں میں پھیرتے ہوئے جام کی دوکان پر جا پہنچا اور پوچھنے لگا :

"لالہ یہاں سے شہر کتنی دور ہوگا ۔"

"شہر" لالہ نے اس کی طرف غور سے دیکھا ۔ "کونسا شہر؟"

"کوئی بھی ہو ۔" وہ بولا "نزدیک ترین شہر!"

لالہ نے مٹھائی تولتے ہوئے جواب دیا ۔ مہاراج ! اس طرف دس میل دور چنبہ ہے اور اس طرف دس میل دور ڈلہوزی ۔

دس میل !! قاسم نے حیرانی اور یاس سے دہرایا ۔ دس میل !! اور پھر مایوسی بھرے انداز سے کھڑا ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف دیکھتا رہا ۔ اور ہاتھوں میں دونوں روپوں کو گھماتا رہا ۔

لاہور میں کبھی کبھار ایسی کیفیت اس پر طاری ہو جایا کرتی تھی ۔ لیکن وہاں اس نے کبھی ایسا طول نہ پکڑا تھا ۔ شاید اس لئے کہ وہاں اس کا مکان شہر سے بالکل قریب تھا ۔ شاید وہ دس میل کی مسافت طے کرنے سے بھی گریز نہ کرتا ۔ لیکن شہزاد کو اس مکان میں اکیلا چھوڑنا جو اس تن تنہا ٹیلے پر واقع تھا ۔ اور جس کے اردگرد دور تک کوئی مکان نہ تھا ۔ اور جہاں ایک آوارہ عورت رہ چکی تھی ۔ مناسب نہ تھا ۔

اس کی نگاہ اپنے مکان پر جا پڑی ۔ سامنے جنوب کی طرف ٹیلے پر وہ چھوٹا سا مکان اداس کھڑا تھا ۔ چمنی سے دھواں نکل رہا تھا ۔ جیسے مکان ٹھنڈی آہیں بھر رہا ہو ۔ اس تن تنہا مغموم مکان کو دیکھ کر اسے اپنی تنہائی کا خیال آگیا ۔ اور اس پر پھر سے وہی کیفیت شدت سے طاری ہوگئی ۔

قاسم کی سادہ اور پاکیزہ زندگی میں صرف یہی ایک الجھاؤ تھا ۔ شروع میں تو اس اضطرابی کیفیت کے زیر اثر وہ بے حد پریشان رہا تھا ۔ اس جذباتی اضطراب کے چنگل سے مخلصی پانے کے لئے اس نے کئی ایک تدبیریں کیں جو کارگر نہ ہوئیں ۔ وقتی طور پر سکون حاصل ہو بھی جاتا تو اس کے عقب میں بے پناہ اداسی کا ریلا چلا آتا ۔ ندامت اور تحقیر کے ملے جلے جذبات سمٹ کر ایک

بھنور بن جاتے ۔ گردوپیش حریفانہ شکل اختیار کر لیتا ۔ ۔۔۔۔۔ پھر اس نے شہر جانا سیکھ لیا ۔ اور اس کی شخصیت میں پھر سے توازن پیدا ہوگیا ۔

اس کے بعد اضطرابی کیفیت نے کبھی طول نہ پکڑا تھا کبھی کبھار چھوٹی موٹی دقتیں پیش آجاتی تھیں لیکن ایسی نہیں ۔ جن کا تدارک نہ ہو سکے ۔ کبھی کبھار اسے کسی دوست کے پاس جانا پڑتا ۔ بھئی دو ایک روپے ہونگے ۔ اس وقت اس کا اندازہ معمول سے کسی قدر مختلف ہوتا تھا ۔ اضطراب ، جھجک اور پریشانی کی وجہ سے اطمینان سے بیٹھنا اور بات کرنا ناممکن ہو جاتا تھا ۔ مثلاً پہلی مرتبہ جب وہ قرضہ لینے اختر کے ہاں گیا تو اسے دیکھ کر بھاگا بھاگا اندر گیا اور دس روپے لاکر معذرت کرنے لگا ۔ "بھئی اس وقت تو صرف دس ہی ہیں ۔"

"نہیں نہیں ۔" قاسم گھبرا کر بولا ۔"صرف اتنے ۔" اس نے دو روپے اٹھا لئے ۔ "میرا مطلب ہے صرف دو ۔ اچھا تو میں جاتا ہوں ۔"

"ارے" اختر حیران رہ گیا ۔ "ٹھہرو تو!"

"مجھے کام ہے ۔ شہر جانا ہے ۔"

"دو روپے " اختر حیران تھا "دو روپے کے لئے اتنی پریشانی ۔" اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ۔

اس کے بعد دو ایک مرتبہ پھر وہی واقعہ پیش آیا ۔ اختر متعجب ہوتا تھا کہ دو روپے قرض مانگنے والا قاسم اُس قاسم سے کس قدر مختلف ہوتا ہے جو عام طور پر اسے ملا کرتا ہے ۔ اُس نے دو ایک مرتبہ اس موضوع پر بات کرنے کی کوشش بھی کی ۔ لیکن قاسم نے ٹال دیا ۔ نہ جانے کب تک قاسم دو روپے مٹھی میں دبائے ڈوبتے ہوئے سورج اور اس اکیلے آہیں بھرتے ہوئے مکان کی طرف دیکھتا رہا ۔ پھر دفعتاً سرائے سے گانے کی آواز سن کر وہ چونکا ۔

ڈولے ہردے کی نیا ۔ ڈولے

اس نے سرائے کی طرف دیکھا ۔ ان کے مکان تلے شمال کی طرف سو گز کے فاصلے پر سرائے کا برآمدہ صاف دکھائی دے رہا تھا جس میں بہت سے وردی پوش جوان گراموفون کے ارد گرد ہلڑ مچا رہے تھے ۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ لوگ اس کے راز سے واقف ہوں ۔ اور اس کا مذاق اڑا رہے ہوں ۔ انہیں دیکھ

کر قاسم گھبرا گیا اور گردن جھکائے اپنے مکان کی طرف چل پڑا۔
"ہائیں!" شہزاد کو یوں پڑے دیکھ کر اُس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔
"ضدی ضدی" وہ چلایا۔ شہزاد کا آدھا جسم چارپائی پر تھا اور آدھا نیچے لٹک رہا تھا۔ سر چارپائی کے پاس پڑی ہوئی میز پر ٹکا ہوا تھا۔ بانہیں نیچے لٹک رہی تھیں اور مٹھیاں بند تھیں۔ "ضدی! ضدی" اس نے شہزاد کو جھنجھوڑا لیکن وہ بے جان پتلے کی طرح لڑھک کر ایک طرف جاگری۔ قاسم نے لپک کر پانی کا گلاس اٹھایا۔ لیکن شہزاد کے جبڑے مقفل تھے۔ منہ پر پانی کا چھینٹا دینے کے بعد اس نے شہزاد کے دل پر ہاتھ رکھا۔ دل کی حرکت محسوس کرکے اسے قدرے اطمینان ہوا۔ پھر وہ جام کی طرف بھاگا۔
"لالہ۔ لالہ" اس نے دوکاندار سے پوچھا۔ "یہاں کوئی ڈاکٹر ہو گا۔"
"ڈاکدار۔" دوکاندار نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ نہ ماراج یہاں ڈاکدر کہاں۔ البتہ ویدجی ہیں۔
"ڈاکٹر نہیں؟" وہ گھبرا کر بولا۔
"نہیں ماراج۔" دوکاندار نے دانت نکال کر معذرت کی۔
"بات کیا ہے" دوکان پر کھڑا ہوا ایک فوجی سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔
"مریض ہے۔" قاسم نے بے پروائی سے جواب دیا اور چل پڑا۔
"ٹھہرو! میں چلتا ہوں" فوجی چلایا۔
"آپ؟" قاسم رک گیا۔
"ہاں" فوجی بولا۔ "میں ڈاکٹر ہوں۔" اور دوسرے لمحے وہ دونوں مکان کی طرف تیزی سے قدم اٹھانے لگے۔
سرسری معائنے کے بعد ڈاکٹر بڑبڑایا۔ "ہوں شادی شدہ ہے یہ لڑکی یا۔۔۔۔"
"نہیں شادی نہیں ہوئی۔"
"اوہ!" ڈاکٹر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ "کوئی فکر کی بات نہیں۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔ کسی دوائی کی ضروت نہیں۔"
"دوائی کی ضرورت نہیں۔" قاسم نے حیرانی سے دہرایا۔

"قطعی نہیں ۔"

"لیکن ڈاکٹر ۔" وہ چلایا ۔ "اسے دل کی کمزوری ہے پرانی بیماری ہے ۔"

ڈاکٹر مسکرا دیا ۔

"دل کی کمزوری کے لئے میں اسے پہاڑ پر لایا ہوں ۔"

"اوہ"۔ اس کی آنکھ میں چمک لہرائی ۔

"دل کی کمزوری کے لئے کوئی دوائی تجویز کر دیجئے ۔"

"فوراً شادی کر دو ۔" ڈاکٹر دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولا ۔

"شادی !"

"ہاں ۔ دل بالکل تندرست ہے ۔ کوئی خطرہ نہیں ۔ صرف ہسٹریا ہے ۔ خدا حافظ ۔" اور وہ باہر نکل گیا ۔

دل بالکل تندرست ہے ۔ شادی کر دو ۔ قاسم کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا تھا ۔ وہ حیرانی سے شہزاد کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ چہرہ سُوجا ہوا معلوم ہوتا تھا ۔ گالوں پر سرخ دھبے پھیلے ہوئے تھے ۔ قاسم کی نگاہ شہزاد کے جسم پر جا پڑی ۔ بدن پر قمیض یوں تنی ہوئی تھی ۔ جیسے ابھی پھٹ جانے والی ہو ۔۔۔۔۔۔۔ گھبرا کر قاسم نے اپنی نگاہ دوسری طرف پھیرلی ۔ چرررر ۔۔۔۔ رر ۔۔۔ پاس ہی کوئی جھینگر ٹرایا ۔ قاسم چونک گیا ۔ اس کی نگاہوں تلے کوئی ریشمیں قمیض پھٹ گئی ۔ اور گلابی گلابی بدن سے چارپائی بھر گئی ۔ گھبرا کر قاسم نے نگاہیں دروازے کی طرف پھیر لیں ۔

"ہوں ۔ اوں"۔ شہزاد گنگنائی ۔

"ضدی ۔ ضدی !" وہ مڑ کر شہزاد کی طرف دوڑا ۔ اور اس کے منہ پر جھک کر بولا ۔ "ضدی ضدی کیا حال ہے ۔ کیسی طبیعت ہے ۔" شہزاد نے آنکھیں کھول دیں ۔ سرخ سرخ ڈورے ۔ سوجا ہوا منہ ۔ نیم وا پلکیں ۔ قاسم نے گھبرا کر نگاہ پھیر لی ۔ شہزاد کی چھاتی اتھل پتھل ہو رہی تھی ۔ اور وہ قمیض ۔۔۔ گھبرا کر وہ پیچھے ہٹ گیا اور دیوار کی طرف گھورنے لگا ۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا ۔ کہ کس طرح شہزاد کو اٹھا کر بٹھائے کیسے اسے تسلی دے ۔

"اوہ" شہزاد گنگنائی ۔ "میرے ہاتھ !!"

وہ تڑپ کر اس کی طرف مڑا ۔ "ضدی ! کیوں کیا ہے ؟"
"کچھ بھی نہیں ۔" وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی ۔ جیسے اس سے کوئی نازیبا حرکت سرزد ہوگئی ہو ۔
"کیا ہے تمہیں ۔" وہ دور ہی سے بولا ۔
"کچھ نہیں بھائی جان ۔" وہ سہم کر بیٹھ گئی ۔
"لیکن تمہارے ہاتھ ؟" قاسم بولا ۔
"میرے ہاتھ ؟" شہزاد نے اپنی بھنچی ہوئی مٹھیوں کی طرف دیکھا اور پھر گھبرا کر انہیں چھپا لیا ۔
قاسم نے دو ایک بار شہزاد کے پاس جانے کی کوشش کی ۔ لیکن اس کے پاؤں منوں بھاری ہو رہے تھے ۔ نگاہیں شہزاد کی طرف نہیں اٹھتی تھیں ۔
"کیا ہے تمہیں ۔" اس نے پوچھا ۔
"مجھے !؟ کچھ بھی نہیں مجھے"۔
شا۔۔۔۔۔۔۔ دی ۔ شا ۔۔۔۔۔۔۔۔دی ۔ دور کوئل چیخی ۔
"اچھا اچھا ۔" وہ گھبرا کر بولا ۔ میں باہر دروازے پر ہوں ۔ ضرورت ہو تو آواز دے لینا ۔" یہ کہکر وہ دروازے سے باہر نکل کر ٹہلنے لگا ۔
کچھ دیر تک وہ دروازے کے پاس ٹہلتا رہا ۔ پھر وہ ان جانے میں ٹیلے سے نیچے اتر کر سرائے کی طرف جا پہنچا ۔ اور ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر جام کی طرف دیکھنے لگا ۔
شام کی دھندلی روشنی میں جام یوں ویران دکھائی دیتا تھا جیسے آب حیات سے خالی ہو چکا ہو ۔ چینی محل اجڑا ہوا تھا ۔ چاروں طرف استادہ دیودار جام کی طرف پیٹھ کئے دور کی پہاڑیوں کی طرف آس لگائے تک رہے تھے۔ شا ۔۔۔۔ دی ۔ شا۔۔۔۔دی ۔ پیڑ پر کوئل چیخنے لگی ۔ اس کی نگاہوں تلے نیم وا نشیلی آنکھیں طلوع ہو رہی تھیں پر ررر۔۔۔۔رر ۔۔۔۔ قریب ہی کوئی ریشمیں قمیض پھٹی ۔ گرد وپیش گلابی جسم سے بھر گیا ۔ تناؤ سے بھرپور اعضاء ابھرنے لگے ۔ قاسم نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں ۔ ان جانے میں اس کا ہاتھ جیب میں جا پڑا اور انگلیاں روپوں کے کناروں کو محسوس کرنے لگیں ۔ ہاتھ ۔ ہاتھ ۔ میرے ہاتھ

کوئی پہاڑی جانور چیختا ۔ قاسم کے بدن کو عجیب سے کچوکے لگنے لگے ۔ اسے اپنے آپ اور اس پھٹی ہوئی قمیض سے نکل کر چھائے ہوئے بدن میں اک مناسبت سی محسوس ہونے لگی ۔ اور وہ گھبرا کر گھاس پر لیٹ گیا ۔ جیسے اس کا آخری سہارا ٹوٹ چکا ہو ۔

"ہی ہی ہی ہی ۔" سرائے کے قریب کوئی قہقہہ مار کر ہنس رہا تھا ۔ "جوان لڑکی تھی ۔ بیحد جوان ۔"

"جوان ؟" دوسرے کی روح حلق میں آ اٹکی ۔

"ہسٹریا کا دورہ پڑا ہوا تھا ۔" پہلا بولا ۔ "یہ لوگ لڑکیوں کو گھر بٹھا رکھتے ہیں ۔ شادی نہیں کر سکتے تو انہیں موقعہ دیں ۔"

"موقعہ" دوسرا بولا ۔ "لیکن ۔۔۔۔۔۔"

"لیکن ویکن کوئی نہیں ۔" قاسم نے ڈاکٹر کی آواز پہچان لی ۔ "ایک نہ ایک قربانی دینی ہی پڑتی ہے ۔ چاہے لڑکی کی زندگی کی قربانی دو یا ناموس کی ۔"

"ناموس ۔ ناموس" کوئل چلائی ۔

قاسم دیوانہ وار اٹھ بیٹھا اور لاحول پڑھ کر ان جانے میں گھر کی طرف چل پڑا ۔ مبہم طور پر وہ محسوس کر رہا تھا ۔ کہ اس تھوڑے سے وقت میں گردوپیش کی ہر چیز اس کی دشمن ہو چکی ہے ۔ لیکن گھر گھر بھی تو اس حریفانہ گلابی جسم سے بھرا پڑا تھا ۔ وہ گھر کے دروازے پر جا کر رک گیا ۔ اندر داخل ہونے کو جی چاہتا تھا ۔ ایک ڈر سا درودیوار سے لپکا چلا آرہا تھا ۔

گھر کے دروازے کے پاس جاکر وہ چپ چاپ کھڑا ہوگیا ۔ اس کے جسم میں ازسرنو وہی سرسراہٹ ہونے لگی ۔ اس کا ہاتھ پھر سے جیب میں داخل ہو گیا ۔ شہر ۔۔۔۔۔ ۔ جھینگر نے شور مچایا ۔ وہ چونک پڑا ۔

لاحول ولا قوۃ ۔ اپنی توجہ کو ان مسخرے پرندوں سے ہٹانے کے لئے وہ ہاتھ کے روپوں سے کھیلنے لگا ۔ اسے شہزاد کا خیال آگیا ۔ کہیں وہ پھر بے ہوش نہ پڑی ہو ۔ اس کی آنکھوں تلے شہزاد کی باہیں لٹکنے لگیں ۔ مٹھیاں بند تھیں ۔ وہ گھبرا گیا ۔ نہیں ضدی بے ہوش نہیں ۔ شہزاد نے آنکھیں کھول دیں ۔ سُرخ ڈوروں میں تبسم کی جھلک تھی ۔ شہزاد نے اپنا بازو اٹھایا اور ہاتھ یوں پھیلا دیا

جیسے اس کے ہاتھ والے روپے مانگ رہی ہو ۔ لاحول ولا قوۃ ۔

قاسم نے جھرجھری لی ۔

"ہی ہی ہی ۔" پاس ہی اندھیرے میں کوئی ہنسا ۔ "شہر تو دس میل ہے ۔ دس میل سنا تم نے !؟"

اس کی زبان میں نشے کی لکنت تھی ۔

"شہر جانے کی جرورت ۔" دوسرا بولا ۔ "یہیں مل جائے تو ۔"

"یہاں ۔ ہم سے مجاک کرتا ہے ۔"

"تمہاری قسم یہاں اس ٹیلے پر ۔"

"جھوٹ !"

"میں جھوٹ بولتا ہوں ۔ جو تم بھائی نہ ہوتے مہارے تو دانت نکال کر رکھ دیتا ۔ پر تم بھائی ہو ۔"

"بھائی ۔ اور بھائی پر ہاتھ اونہوں ۔ ہم نہ اٹھائیں گے ۔ چہئے جان سے چلے جائیں ـــــ وہ دیکھو ۔ وہ دیکھا ۔ ٹیلے کا مکان ۔"

"وہ"

"ہاں پچھلی بار ہم یہاں آئے تھے جام میں تو ٹیلے والی سے معاملہ ٹھہرایا تھا ۔ ہاں ۔ پٹاخہ ہے پٹاخہ ۔"

"موقعہ اچھا ہے نا ؟"

موقعہ ـــــــــ موقعہ ۔ کوئل چیخنے لگی ۔ نہ جانے اس وقت قاسم کو کیا ہوا ۔ ان شرابیوں سے نفرت محسوس کر کے یا شاید ڈاکٹر کی بے ہودہ باتیں سن کر اس کا دماغ شل ہوگیا ۔ اسے قطعی یاد نہ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے ۔ اور وہ شرابی اس کے اپنے گھر کی طرف جارہے ہیں ۔ جہاں شہزاد اکیلی پڑی ہے ۔ پھر دفعتاً اسے خطرے کا احساس ہوا ۔ اوہ گھر میں وہ اکیلی ہے ۔ لیکن اس نے محسوس کیا جیسے وہ سرائے کے پاس کھڑا ہے ۔ جہاں وہ فوجی ہلڑ مچارہے تھے ۔ ضدی اکیلی ہے !! اس نے سوچا اور گھر کی طرف جانے کی بجائے غلطی سے دوسری سمت کو بھاگا ۔ ٹیلے سے نیچے کی طرف بگٹٹ بھاگا ۔ خدا کرے ضدی صحت مند ہو جائے ۔ خدا کرے اس کی بیماری دور ہو جائے ۔" وہ شمال کی طرف ڈھلان پر بھاگا جا

رہا تھا ۔ دور ٹیلے پر فوجی قہقہہ مار کر ہنس رہے تھے لاحول ولا قوۃ ۔ اس نے اپنی رفتار اور بھی تیز کردی ۔ سرائے کے پاس ڈاکٹر نے اسے بھاگتے ہوئے پہچان کر پوچھا ۔ "کیا مریضہ کی حالت پھر خراب ہوگئی ہے ۔"

"نہیں نہیں" وہ چلایا ۔ وہ بالکل ٹھیک ہوگئی ہے ۔"

"ہائیں"اس نے سرائے کو پہچان کر اپنی غلطی کا احساس کیا ۔ میں تو گھر سے دور جا رہا ہوں ۔ لاحول ولا قوۃ ۔ اچھا اچھا شکریہ ڈاکٹر شکریہ ۔ اُسے پوری صحت ہو جائے گی ۔ شکریہ ! اور وہ دم لینے کے لئے بیٹھ گیا۔

....○ ....

وہ ہاتھ

"وہ ہاتھ" عصمی نے کہا ۔ "اس سے پہلے کبھی مجھے احساس نہ ہوا تھا کہ ہاتھ جذبات کا اس وضاحت سے اظہار کر سکتے ہیں اور پوری شخصیت کے مظہر ہو سکتے ہیں ۔ ہاتھوں کے مسمری اثر سے مجھے انکار نہ تھا ۔ لیکن دوسرے کو متاثر کر دینا اور چیز ہے اور کسی اثر سے بھیگ جانا اور ۔ ان دنوں میں سمجھتا تھا کہ جسمانی اعضا میں جذبات کا اظہار کرنے والا سب سے اہم عضو آنکھ ہے ۔ اور شخصیت کے بنیادی رجحانات زیادہ تر چہرے سے ظاہر ہوتے ہیں ۔ اس بات کو کچھ دیر بھی تو نہیں ہوئی تقریباً ڈیڑھ سال ۔

پھر وہ واقعہ ظہور میں آیا جس نے میرے نقطۂ نظر کو بدل دیا ۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ آنکھ سے زیادہ جھوٹ بولنے کی صلاحیت اور کسی عضو میں نہیں ۔ اظہار تو وہ کرتی ہے ۔ مگر بسا اوقات یہ اظہار محض دکھاوے کا ہوتا ہے ۔ اس کے برعکس گونگے ہاتھ شخصیت کے اظہار سے بھیگے بھیگے رہتے ہیں ۔ خلوص بھرا اظہار ۔ ان کے خم میں پھیلاؤ میں ، شطحی جلد میں، اور بناوٹ میں شخصیت کا مدھم دیا جلتا رہتا ہے ۔"

"اوہ" انور مسکرا کر بولا ۔ "آرٹسٹ ہونے کے علاوہ تم تو شاعر بھی بن گئے جمیل ۔"

"نہ جانے ان ہاتھوں نے مجھے کیا کیا بنا دیا ہے ۔" عصمی نے جواب دیا ۔

"آرٹسٹ تو تم پہلے بھی تھے ۔" انور نے کہا ۔

عصمی مسکراتے ہوئے بولا ۔ "آرٹسٹ ہونا ایک کیفیت نہیں بلکہ عمل ہے ۔ جس میں ارتقا کے منازل ہوتے ہیں ۔ اس زمانے میں مجھے صرف خطوط سے دلچسپی تھی ۔ میرے لئے شخصیتیں اور چیزیں مختلف اشکال کی حیثیت رکھتی تھیں ۔ حسن میرے نزدیک ایک رنگدار پیمانہ تھا ، جام نہیں ، رعنائی محض پیکر

تھی ۔"

"تعجب کی بات ہے ۔" انور نے کہا ۔ "اتنی سی بات نے تمہارا نقطۂ نظر بدل دیا ۔"

"ہاں" عصمی بولا ۔ "کس قدر تعجب کی بات ہے ۔" اور پھر چپ چاپ بیٹھا انگیٹھی میں جلتے ہوئے شعلوں کو گھورنے لگا ۔

"نہ جانے زیب کہاں چلی گئی ہے ۔ زیب ! انور نے باآواز بلند اسے پکارا ۔

"ابھی آئی ۔۔۔" اندر سے نسائیت سے بھیگی ہوئی آواز آئی جسے سن کر عصمی چونک پڑا ۔

"بھئی چائے لاؤ نا ۔ تم سے ملنے بھائی آیا ہے ۔" انور باآواز بلند چلایا ۔

"صرف دس منٹ" وہ بولی ۔ اس کی آواز میں عجیب لوچ تھا ۔

"نہ جانے عورتیں نہانے میں اتنی دیر کیوں لگاتی ہیں ۔" انور نے کہا ۔

"اسے معلوم نہیں کہ جمیل آیا ہے ورنہ ممکن ہے وہ ادھ نہائی بھاگ آتی ۔ اسے تم سے ملنے کا بے حد شوق ہے ۔ میں نے تمہاری باتیں اسے بتائی ہیں ۔ ہم تو بلکہ بیاہ کے دن بھی تمہارا انتظار کرتے رہے ۔ تمہیں خط لکھا تھا ۔ لیکن تم نہ آئے ۔ میں نے زیادہ زور نہ دیا تھا ۔ میں نے کہا شاید تم بھی آنا پسند نہ کرو ۔"

"کیوں" عصمی نے پوچھا ۔

"ہائیں تمہیں معلوم نہیں ؟" وہ مسکرایا۔ "میری شادی میں کوئی عزیز شریک نہ ہوا تھا ۔ انہیں میرے زیب سے شادی کرنے پر اعتراض تھا ، ایک تو وہ اپنی برادری میں سے نہیں، دوسرے وہ مہاجر لوگ تھے ۔"

"اس میں کیا عیب ہے ؟"

"عیب تو کوئی نہیں" وہ بولا ۔ "ویسے تو بڑے خاندان سے ہیں ۔ لیکن پاکستان آتے ہوئے راستے میں باپ اور بھائی دونوں ہی لقمۂ اجل ہوگئے ۔ یہاں پہنچے تو ماں کے سوا اور کوئی تھا نہیں۔زیب پڑھی لکھی تو ہے گو زیادہ نہیں صرف دس جماعتیں ۔ ماں نے لڑکی کا بڑا خیال رکھا ۔ بڑی مشکل سے ایک اچھی نوکری

حاصل کی تاکہ عزت سے گزارہ ہو سکے ۔ لیکن نوکری کرنے پر اسے معلوم ہوگیا کہ راست روی سے کام نہیں چلتا ۔ ان دنوں ان سے میری واقفیت ہوگئی ۔ وہ مجھے پسند آگئی ۔ اس لئے میں نے اس کے ساتھ نکاح پڑھا لیا ۔"

"اوہ یہ بات ہے ۔" جمیل مسکرایا ۔ "یہیں لاہور میں رہا کرتی تھیں وہ ان دنوں ۔"

"ہاں ہاں یہیں ۔" انور بولا ۔

"کس جگہ ؟" عصمی نے پوچھا ۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں" انور بولا ۔ "یہیں کہیں نئے محلے کے قریب ۔ تم جانتے ہو ایسے حالات میں لوگ کسی کو گھر کا پتہ نہیں دیا کرتے اور محلّے میں بڑی وضع داری سے رہتے ہیں ۔ اور پھر وہ تو وضع داری کے بے حد قائل ہیں ۔"

"ٹھیک" عصمی نے کہا ۔

"زیب سے نہ کہنا ۔" انور بولا ۔ "بات اشارتاً بھی ہوگئی تو وہ سمجھ جائے گی ۔ بے حد ذہین ہے وہ ۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ کیا ہے ۔ بس دیکھ لینا ۔ بلکہ مجھے بتانا کہ میں نے چناؤ میں غلطی تو نہیں کی ۔ تم تو ہاتھ دیکھ کر ہی بتا سکو گے ۔"

وہ دونوں ہنس پڑے ۔

"یہی تو مصیبت ہے ۔" عصمی چلایا ۔ "وہ علم جو حسیات کے ذریعے حاصل ہوتا ہے ۔ انسان کے بند بند میں رچ جاتا ہے ۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ انسان کو اور بھی گونگا چھوڑ جاتا ہے اسے محسوس کیا جا سکتا ہے ۔ بیان نہیں کیا جا سکتا ۔ "تو کیا ۔ " انور چلایا ۔ "یہ فلسفہ ہمیں اس واقعہ سے محروم رکھنے کے لئے سنایا جا رہا ہے ۔ میں تو چاہتا تھا کہ زیب کے آنے پر تم ہمیں اپنی ہاتھ بیتی سناؤ ۔"

"نہیں نہیں"۔ عصمی نے کہا ۔ "یہ بھابھی کے سامنے سنانے کے قابل نہیں ۔"

"نہیں بھئی" انور بڑبڑایا ۔ "وہ ایسی کہنہ خیال نہیں ۔"

"یہ بات نہیں" عصمی نے کہا۔ "مجھے یہ بات سناتے ہوئے شرم محسوس ہوگی۔ اس کے علاوہ واقعہ درحقیقت بے حد معمولی سا واقعہ ہے۔ میرا مطلب ہے خارجی طور پر اس کی چنداں اہمیت نہیں ۔۔۔۔ تقریباً ڈیڑھ سال کی بات ہے۔" عصمی شعلوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ان دنوں میرا مکان شہر کی ایک بند گلی میں تھا۔ یہ گلی کافی فراخ تھی۔ لیکن اس میں صرف چار مکان تھے۔ نئی طرز کے بنے ہوئے کشادہ اور خوبصورت، مکان کی بند نکڑ پر میرا مکان تھا۔ جس پر جلی حروف میں لکھا ہوا سائن بورڈ تھا۔ عصمی۔"

"عصمی؟" انور نے حیرانی سے دہرایا۔ "عجیب سا نام ہے۔"

"ہاں" عصمی مسکرایا۔ "یہاں سبھی لوگ مجھے عصمی کہتے ہیں۔ وہ اس بات سے واقف نہیں کہ میرا نام جمیل ہے۔ دراصل ابتدا میں میں نے خود یہ نام اپنے لئے تجویز کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ایک فن کار کا نام انوکھا اور آرٹسٹک ہونا چاہئیے۔"

"انوکھا تو بے حد ہے۔" انور نے کہا۔ "آرٹسٹک کے متعلق مجھے معلوم نہیں۔"

"گلی کے تمام مکانات کی کھڑکیوں پر جالی لگی ہوئی تھی۔ تم نے میرا مکان نہیں دیکھا۔" عصمی نے قصہ بیان کرنا شروع کیا۔

"اونہوں" انور نے سر ہلایا۔

"دیکھتے بھی کیسے" عصمی مسکراتے ہوئے بولا۔ "اس زمانے میں تم ہم سے گویا قطعی طور پر الگ ہوگئے تھے۔"

"ہاں" انور مسکرایا "ان دنوں تمہیں ہاتھ کا روگ لگا تھا اور مجھے نین روگ۔ پھر رہنے کے لئے مجھے مکان بھی ماڈل ٹاؤن میں ملا تھا۔ سارا دن شام کے انتظار میں کٹتا تھا۔ شام کو وہ آجاتیں، اور تم جانتے ہو۔ ہاں تو پھر تم وہ واقعہ سنا رہے تھے نا۔"

"ہاں" عصمی بولا۔ "وہ کمرا جو گلی میں کھلتا تھا۔ اسے میں نے کام کرنے کا کمرا بنا رکھا تھا۔ پہلے کئی ایک دن تو میں اس کمرے کو سجانے میں لگا رہا۔ دیواروں پر تصاویر لگاتا رہا۔ ادھر "خالق" جو رنگوں سے اپنے جہان کی

تحقیق میں مصروف تھا ۔ اس طرف "کائنات" جو وسیع پھیلاؤ میں عورت کی طرح جمالی انداز سے پڑی تھی ۔ دائیں ہاتھ "مستی کا دیوتا" بشاشتے ۔ اس کے سامنے آصفی کی "امید اور مایوسی" ڈسک کے پاس ہی "وینس ڈی میلو" کا مجسمہ تھا ۔ اس کے پاس مہاتمابدھ اور پرے "کیوپڈ" اور "سائکی کی اوّلیں بیداری ۔"

"چھ سات دن کے بعد ڈسک پر بیٹھے ہوئے دفعتاً مجھے خیال آیا کہ سامنے مکان کی کھڑکیاں ہمیشہ بند رہتی ہیں ۔ شاید یہ مکان غیر آباد ہے ۔ میں نے سوچا ۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ کہ لاہور میں کوئی مکان غیر آباد رہے ۔ دفعتاً آواز آئی ۔ ٹپ ٹپ ٹپ میں نے غور سے باہر کی طرف دیکھا ۔ اسی مکان کے آہنی پرنالے سے پانی کی بوندیں گر رہی تھیں ۔ ٹپ ٹپ ٹپ بوندوں کی آواز اس چھائی ہوئی خاموشی کو اور بھی بھیانک بنانے لگی ۔ اِس مقام پر جہاں آہنی پرنالہ لگا ہوا تھا ۔ دیوار دو دو فٹ تک بھیگی ہوئی تھی ۔ گلی کے فرش پر بھی دور تک نمی کے اثرات واضح تھے ۔ دیوار پر کائی جمی ہوئی تھی جو اس ٹپ ٹپ ٹپ کے تسلسل کی مظہر تھی ۔ میں نے پھر غور سے مکان کا جائزہ لیا ۔ صدر دروازہ بند تھا ۔ کھڑکیاں تمام کی تمام مقفل تھیں ۔ اوپر بالکونی پر چقیں پڑی تھیں ۔ جن کے پیچھے تمام دروازے صاف طور پر بند دکھائی دے رہے تھے ۔ مکان پر موت کا سا سکوت چھایا ہوا تھا ۔ اور وہ مسلسل ٹپ ٹپ اس سکوت کو عجیب سی گہرائی اور اسرار بخش رہی تھی ۔ اس کے بعد جب بھی میں ڈسک پر بیٹھ کر کام کرنا شروع کرتا تو وہ ٹپ ٹپ کی آواز بتدریج بلند ہوتی جاتی ۔ اور بھی بلند ، حتیٰ کہ میں محسوس کرنے لگتا کہ کوئی پر اسرار ہتھوڑا اٹھائے میرے سر میں کیل ٹھونک رہا ہے ۔ میں ہی نہیں بلکہ کمرے میں ٹنگے ہوئے تمام نقوش گویا اس پر اسرار ٹپ ٹپ سے متاثر ہو رہے تھے ۔ "سائکی کی اوّلین بیداری" میں بے نام سی تلخی واضح ہوتی جارہی تھی ۔ "امید" کی تڑپ اور بے قراری تو بے حد نمایاں تھی ۔ "مستی کے دیوتا" کا نشہ ترشی کے اثرات لئے ہوئے تھا ۔ کمرے کے جملہ نقوش میں اضطراب پیدا ہوچکا تھا ۔ صرف مہاتما بدھ ویسے کے ویسے گیان دھیان میں مصروف تھے اور شریر "کیوپڈ" زیر لبی مسکراہٹ سے مجھے دیکھ رہا تھا ۔ جیسے کلی پتنگے کو دُور سے دیکھ کر امید بھرے انداز سے مسکراتی

ہے۔"

"بہت خوب، بہت خوب" انور چلّایا۔ "خدا کی قسم بے حد دلچسپ ہے۔"

"ایک ہی دن میں مَیں تو پاگل سا ہوگیا۔ آخر تنگ آکر میں نے کام وام بند کردیا۔ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس مکان کو گھورنے میں وقت بسر کرنے لگا۔"

"شام کے وقت گلی میں ایک لڑکا آیا۔ اس کی عمر نو سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ بدن پر ایک موٹا سا کرتا اور نیچے گاڑھے کی چادر۔ سر اور پاؤں دونوں ننگے۔ وہ چپ چاپ اس مکان کے صدر دروازے پر کھڑا ہوگیا۔ نہ تو اس نے آواز دی اور نہ دروازہ کھٹکھٹایا۔ دفعتاً دروازے کا ایک پٹ آپ ہی کھل گیا۔ ڈیوڑھی کی جگہ ایک پتلی سی گلی بنی ہوئی تھی جس کے پرلے سرے پر موٹے کپڑے کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ لڑکا چپ چاپ اندر داخل ہوگیا۔ اور پھر وہ پٹ آپ ہی آپ بند ہوگیا۔ نہ جانے اس دروازے کے پیچھے سپرنگ لگے ہوئے تھے جو بجلی کا بٹن دبانے سے خود بخود حرکت میں آتے تھے یا کوئی سم سم تھا جو کسی طلسم کے زیرِ اثر کھلتا اور بند ہوتا تھا، اس مسلسل ٹپ ٹپ کے علاوہ یہ ایک تازہ اسرار تھا۔"

"مختصر یہ کہ چار پانچ دن میں نے اس مکان کی طرف گھورنے میں بسر کئے۔ لیکن بے فائدہ بلکہ اسرار کا احساس اور بھی بڑھ گیا اور میری وحشت روز بروز ترقی کرتی گئی۔ دن میں چار پانچ مرتبہ وہ لڑکا صدر دروازے سے باہر نکلتا اور کچھ دیر کے بعد واپس اندر چلا جاتا۔ اس کے باہر نکلنے سے پہلے دروازے کا ایک پٹ کھل جاتا اور پھر آپ ہی بند ہو جاتا۔ اسی طرح جب وہ واپس آتا تو جونہی دروازے کے پاس پہنچتا دروازہ آپ ہی آپ کھل جاتا اور اس کے اندر داخل ہونے پر خود بخود بند ہو جاتا۔"

"ایک روز مجھے اپنی اس دیوانگی پر بے حد طیش آیا۔ رات کے دس بجے ہوں گے۔ اس وقت بھی کوٹھے پر لیٹے ہوئے میرے کان اس مکان کی طرف لگے ہوئے تھے۔ میں یہ سننے کی کوشش کر رہا تھا کہ ممکن ہے کوٹھے سے کوئی

آواز آئے ۔ مگر ادھر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی ۔ دیوانگی نہیں تو اور کیا تھا ۔ صبح شام ایک بند مکان کی طرف آنکھیں اور کان لگائے بیٹھے رہنا ۔ نہ جانے شہر میں کتنے مکان ایسے ہیں جہاں ویرانی برستی ہے ۔ اور جن کے پرنالوں سے ٹپ ٹپ کی آواز آتی ہے ۔ ایک عام بے کیف مکان کو خواہ مخواہ کا اسرار بخش دینا اور گرتے ہوئے قطروں کی ٹپ ٹپ پر اپنی زندگی حرام کر لینا ۔۔ غصے سے میرا سر کھولنے لگا اور میں نے تہیہ کر لیا کہ آئندہ سے میں ڈسک پر بیٹھ کر پوری توجہ سے کام کیا کروں گا ۔ ٹپ ٹپ ہوتا ہے تو پڑا ہو ۔

اگلی صبح سویرے سے ہی میری آنکھ کھل گئی ۔ اور کام کرنے کے ارادے کو عملی صورت دینے کے لئے خلاف معمول میں صبح سویرے ہی ڈسک پر جا بیٹھا اور کام میں مشغول ہوگیا ۔

دفعتاً قریب ہی چی اس اس ۔۔۔۔۔۔ ٹھک سی آواز سنائی دی ۔ جیسے کوئی دروازہ کھلا ہو ۔ میں نے بے ساختہ مڑ کر اُدھر دیکھا تمام دروازے اور کھڑکیاں بند پڑے تھے ۔ نہ جانے کیسی آواز تھی ۔ دو ایک ساعت کے لئے میں حیران بیٹھا رہا ۔ ٹک ، ٹک ، ٹک، کوئی چل رہا تھا جیسے قریب آرہا ہو اور قریب ، پھر آواز رک گئی ۔ ٹھک ! جیسے کوئی دریچہ کھلا ۔ جالی کی وجہ سے کھڑکیاں دکھائی نہ دیتی تھیں ۔ اس لئے میں حیرانی سے ادھر ادھر دیکھنے میں لگا رہا ۔

"دفعتاً سامنے کھڑکی کے اندھیرے میں ایک چمک سی ابھری اور پھر دو حصّوں میں منقسم ہوکر دونوں پہلوؤں کی طرف محراب سی بناتی ہوئی گم ہوگئی ۔ پھر ایک گلابی سی چیز معلّق ہونے لگی اور ۔۔۔ اور ایک ہاتھ جالی میں چمکا ۔ جیسے وہ میدے اور حنا کی آمیزش سے بنا ہو ۔۔۔ اُف وہ ہاتھ ۔۔۔۔۔ میں تمہیں کیا بتاؤں ۔ وہ ہاتھ کیا تھا ۔ صرف یہی نہیں کہ کھڑکی میں ایک نور کا چشمہ ابل رہا تھا ۔ یا انگلیوں کے خطوط میں بلا کی مناسبت اور ترتیب تھی ۔ بلکہ ایسا محسوس ہو رہا تھا مجھے جیسے اس ہاتھ میں ایک رنگین دل دھڑک رہا ہو ۔ جذبات سے بھیگا ہوا زندگی کے تاثر سے بھیگا ہوا ، دل ۔ انگلیوں کی بناوٹ میں فنی حس کا اشارہ نمایاں تھا ۔ پوروں میں ذہانت اور ذوق جمیل واضح تھے ۔ انگلیوں کی درزیں فراخ دلی کی مظہر تھیں ۔ ان کی لچک مقبولیت کی صلاحیت کی غماز تھی اور گدا سی ہتھیلی

میں گویا گداز و گرم دل دھڑک رہا تھا۔" عصمی خاموش ہوگیا۔
انگیٹھی کے شعلوں کے ساتھ ساتھ عصمی کی آنکھوں میں چمک لہرا رہی تھی۔ جیسے وہ ان شعلوں میں لپکتی ہوئی انگلیاں دیکھ رہا ہو۔
"خوب تو تمہیں پامسٹری سے بھی دل چسپی ہے۔" انور چلایا۔
"نہیں نہیں" عصمی چونک کر بولا۔ "پامسٹری سے میں قطعی واقف نہیں۔ یہ تو محض مشاہدے کی باتیں ہیں جو میں نے ہاتھوں کو دیکھ دیکھ کر اخذ کی ہیں۔ درحقیقت یہ واقعہ بذاتِ خود اس قدر عظیم نہیں۔ لیکن اس کے نتائج دُوررس تھے۔ اس واقعہ نے گویا میری روح کے خوابیدہ نغموں کو چھیڑ دیا اور میرے احساسات میں نئی حسیات بیدار کر دیں۔۔۔۔ اس گلابی ہاتھ نے گویا میری روح کے تاروں کو چھو دیا۔۔۔۔ پھر وہ ہاتھ جالی کے اندھیرے میں گم ہوگیا۔ ٹک ٹک ٹک کوئی جا رہا تھا۔۔۔۔ ٹھک! مخفی دروازہ بند ہوگیا۔
اس روز سارا دن میں دیوانہ وار کھڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔ ہر آہٹ پر چونک پڑتا۔۔۔۔ اور کھڑکیوں کی جالی کی طرف دیکھتا۔ مگر بیکار۔ ٹپ ٹپ ٹپ پرنالے سے گرتے ہوئے قطرات گویا میرا مذاق اڑا رہے تھے۔
اس کے بعد روز میں علی الصبح جاگ کر اپنے کمرے میں جا بیٹھتا۔ کچھ دیر کے بعد چراوں۔۔۔۔ ٹھک! کوئی مخفی دروازہ کھلتا۔ ٹک ٹک ٹک قدموں کی آواز آتی۔۔۔ اور جالی کے اندھیرے میں بجلی سی، قوس بناتی ہوئی لہراتی اور پھر ایک حسین و جمیل ہاتھ جالی میں آویزاں ہو جاتا۔ ہر مرتبہ وہ ایک انوکھے انداز سے معلق ہوتا تھا اور ہر چند لمحات کے بعد ہلکی سی جالی حرکت سے ایک نیا انداز قیام پیش کر دیتا۔ پھر ایک نئی جالی حرکت کے بعد ایک جدید روپ میں ساکن ہو جاتا۔ کبھی انگلیاں یوں لٹک جاتیں جیسے کوئی برہا میں بال بکھیرے کھڑی ہو۔ کبھی وہ یوں اوپر کی طرف اٹھتیں جیسے شعلے لہرا رہے ہوں کبھی وہ پھول کی لانبی پتیوں کی طرح کٹورہ سی کھل جاتیں۔ کبھی بید مجنوں کی طرح جھولنے لگتیں۔ کبھی وہ قوس بنا کر اوپر کی طرف اُٹھتا۔ اور ایسے محسوس ہوتا جیسے کسی نے کُن کہہ دیا ہو۔ اک جہاں رنگ و بو آباد ہو جاتا۔ میرے دل میں امید بھرا اضطراب پیدا ہو جاتا۔ لیکن جب وہ قوس بناتے ہوئے نیچے کی طرف گرتا تو کنول مرجھا کر

گر پڑتے ۔ رنگینیاں ایک دھندلکے میں غروب ہو جاتیں ۔ دل مایوسی سے بھر جاتا اور دور دور ایسے سنائی دیتا جیسے کسی نے بربا کا راگ چھیڑ دیا ہو ۔۔ گویا ان ہاتھوں میں زندگی اور موت کی تاریں تھیں ۔ گویا زندگی ان ہاتھوں میں کھیل رہی تھی ۔"

"پھر دفعتاً وہ ہاتھ نظر سے اوجھل ہو جاتا اور کھڑکی کی روح قفس عنصری سے پرواز کر جاتی ۔ یا جیسے کسی آنکھ سے زندگی کی روشنی گل ہو جاتی ۔ ٹک ٹک ٹک ۔۔۔۔ چراوں ، ٹھک ، اور پھر وہی ہو کا عالم اور وہی ٹپ، ٹپ، ٹپ ۔"

"پھر جب مجھے ہوش آتا اور کمرے میں ٹنگے ہوئے نقوش کی طرف دیکھتا تو وہ سب دھندلائے ہوتے اور دیر تک اس دھندلکے سے مخلصی پانے کے لئے جدوجہد میں کھوئے رہتے آخر جب مدھم سے نقوش ابھرتے تو میں دیکھتا کہ "امید" پر مایوسی چھا رہی ہے اور نشے کے دیوتا پر مردنی ، وینس آف میلو اپنے کٹے ہوئے ہاتھ پر آنسو بہا رہی ہوتی ، کائنات خالق کی طرف مایوس نگاہوں سے تک رہی ہوتی ۔ لیکن وہ شیطان کیوپڈ ۔۔۔ میرا جی چاہتا تھا اُسے اٹھا کر باہر پھینک دوں ۔ پلاسٹر کے اس ننھے منے بچے کی اتنی جسارت !! ۔۔۔۔ میرا مطلب ہے ۔۔۔۔" عصمی نے مسکرا کر انور کی طرف دیکھا ۔

"میں اس بدمعاش ننھے منّے کی شرارت سے واقف ہوں ۔ اچھی طرح سے واقف ہوں ، ۔۔۔۔۔ پھر ۔۔"

""تو صاحب" عصمی نے بیان کرنا شروع کیا ۔ "مختصر یہ کہ اس رنگین ہاتھ نے میری زندگی حرام کر رکھی تھی ۔ مجھے زندگی عطا کر رکھی تھی ۔ اس نے میری کام کرنے کی اہلیت سلب کر رکھی تھی اور مجھ میں آرٹ کی انوکھی اور تازہ صلاحیتیں بیدار کر رہا تھا ۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اپنے پرانے نقوش حرف غلط کی طرح مٹا دوں ۔ وہ "خالق" جسے میں ان دنوں مکمل کر رہا تھا ۔ وہ تو بالکل میرے دل سے اتر گیا تھا ۔ بلکہ اب اکثر مجھے خیال آتا ہے کہ وہ واقعہ صرف اسی لئے پیش آیا تھا کہ فطرت کو مجھے خالق کا بہتر تصور دینا مقصود تھا ۔ ہیولے کے دھندلکے میں ایک رنگین اور منور ہاتھ ۔"

"کبھی کبھی بیٹھے بیٹھائے اس ہاتھ کی جمیل حرکات اور حسین انداز کا خیال کرتے ہوئے مجھے شبہ ہوتا کہ وہ حرکات بے مقصد نہ تھیں ۔ بلکہ شاید کوئی خالق ان جمالی حرکات کے ذریعے نرت کے انداز میں کائنات کی تخلیق کا راز سمجھا رہا تھا ۔ یا جیسے کوئی کتھا کلی کا فنکار مخصوص "مدھرا" کی مدد سے کوئی کتھا سنا رہا تھا جس کا مرکزی خیال بنیادی حقائق سے متعلق تھا ۔ کیونکہ حرکات کے جمالی ہونے کے باوجود ان میں ایک ان جانی گہرائی محسوس ہوتی تھی ۔"

"تو صاحب" عصمی نے آہ بھر کر کہا ۔ "کتھا کلی کا فن کار فسانہ کہتا رہا ۔ اور میں اسے سنتا رہا ۔ اور بن سمجھے سمجھتا رہا ۔ اگرچہ میرا ذہن اس کے حسین مدھرا کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہو جاتا تھا کہ مجھے اپنی خبر نہ رہتی ۔ مگر میری حیات میں عجیب سی بیداریاں پیدا ہو جاتیں اور میرے دل میں عجیب انوکھی دھڑکنیں بیدار ہوتیں ۔"

"پھر دفعتاً مجھے سوجھی اور میں نے ایک کاغذ پر خونیں دل کی تصویر بنا کر رکھ لی تاکہ جب کھڑکی میں وہ رنگین ہاتھ معلق ہو تو میری کھڑکی میں دل دھڑکتا ہوا دکھائی دے ۔ اس سے میرا کوئی خاص مقصد نہ تھا ۔ تم جانتے ہو جذبات کا اظہار بذاتِ خود ایک مسرت ہے ۔ بے لاگ بے پایاں مسرت ۔"

اگلے دن جب وہ ہاتھ نمودار ہوا تو میں نے جھٹ دل کی تصویر اپنی کھڑکی میں ٹانگ دی ۔ دفعتاً کھڑکی کے دھندلکے میں جنبش ہوئی اور ایک کی بجائے دونوں ہاتھ معلق ہوگئے ۔

پتلی لمبی انگلیاں اوپر کو ابھریں اور ایک دلفریب لچک سے جھک کر محراب کی شکل اختیار کر گئیں ۔ پھر ایک لمبی سی انگلی اٹھی ۔۔۔ ہائیں ! دفعتاً مجھے خیال آیا اور میرا دل دھڑکنے لگا ۔ ۔۔۔۔۔ تیر کمان ! تیر کھڑکی میں آویزاں دل کی طرف جھک رہا تھا ۔ وہ پہلا دن تھا ۔ جب اس ہاتھ کی حرکات جمالی ہونے کے علاوہ اظہاری بھی تھیں ۔"

"اس کے بعد روز بروز وہ حرکات پُر معنی اور پیامی ہوتی گئیں ۔ اور انہوں نے گویا میری زندگی پر خاموش مگر جامع تبصرہ کرنا شروع کر دیا ۔ اب وہ کھڑکی کے دھندلکے تک محدود نہ رہا تھا ، بلکہ اس کا وجود اس دو منزلہ مکان پر یوں چھا

گیا تھا جیسے اس نے زمان و مکان پر مکمل قدرت حاصل کرلی ہو ۔ ابھی وہ جالی دار کھڑکی کے اندھیرے کو پُر نور کرتا تو ابھی صدر دروازے سے نکل کر گلی کی شفاف روشنی کو دھندلا دیتا ۔ پھر وہ اوپر چوبارے میں سے نکل کر چق کو ایک انداز سے تھام لیتا اور جلد ہی منڈیر سے ابھر کر فضا کو ایک انوکھا مفہوم بخش دیتا ۔ پھر تو مجھے ایسے محسوس ہونے لگا کہ وہ ویران کھڑکیاں درحقیقت دُور رس آنکھیں ہیں ۔ کیونکہ میری کوئی حرکت بھی ان دیکھی نہ رہتی تھی ۔ کوئی بات پوشیدہ نہ رہتی تھی ۔ ہر واقعہ کے بعد وہ ہاتھ حرکت میں آجاتے اور نرت کی زبان میں اس پر تبصرہ کرتے اور میرے ماحول ، میرے دوست ، ساتھی اور عام ملاقاتیوں پر گونگے مگر جمیل انداز میں اپنی رائے پیش کردیتے ۔

"مثلاً ایک روز میجر حسن مجھ سے ملنے کے لئے آگیا ، میجر حسن کو تو تم جانتے ہی ہو ۔ وہی دوہرے جسم کا لمبا تڑنگا جوان جو ہمیں کافی ہاؤس میں ملا تھا۔ بہت پڑھا لکھا آدمی ہے ۔ لیکن اس کے باوجود اس کی "انا" گویا ہر وقت اس کے سر پر سوار رہتی ہے ۔ اور گفتگو کے دوران میں تو وہ اپنی ذات کا بھنور بنا کر اس میں ڈبکیاں کھاتا رہتا ہے ۔ میری کتاب ، میرا لباس ، میرا افسر، اس کی کوئی بات میں اور میرا سے خالی نہیں ہوتی ۔"

"تو صاحب اس روز وہ مسلسل دو گھنٹے تک اپنے قصے سناتا رہا اس دوران میں میں چوری چوری ان جالی دار کھڑکیوں کی طرف دیکھتا رہا ۔ لیکن مجھے کچھ دکھائی نہ دیا ۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے اشارتاً بات کی کھڑکی کی طرف منہ کرکے عظیم سے کہا ۔ عظیم میرا شاگرد تھا اور اس وقت ایک کونے میں بیٹھا کام کر رہا تھا ، میں نے کہا بہت بڑا آدمی تھا یہ میجر ۔ بہت بڑا ، بے حد پڑھا لکھا اور قابل ۔۔۔ تمہاری کیا رائے ہے ؟ درحقیقت عظیم سے بات ختم نہ کی تھی کہ صدر دروازہ کھلا ۔ وہ ہاتھ آہستہ آہستہ باہر نکلنا شروع ہوا ۔ انگشت شہادت اور انگوٹھا ملے ہوئے تھے ۔ گویا ، ان میں کچھ پکڑا ہوا ہو اور باقی انگلیاں یوں پیچھے کی طرف سمٹی ہوئی تھیں ۔ ۔ جیسے کراہت سے مڑی ہوئی ہوں ۔ پھر وہ بازو اندر چلا گیا ۔۔۔ دروازے کی درز میں کوئی دونوں ہاتھ جھاڑ رہا تھا ۔"

"میجر حسن کے متعلق اس کی رائے کس قدر جامع اور مکمل تھی اور پھر اس

کا انوکھا اندازِ اظہار ۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ اس پلپلے کیڑے کو پھینکنے کے اشارے نے مجھے کس قدر متاثر کیا ۔ نہ جانے کب تک میں اس کے تخیل کی پختگی اور اظہار کی رنگینی سے مبہوت بیٹھا رہا ۔ وہ پہلا دن تھا ۔ جب میں اس کی ذہانت کی بلندی سے مسحور ہو کر اسی کے وجود سے بے نیاز ہو گیا تھا ۔ اس بات سے غالباً وہ سیخ پا ہو گئی ۔ کیونکہ پھر جو مجھے ہوش آیا تو کھڑکی کے دھندلکے میں وہ ہاتھ گیان دھیان کا آسن دھارے قائم تھا ۔ میرے سوچ بچار میں کھو جانے پر کیسا واضح اور رنگین شکوہ تھا ۔ مسرت کے مارے میں جھومنے لگا ۔ لیکن بات بڑھانے کے لیے میں واقعی مہاتما بدھ کا سا گیان دھیان کا آسن جما کر بیٹھ گیا کہ دیکھوں اب وہ کیا کرتی ہے ۔ اور جانتے ہو اس نے کیا کیا ؟"

"کیا ؟" انور نے وفورِ شوق سے پوچھا ۔

"کھڑکی کے دھندلکے میں ایک زخمی کبوتر تڑپنے لگا ۔"

"واہ واہ واہ" انور چلّایا ۔ "حد ہے ذہانت کی ۔"

"ذہانت کی ہی نہیں ۔ وہاں تو ہر بات کی حد ہو رہی تھی ۔" عصمی چلایا ۔

"اس کے اس اشارے پر مجھ سے نہ رہا گیا ۔ لیکن خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے کوئی موزوں اشارہ سمجھ میں نہ آیا ۔ بصد مشکل میں نے دونوں ہاتھ یوں اٹھائے جیسے ملکہ کو تاج پہنا رہا ہوں ۔ لیکن ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ بات نہیں بنی ۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ گلی میں پھول والا آنکلا ۔ پھول والے ۔ پھول والے وہ چھوٹا لڑکا صدر دروازے سے باہر نکل کر چلانے لگا ۔ جب پھول والا دروازے کے قریب پہنچا تو لڑکا چپکے سے اندر گم ہو گیا اور دروازے کی درز سے ہاتھ نکل آیا ۔ ہار تھام کر وہ ہاتھ وہیں قائم رہا اور جب پھول والا چلا گیا تو دونوں ہاتھوں نے باہر نکل کر ہار کو یوں قوسی جنبش دی جیسے کسی کے گلے میں ڈالا جا رہا ہو ۔ خراجِ تحسین پیش کرنے کی آرزو سے میرا سر جھک گیا ۔"

"خوب ہے ، خوب ہے ۔" انور چلّایا ۔

"اب میں تمہیں کیا کیا بتاؤں ۔ اس کا ہر اشارہ مکمل اور موزوں ہوتا تھا اور اس کی رائے تعمیری تنقید سے بھرپور ہوتی تھی ۔ مثلاً ایک روز جب شفیق

میرے پاس بیٹھا تھا ۔ شفیق کو تم نہیں جانتے وہ میرا بڑا بے تکلف دوست ہے ۔ سرخ و سفید رنگ ، بھرا بھرا جسم اور نفیس اور رنگین مزاج ۔ اس وقت میں ڈسک پر بیٹھا تھا اور وہ دروازے میں کرسی پر دراز تھا اور ہم باتیں کر رہے تھے ۔ دفعتاً مجھے شرارت سوجھی ۔ میں نے بآواز بلند کہا ۔ سمجھ میں نہیں آتا لڑکیوں کو تو ایک نظر دیکھتے ہی تم پر مرمٹنا چاہئے ۔ تمہارا یہ سرخ و سپید رنگ ، یہ چوڑی چھاتی ۔ مضبوط شانے آخر تم میں کس بات کی کمی ہے ؟ کس بات کی کمی ہے ؟ میں نے ان کی کھڑکی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا ۔ معاً دروازے میں جنبش ہوئی ۔ اور بازو نے سیاہ جالی دار دوپٹہ تھامے باہر نکل کر یوں گولائی میں حرکت کی جیسے کسی کے سر پر دوپٹہ پہنا رہا ہو ۔ ہائیں ! مسرت اور تعجب سے میری چیخ نکل گئی ۔ تو کیا دوپٹہ کی کسر ہے ! شفیق شوق بھرے اضطراب سے مڑا ۔ مگر دروازہ بند ہو چکا تھا ۔ کس سے بات کر رہے تھے ۔ وہ چلایا ۔ ”خالق“ سے میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا ۔ ”نقادِ خالق“ سے ، میں نے جھوٹ موٹ تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔ اس کی پیشانی پر قطرے تیرنے لگے ۔ ٹپ ٹپ ٹپ پرنالے سے پانی کے گرتے ہوئے قطرے گویا اس پر فقرے کس رہے تھے ۔“

”بھئی واہ“ انور پیشانی کو پونچھتے ہوئے اور ہنستے ہوئے بولا ۔ ”تم نے تو اس ہاتھ کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے ۔

”الٹا اس ہاتھ نے مجھے زندۂ جاوید کر دیا ہے ۔“ عصمی نے ایک آہ بھری ۔

”تو کیا“ انور بولا ۔ ”اتنی گہری دوستی کے باوجود تم اس ہاتھ والی کے متعلق مزید کچھ نہ جان سکے ۔“

”نہیں“ عصمی نے آہ بھری ۔ ”اس ننھے لڑکے اور چنچل ہاتھ اور پانی کے گرتے قطرات کی ٹپ ٹپ کے سوا وہ مکان میرے لئے مکمل اسرار ہی رہا ۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟“ وہ بولا ۔

”معلوم نہیں ۔“ عصمی نے جواب دیا ۔ ”اگرچہ مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ اس مکان کا عقبی دروازہ بھی ہے جو پچھواڑے کی گلی میں کھلتا تھا ۔ لیکن میں

اس ہاتھ کے ساحرانہ اشارات میں اس قدر کھو چکا تھا کہ میں نے کبھی کسی بات کا خیال ہی نہ کیا کہ پچھلی گلی میں جاکر مکینوں کا اتا پتا دریافت کروں یا آنے جانے والوں پر نگاہ رکھوں ۔ بلکہ مجھے تو سارا دن ڈسک پر بیٹھ کر اس دھندلی کھڑکی کو دیکھنے سے فرصت نہ ملتی تھی ۔"

عصمی چپ ہوگیا اور کچھ دیر آگ کے شعلوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا ۔ پھر دفعتاً وہ لمبی آہ بھر کر بولا ۔ "پھر جلدی ہی وہ دن آگیا ۔ آخری دن ۔"

"اس روز دن کے تین بج گئے ۔ لیکن صدر دروازے یا کھڑکی میں کوئی چمک نہ لہرائی ۔ میں تو گھبرا گیا ، نہ جانے کیا بات ہے ۔ کہیں گئے ہوئے ہیں یا طبیعت ناساز ہے ۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ سنگار کی چیزیں بیچنے والا خوانچہ فروش آگیا ۔ اور بلا تکلف ان کے صدر دروازے کے سامنے بیٹھ گیا ۔ جلد ہی دروازے میں حرکت ہوئی اور ہاتھ نمایاں ہوگیا ۔

ہائیں میں تو حیران رہ گیا ۔ انگلیاں مڑی ہوئی تھیں ۔ ہتھیلی کھلی تھی اور کلائی جیسے کسی نے مروڑ کر چھوڑ دی ہو ۔ مہندی کی پڑیا تھامنے کے بعد وہ وہیں قائم رہا ۔ بلکہ خوانچے والے کے جانے کے بعد وہ اور بھی ڈھلک گیا ۔ پڑیا کھل گئی اور اس میں سے مہندی گرنے لگی ، گرتی رہی ۔ حتٰی کہ ہاتھ میں صرف کاغذ رہ گیا ۔ کچھ دیر کے بعد پھول والے سے ہار خریدنے کے لئے وہ نکلا اور ویسے ہی ٹوٹے ہوئے انداز میں وہیں لٹکتا رہا ۔ حالانکہ روز ہار خریدتے ہی وہ یوں حرکت کیا کرتا تھا ۔ جیسے ہار کسی کے گلے میں ڈال رہا ہو ۔ اس وقت دونوں ہاتھ باہر ہوتے تھے لیکن اس روز پھول تھامے ہوئے وہ یوں لٹک رہا تھا ۔ جیسے کفن سے باہر نکلا ہوا ہو ۔ پھر نہ جانے کیسے ہار کا تاگا ٹوٹ گیا اور پھول ایک ایک کر کے گرنے لگے ۔ ٹپ ٹپ ٹپ پرنالہ گویا رو رہا تھا ۔ پھول گر رہے تھے ۔"

"اگلے دن شام پڑگئی مگر مکان میں ذرا حرکت نہ ہوئی، نہ تو دروازہ کھلا اور نہ کوئی خوانچے والا وہاں ٹھہرا ، اس روز مجھے خواہ مخواہ کا غم گھیرے ہوئے تھا ایسے محسوس کر رہا تھا میں جیسے کچھ ہونے والا ہے ۔ ہائیں میرا دل گویا تھم گیا اور دفعتاً

میں نے محسوس کیا کہ اس روز پرنالے سے پانی کے قطرے بھی نہیں گر رہے تھے ۔ دیوانہ وار میں باہر کی طرف بھاگا ۔ صدر دروازے پر تالہ لگا دیکھ کر میں کلیجہ مسوس کر رہ گیا ۔" عصمی خاموش ہو گیا ۔ انور نے ایک لمبی آہ بھری ۔

اس وقت انور کا نوکر چائے کی ٹرے اٹھائے ہوئے داخل ہوا ۔ اس نے میز پر چائے کے برتن چن دئے لیکن وہ دونوں کسی گہرے تاثر میں ڈوبے ہوئے تھے ۔ انہیں اس کی آمد کا احساس ہی نہ ہوا ۔

"ہاں" عصمی لمبی آہ بھر کر بولا ۔" نہ جانے میں نے کتنے دن امید و بیم کی مدوجزر میں کاٹے لیکن روز بروز "امید" دھندلی پڑتی گئی اور "مایوسی" کی گرفت شدید ہوتی گئی "نشے کے دیوتا" کے خدوخال میں غم کی جھلک واضح ہو گئی تھی ۔ مہاتما بدھ کے گیان دھیان کے آسن میں "شانتی شانتی" کا سندیس واضح ہوتا گیا ۔ اور کیوپڈ کی نگاہوں میں شرارت کی بجائے اطمینان اور فتح کی چمک لہرانے لگی تھی ۔"

"پھر مایوس ہو کر میں گھر سے باہر نکل گیا ۔ اور دیوانہ وار گلیوں ، بازاروں باغوں اور چورستوں میں گھومنے لگا ۔ میری نگاہوں میں اشکال نہیں بلکہ ہاتھ تیرتے تھے ۔ ہاتھ سے ہاتھ ، جذبات سے بھیگے ہوئے ہاتھ ، خشک کھلے ہوئے ہاتھ، گرم اور نیم واہاتھ ، بھدی کھردری انگلیاں، مخروطی حساس انگلیاں، مضطرب انگلیاں، مخمور پورےں، بڑھتے ہوئے، کھنچتے ہوئے، لبھاتے ہوئے ہاتھ ، بھیگی ہوئی ہتھیلیاں ، لٹی ہوئی ، دبی ہوئی ، سوئی ہوئی ہتھیلیاں اور حساس خشک اور جھری دار جلد ۔ میری نگاہوں کے سامنے ہاتھوں کا ایک طوفان تھا اور میں اس میں ڈبکیاں کھا رہا تھا ۔"

"اوہ تم آگئیں ۔ "زیب" انور چونک کر بولا ۔

عصمی کو گویا کسی نے جھنجھوڑ کر جگادیا ۔

"یہ میرے بھائی جمیل ہیں تم تو انہیں جانتی ہی ہو ۔" انور نے زیب سے کہا ۔

"اسلام علیکم ۔" عصمی نے مڑ کر زیب کی طرف دیکھا ۔

زیب اُس کے پیچھے ہاتھ جیب میں ڈالے گویا سہمی ہوئی کھڑی تھی ۔ اس

کے کھلے بال شانوں پر لٹک رہے تھے۔

زیب نے آہستہ سے سر جھکا کر اس کے سلام کا جواب دیا۔

"واہ زیب" انور چلّایا۔ "تم نے تو کھو دیا۔"

زیب نے تعجب بھری نگاہ سے انور کی طرف دیکھا۔

"اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ تم نے کیا کھویا ہے۔" انور بولا۔ "ابھی ابھی جمیل اپنی ہاتھ بیتی سنا رہا تھا۔ کس قدر دلفریب واقعہ تھا۔ بیٹھ جاؤ نا۔"

"جمیل کے لئے چائے بھی بناؤ گی یا کھڑی منہ دیکھتی رہو گی ؟"

زیب مسکرا دی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

"اچھا جمیل تو کیا تمہیں وہ ہاتھ پھر کبھی دکھائی دیئے ؟"

عصمی نے سر نفی میں ہلایا اور شعلوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"سنا تم نے زیب جمیل کو کسی کے ہاتھوں سے عشق ہو گیا تھا۔"

"ہاتھوں سے ؟" وہ پیالی بناتے ہوئے بولی۔

"ہاں" وہ آہ بھر کر مسکرایا۔ "جمیل نے اس کے ہاتھوں کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا۔"

"اوہ" وہ دلفریب انداز میں ہنسی۔ "انہوں نے دیکھا نہیں یا اس نے دکھایا ہی نہیں" زیب نے کنکھیوں سے عصمی کی طرف دیکھتے ہوئے انور سے پوچھا۔

اس نے دکھایا ہی نہیں" انور نے جواب دیا۔

"بیچاری!" وہ جمیل کی طرف دیکھ کر آہستہ سے بولی۔

"اچھا جمیل یہ بتاؤ کہ اگر تم وہ ہاتھ ایک نظر دیکھ پاؤ تو کیا پہچان لو گے انہیں۔" انور نے پوچھا۔

"چائے پیجئے۔" زیب نے پیالی عصمی کی طرف بڑھائی۔

"پہچان لوں گا ؟" عصمی تڑپ کر بولا۔ "ان کے ہاتھوں کو نہ پہچانوں ۔۔۔۔ ان ہاتھوں کو، ان کی خوبصورتی، ان کی پاکیزگی ۔۔۔۔"

زیب کے ہاتھوں سے پیالی گر کر چور چور ہو گئی۔

○

سوپور کی کھڑکی

دفعتاً شاہ صاحب کے گول مٹول چہرے میں حیرت انگیز تبدیلی ہوئی ۔ ان کے ابھرے ابھرے ڈنلوپی گال یوں پچک گئے جیسے ان میں سے ہوا خارج ہوگئی ہو ۔ اور غروب شدہ آنکھیں از سرِ نو طلوع ہوگئیں ۔ چہرے کی گولائیاں ہموار ہوگئیں ۔ رنگ زرد ہوگیا ۔ گول بٹنوں کی سی آنکھیں ساکن ہوگئیں ۔ پھر وہ پُراسرار انداز میں میری طرف بڑھے ۔ چہرہ کلوز اپ میں آتا گیا ۔

"اونہوں" نادر صاحب" وہ بولے "السار میں نہ جانا ورنہ پچھتاؤ گے ۔ مظہر ایک مرتبہ وہاں گیا تھا ۔ صرف دو ایک مرتبہ اور پھر ، پھر وہ سوپور سے غائب ہوگیا اور آج تک ہمیں اس کی خبر نہیں ملی اچھا ہوا کہ وہ چلاگیا ورنہ ہمیں تو اس کی جان کے لالے پڑگئے تھے ۔ السار میں انسان نہیں رہتے ، اونہوں ۔" ایک ساعت کے لئے وہ رکے چہرے پر عجیب تاثر کھدا تھا ۔ گول آنکھیں جیسے بے جان ہوچکی تھیں ۔ مژگان سمٹ کر نہ جانے کہاں گم ہوچکی تھیں ۔ "میری طرف دیکھو" ۔ وہ بولے اور یوں رازدارانہ انداز میں کہنے لگے ۔ جیسے بہت بڑا راز فاش کر رہے ہوں "جنات کی سب سے بڑی نشانی جانتے ہو ۔ ان کی آنکھ گول ہوتی ہے ۔ گول اور وہ اسے جھپکتے نہیں ۔" یہ کہہ کر انہوں نے کرسی سے ٹیک لگالی اور اپنی گول بادامی آنکھیں مجھ پر مرکوز کر دیں ۔

شاہ صاحب کی وہ نگاہ وہ انداز دیکھ کر میں گھبرا گیا ۔ ایسے محسوس ہوا مجھے جیسے وہ مجھے آپ بیتی سنا رہے تھے ۔ اور اپنی مخصوص نشانی کا عملی طور پر اظہار کر رہے تھے ۔ دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ وہ ابھی قہقہہ مار کر ہنس دیں گے ۔ وہ سُرخ گال ابھریں گے، وہ گول آنکھیں جو آہنی پیچوں کی طرح مجھ میں دھنسی جا رہی تھیں ۔ ان گالوں میں غروب ہو جائیں گی ۔ اور پھر دفعتاً میرے سامنے وہ کرسی خالی پڑی ہو گی اور کمرے میں ان کا پُراسرار قہقہہ گونج رہا ہو گا ۔

گھبرا کر میں اٹھ بیٹھا۔ "اچھا تو میں چلتا ہوں۔ اجازت دیجئے۔"
"ہاں" وہ اپنی دھن میں کرسی سے اٹھ بیٹھے۔ "صرف یہی ایک نشانی ہے سمجھے نادر صاحب تم نے السار کے موجودہ مالک غفران کو نہیں دیکھا۔ تم نہیں جانتے، اس کی آنکھیں گول ہیں۔ قہوے کی پیالیوں کی طرح گول۔ نیلے طلسم سے لبریز پیالیاں جو ہر وقت کھلی رہتی ہیں جنہیں جھپکنے کی قوت نہیں۔ وہ تمہیں جذب کر لیتی ہیں۔ تمہاری قوتِ ارادی کو شل کر دیتی ہیں۔ اور تم گویا ان نیلی جھیلوں میں ڈوبے جاتے ہو۔ ڈوبے جاتے ہو۔ بلکہ ڈوبنے کی خواہش تمہارے اپنے دل سے ابھرتی ہے اور پھر السار سے غفران کا قہقہہ سنائی دیتا ہے۔ مدھم بھیانک قہقہہ۔ کوئی انسان اس قسم کا قہقہہ نہیں مار سکتا۔ اور وہ قہقہہ سن کر اس کی بیوی مغیرہ کراہتی ہے۔ سسکیاں لیتی ہے۔ وہ غفران سے ڈرتی ہے ــــــ کیونکہ وہ اِنسان نہیں۔ وہ جنات میں سے ہے۔ اور اپنی ہوس پوری کرنے کے لئے اس لڑکی مغیرہ کو یہاں اٹھا لایا ہے۔ اور دکھانے کے لئے اس نے انسان کا روپ دھار رکھا ہے اور وہ کھڑکی۔"

دفعتاً مجھ پر پھر وہی کیفیت طاری ہوگئی، وہی جو اس روز السار کی بغلی بند گلی میں مجھ پر طاری ہوئی تھی۔

نہ جانے میں السار کی بغلی بند گلی میں کیسے پہنچ گیا تھا، اگر میرا مقصد بیگم فیروز کے ہاں جانا تھا ــــــ لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ سوپور میں آتے ہی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ بیگم فیروز چند ایک دنوں کے لئے سوپور سے باہر گئی ہوئی ہے بیگم فیروز کے ہاں جانا ہوتا تو بھی بند گلی میں جانے کا سوال پیدا نہ ہوتا۔ بیگم فیروز کے مکان کا دروازہ تو سڑک پر ہے۔ گلی میں تو صرف کھڑکیاں کھلتی ہیں۔

بیگم فیروز کے ہاں میں کبھی کھڑکی کے راستے سے گیا بھی تو نہ تھا۔ پھر اس روز میں نے وہاں جانے کے لئے وہ نیا راستہ کیوں اختیار کیا۔ اور اس روز میری کیفیت بھی تو عجیب سی تھی۔ سر پر نیلا آسمان پھیلا ہوا تھا۔ نیچے السار کی نیلی دیوار اور گہری نیلی کھڑکیاں اور دروازے جیسے نیلا سمندر لہریں لے رہا ہو۔ جیسے میں ان اُٹھتی ہوئی نیلی لہروں میں ڈوبا جا رہا تھا۔

پھر دفعتاً اندر سے مغیرہ کی آواز سنائی دی ۔ "سارہ، سارہ دروازے بند کر دو ۔ اب کوئی نہیں آئے گا ۔ کوئی نہیں آئے گا ۔" نہ جانے اس کی آواز نے کیا جادو کردیا ۔ میں یوں تڑپ کر رک گیا ۔ جیسے مجھے سانپ نے سونگ لیا ہو ۔ معاً نیلا آسمان پھٹ گیا اور شنگرفی ناگ دیوتا نے پھن اٹھایا ۔ ایک رنگین قوس لپکی، ایک محراب ، ایک کھڑکی ـــــ اور وہ آواز "سارہ ، سارہ" جیسے صحرا کے لق و دق ویرانے میں کسی کارواں کی گھنٹیاں بج رہی ہوں ۔ جیسے یخ کے نیلے تودوں میں آگ کا ایک سنہری شعلہ ناچ رہا ہو ۔ جیسے دم گھونٹنے والے گھور اندھیرے میں ایک ننھی سی قندیل روشن ہوگئی ہو ۔ نیلے آسمان پر رنگین ہوائیاں چل رہی تھیں ۔ اشارے کر رہیں تھیں ۔ مجھے بلایا جا رہا تھا ۔ جیسے دور کوئی میرا منتظر تھا ۔ زندگی آپ مجھے بلا رہی تھی ۔ اس نیلے سمندر سے بچنے کے لئے وہ محرابی کھڑکی مجھے اشارے کررہی تھی ۔ ایک آتشی چپو میری ڈگمگاتی کشتی کی طرف بڑھا اور میرے جسم کے بند بند میں ایک رنگین دھنکی بجنے لگی ۔

نہ جانے اس وقت میری کیا حالت تھی ۔

اس بند گلی میں بیٹھا ہوا وہ پاگل فقیر قہقہہ مار کر ہنس پڑا ۔ اس کی کرخت آواز نے وہ طلسم توڑ دیا اور میں چونک پڑا ۔ اور یوں بھاگا جیسے میں نے جرم کیا ہو ۔

ممکن ہے السار کی عجیب و غریب داستان سنکر مجھے اس بغلی کھڑکی دیکھنے کا شوق پیدا ہوا ہو ۔ سوپور میں آئے مجھے دو دن ہوچکے تھے اور دو دن میں مَیں اس پراسرار کھڑکی کے متعلق سب کچھ سن چکا تھا ۔

یہ وہی سوپور تھا ۔ جس میں مَیں نے اپنا بچپن بسر کیا تھا ۔ جہاں عنفوان شباب میں مَیں اکثر آیا کرتا تھا ۔ لیکن جب سے میں نے فرخ آباد میں کاروبار شروع کیا تھا ۔ میں سوپور کے سحر سے آزاد ہوچکا تھا ۔ ویسے سوپور وہی سوپور تھا ۔ السار کے نئے مکینوں کی آمد کے علاوہ وہاں کوئی تبدیلی واقعہ نہیں ہوئی تھی ۔ اسی طرح دوکانوں میں چہ میگوئیاں ہوتیں ، ہونٹ رازدارانہ طور پر ہلتے ۔ بھویں پُراسرار اشارات کرنے کے لئے جنبشیں کرتیں ۔ آنکھوں میں فاتحانہ چمک

لہراتی ۔ پھر وہ بات چلتی چلتی ایک پراسرار انداز سے ایک دوکان سے دوسری دوکان تک دوسری سے تیسری تک، اور بالآخر گھروں میں سرگوشیاں ہوتیں ۔ باورچی خانے میں ماما سے کی ہوئی باتیں کھانے کے ساتھ ساتھ دسترخوان تک آپہنچتیں ۔ پنکھے کی ڈنڈی کے ساتھ ساتھ سرگوشیاں گھومتیں ، اور پھر کھڑکیاں کھلتیں "بہن سکینہ سنا تم نے ہائے بہن سکینہ میں تمہیں کیا بتاؤں" اور بہن سکینہ دونوں ہاتھوں سے ابھرتا ہوا سینہ تھامتی اور پھر جب رات کا اندھیرا چھا جاتا تو خاموشی کے پھیلے ہوئے آسمان پر مخملی سرگوشیوں کے تارے چمکتے ۔ محبت بھری آوازیں سنائی دیتیں ۔ "اور ثریا پیاری وہ کھڑکی ۔۔۔" اور ثریا، ساحرہ، سارہ کی رنگین انگلی بڑھ کر کسی کے ہونٹوں کو بند کردیتی ۔ اور پھر اس اندھیرے میں رنگ کی دھاریاں ناچتیں ۔

کسی زمانے میں مَیں بھی اسی سوپور کا رہنے والا تھا ۔ وہ سرگوشیاں مجھے بھی مشتعل کر دیتی تھیں اور وہ خونیں چھینٹے مجھے بھی رنگ دیتے تھے ۔ یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جب میں ذہنی طور پر سوپور کا ایک جزو تھا ۔ لیکن آٹھ سال ہوئے جب سے فرخ آباد میں مَیں نے کاروباری زندگی شروع کی تھی ۔ جب سے مَیں نے وہاں پنسلوں کی فیکٹری چالو کی تھی ۔ میں سوپور کے سحر سے آزاد ہوچکا تھا ۔ فرخ آباد میں لوگ اونچی آواز سے باتیں کرنے کے عادی ہیں ۔ وہاں دوکانوں میں کاروبار ہوتا ہے ۔ اور لوگ اس قدر مصروف ہیں کہ انہوں نے کبھی غور سے آسمان کی نیلاہٹ کا جائزہ نہیں لیا ۔ اور انہیں کبھی یہ احساس نہیں ہوا ۔ کہ مغرب میں افق پر خون کے چھینٹے اڑ رہے ہیں ۔

گذشتہ آٹھ سال سے میں سوپور میں کام یا آرام کے لئے آیا کرتا تھا اور سوپور کی اس نیلی جھیل میں کنول کی طرح چند روز گزار کر واپس چلا جاتا ۔ لیکن اس مرتبہ نہ جانے مجھے کیا ہوگیا تھا ۔ دفعتاً میری نفسیت میں فرخ آباد کا صدر دروازہ بند ہو کر سوپور کی کھڑکی کھل گئی تھی ۔ فرخ آباد کی شاہراہ سے بھٹک کر میں سوپور کی بند گلی میں کھو گیا تھا اور مغیرہ کی اس اداس نا امید آواز نے نہ جانے کیسے میرے دل میں کسی پراسرار امید کا چراغ روشن کردیا تھا ۔

"سارہ اب کوئی نہیں آئے گا ، کوئی نہیں ۔"

اور میں نے محسوس کیا جیسے مجھے آنے کے لئے کہا گیا ہو ۔ جیسے ایک کھڑکی کھل رہی ہو ۔ مسکرا رہی ہو ۔ سرگوشیاں کر رہی ہو ۔

آپ جانتے ہیں ایک کاروباری آدمی کے لئے اس قسم کی رومانی فضا میں رہنا یا رنگین ہیجان میں مبتلا ہو جانا کس قدر تکلیف دہ بات ہے ۔ لیکن جوں جوں میں ان تاثرات کو اپنے ذہن سے مٹانے کی کوشش کرتا توں توں وہ مجھ پر اور بھی مسلّط ہوتے جاتے ۔ اس رنگین جال سے نکلنے کی کوشش الٹا مجھے اس میں جکڑ دیتی اور پھر میں گھبرا کر باہر نکل جاتا اور حکیم فیروز، شاہ صاحب، مسٹر زیڈ احمد ، فقیر دین یا عثمان جاہ کے پاس جا بیٹھتا تاکہ ادھر ادھر کی باتوں میں وقت کٹ جائے ۔

لیکن ہر جگہ کسی نہ کسی بہانے السار کی بات چھڑ جاتی اور پھر شاہ صاحب کے ڈنلوپی گال پھدکنا چھوڑ کر دفعتاً ہموار ہو جاتے ، گول بادامی آنکھیں طلوع ہو جاتیں اور رازدارانہ انداز سے ان کا چہرہ کلوز اپ میں آتا ۔ اور پھر ان کی آنکھیں جھپکنے کے بغیر مجھے گھورتیں ۔ اور گویا اپنے آپ کو یقین دلانے کے لئے شاہ صاحب گنگناتے ۔ "کوئی نہیں سمجھتا ، سوپور میں کوئی نہیں جانتا غفران انسان نہیں وہ جنات میں سے ہے ۔ ہاں جنات میں سے اور وہ اس لڑکی کو اٹھا لایا ہے تاکہ اپنی ہوس ـــــــ تم سمجھتے ہو نا نادر ۔ یہ چیز ہے یہ ـــــــ اور اور وہ کھڑکی ۔" شاہ صاحب کے سرخ چہرے میں وہ دو سیاہ کھڑکیاں کھلنے کی کوشش کرتیں ۔ "روز اس کھڑکی کو پلستر سے بھر دیا جاتا ہے ۔ صاف آواز آتی ہے جیسے معمار اینٹیں لگا رہا ہو ۔ سیمنٹ جما رہا ہو ۔ سارا دن آوازیں آتی ہیں ۔ اور پھر رات کو اس کھڑکی پر دستک ہوتی ہے ۔ عجیب غیر مرئی دستک اور وہ کھڑکی کھل جاتی ہے اور اگلے روز وہ گرجتا ہے ۔ چیختا ہے چلاتا ہے ۔ بیگم ، بیگم اور بیگم روتی ہے کراہتی ہے اور معمار اینٹیں ٹھونکتا ہے اور کھڑکی کو بند کرنے میں مصروف رہتا ہے ۔ السار میں انسان نہیں بستے ۔" شاہ صاحب کی آواز میں خوف کی نسبت شوق کا عنصر نمایاں ہوتا ۔ "تم ہی کہو نادر کیا یہ باتیں انسانوں سے متعلق ہو سکتی ہیں ۔ اور وہ بے چاری مغیرہ سسک سسک کر زندگی کے دن پورے کر رہی ہے "آؤ آؤ" شاہ صاحب اٹھ بیٹھتے آؤ اپنے کانوں سے سن لو

اس مغربی کمرے میں اس کی سسکیوں کی آواز صاف سنائی دیتی ہے ۔ آؤ ۔"
دفعتاً مجھے چاروں طرف سے رنگین چھیڑ دینے والی سسکیوں کی آوازیں سنائی دینے لگتیں ۔ اور میں اٹھ بیٹھتا ۔ "نہیں نہیں پھر سہی کبھی ۔ اب میں جاتا ہوں ۔"

بیگم فیروز چائے بناتے ہوئے حسب معمول بڑے غور سے پیالی کی طرف دیکھ رہی تھی اور حسب معمول اس کا ریشمیں دوپٹہ سر سے سرک کر نیچے گر چکا تھا اور حسب معمول بالوں کی ایک لٹ آہستہ آہستہ نیچے گری جا رہی تھی ۔ چینی ہلاتے ہوئے اسکا دایاں بازو جس پر آستیں ڈھلکی ہوئی تھی ۔ یوں جھول رہا تھا جیسے وہ کسی کی گردن کے گرد حمائل ہو ۔

بیگم فیروز نے سر اٹھایا اور مسکرا کر بولی ۔ "نادر صاحب آپ کو پنسل سازی سے کیسے فرصت ہوگئی جو سوپور میں آ گئے ۔"

بیگم فیروز کو مجھ سے ہمیشہ یہی گلہ تھا ۔ "نادر صاحب آپ سوپور کیوں نہیں آتے کیا پنسلوں کی فیکٹری آپ کے بغیر چل نہیں سکتی ۔"

بیگم فیروز کی شخصیت سوپور کی اونچی سوسائٹی میں ایک حیثیت رکھتی تھی ۔ کوئی مجلسی اجتماع اس کے بغیر مکمل نہ سمجھا جاتا تھا ۔ وہ ایک مٹیار حسینہ تھی ۔ ایک ایسی حسینہ جسے اپنی ہر جمالی حرکت پر بھروسہ تھا ۔ جسے سرسری التفات اور سرسری بے نیازی کو کام میں لانا آتا تھا ۔ اگرچہ اس کا شباب ڈھل چکا تھا ۔ لیکن اس کے گذشتہ جسمانی حسن نے اب جمالی حرکات کی شکل اختیار کر لی تھی ۔ وہ ان بارعب عورتوں میں سے تھی جن کا جمال دوسروں کو متاثر کرنے کے بعد ان میں قوت تحریک شل کر دیتا ہے ۔ لیکن ایک روز نہ جانے کیا ہوا ۔ تفریح کے طور پر جب میں اس کی تصویر کی طرف لپکا ، اور اس نے اسے چھپانے کی کوشش کی تو اتفاقاً بجلی فیل ہوگئی ۔ اور میں نے اپنی مٹھی بھینچ لی ۔ "نادی" وہ چلائی اور دفعتاً مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا ۔ لیکن نہ جانے کیوں معذرت کرنے کی بجائے میں ویسے ہی بیٹھا رہا ۔ حتیٰ کہ آہستہ آہستہ مجھ پر ایک معطر بوجھ پڑگیا اور اندھیرے سے ایک مخملی سرگوشی سنائی دی ۔ "نادی تم ۔"

اس واقعہ کو پورے چار سال گزر چکے تھے ۔ اور اس واقعہ کے بعد ہمیشہ

بیگم فیروز کو میری پنسل فیکٹری سے شکایت تھی ۔ میری مصروفیتوں سے گلہ تھا ۔ اور سچی بات یہ ہے ۔ کہ مجھے سوپور آتے وقت بیگم فیروز سے ملاقات کا خیال پیش پیش رہتا تھا ۔

اس روز مجھے خاموش دیکھ کر اپنی گری ہوئی لٹ سلجھاتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا ۔ "فرخ آباد میں کوئی کھڑکی تو نہیں کھل گئی کیا ۔"

اس موقعے کی انتظار میں تو تھا میں ۔

"میں نے کہا جمیلہ یہ کھڑکی کا کیا قصہ ہے ۔" میں اسے جمیلہ کہا کرتا تھا ۔

"تم نے نہیں سنا"۔ وہ مسکرائی ۔ سوپور میں گذشتہ تین ماہ سے اور کوئی بات ہی نہیں ہوئی ۔ جہاں بیٹھو السار کی کھڑکی کھل جاتی ہے ۔ کوئی بات چھیڑو ۔ ایران کے تیل کی بات کرو یا عثمان جاہ کی نئی شادی کی نہ جانے کس طرح ہر بات کھڑکی پر آ ختم ہوتی ہے ۔"

"لیکن وہ کھڑکی کونسی ہے ۔" میں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کرنے کے لئے بات بڑھائی ۔ "یہی کھڑکی جو السار کی بغلی گلی میں ہے ۔ جس پر ہر رات دستک ہوتی ہے ۔ خاموش مدھم پراسرار دستک اور پھر ایک سرگوشی سنائی دیتی ہے ۔ غیری ، میں ہوں ۔" اور پھر وہ کھڑکی کھلتی ہے ۔ اور بند ہو جاتی ہے ۔"

"لیکن جمیلہ ، کیا سوپور میں کسی نے اس شخص کو نہیں دیکھا ، میرا مطلب ہے وہ جو کھڑکی پر دستک دیتا ہے ۔"

وہ ہنس پڑی ۔ "اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ کون ہے تو بات اس قدر نہ بڑھتی ، اب تو یہ حالت ہے کہ سوپور کی بیویاں آدھی آدھی رات کو اٹھ کر خاوندوں کی چارپائیوں کا جائزہ لیتی ہیں ۔ کہ میاں موجود ہیں یا چپکے سے گھر سے باہر تو نہیں نکل گئے ۔ ہر کسی کو دوسرے پر شک ہے ۔ مائیں جوان بیٹوں کی رکھوالی کرتی ہیں ۔ بیویاں خاوندوں پر نگاہ رکھتی ہیں ۔ ہر محبوبہ اپنے حبیب کو شک کی نظروں سے دیکھتی ہے ۔ عجیب کیفیت ہے سوپور کی ۔ صرف اس لئے کہ کسی بند گلی میں آدھی رات کے وقت ایک کھڑکی کھلتی ہے ۔" وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی ۔

"جمیلہ تم السار کے مکینوں سے نہیں ملی۔ کون لوگ ہیں وہ "

"نہیں ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔" وہ بولی۔ "وہ ملنا پسند نہیں کرتے دونوں میاں بیوی۔ ایک بار بیوی کو چھت پر کھڑے دیکھا تھا۔ پتلی دُبلی زرد عورت ہے۔ جیسے خلا میں زرد سا جالا تنا ہوا ہو۔ ایسی خوبصورت بھی نہیں۔ لیکن اس کا جسم گہرا زرد ہے۔ جیسے زرد رنگ کی کھمبی ہو۔ کھمبی کی زردی کو جانتے ہو۔ مخملی زردی چمکیلی گہری زردی۔ اور اس کی آواز میں عجیب سی اُداسی ہے اُداسی۔ مایوسی اور دکھ، اب تو اس نے کوٹھے پر چڑھنا بھی بند کردیا ہے۔ اصل میں وہ ایک مظلوم عورت ہے۔"

"نہ جانے کیوں۔ اس کے چہرے پر خدوخال میں مظلومیت کی داستان کندہ ہے۔ اسکا خاوند جابرانہ طبیعت کا مالک ہے۔ سارا دن اس کی غصے بھری آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ بیگم بیگم۔ وہ بار بار کتے کی طرح بھونکتا ہے اور پھر الساز سے چیزیں گرنے اور برتن ٹوٹنے کی آوازیں آتی ہیں۔ پھر بیوی روتی ہے، کراہتی ہے جیسے اس کے زخموں پر کوئی نمک پاشی کر رہا ہو۔ وہ چلاتا ہے چیختا ہے اور وہ روتی ہے۔ وہ دھاڑتا ہے اور وہ کراہتی ہے۔ پھر شام کے قریب دروازے بجتے ہیں اور ایک آخری دھاڑ کے بعد وہ خاموش ہو جاتا ہے اور بیگم دیر تک کراہتی رہتی ہے۔ روتی رہتی ہے۔ پھر کراہنے کی آواز بند ہو جاتی ہے اور غسلخانے سے پانی کی شپاشپ سنائی دیتی ہے۔ پھر ٹرنک کھلتے ہیں۔ ریشمیں کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دیتی ہے اور خوشبو کے لپٹے یہاں تک پہنچتے ہیں اور پھر الساز پر موت کا سا سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہی آدھی رات کے وقت کھڑکی پر دستک ہوتی ہے۔ "میں ہوں غیری۔ میں" کھڑکی کھلتی ہے اور بند ہو جاتی ہے اور پھر دیر تک خوابگاہ سے محبت بھری سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں۔"

"عجیب بات ہے۔"

"عجیب کیوں" وہ غصے میں بولی۔ "میں سمجھتی ہوں اُسے حق حاصل ہے کہ اپنی زندگی کو تباہ ہونے سے بچائے۔ خاوند کی مسلسل اذیت دہی پر کیا وہ مجبور نہیں کہ اپنے جذباتی سکون کے لئے کھڑکی کھول لے مظلومیت کی گھٹن کو دور کرنے کے لئے وہ کھڑکی کھولتی ہے، اچھا کرتی ہے وہ، تم تو اس کے خاوند کی

طرف داری کروگے نا ۔ مرد جو ہوئے ۔"

"نہیں نہیں ، میرا یہ مطلب نہیں ۔"

"تم مردوں کا مطلب کون نہیں جانتا ۔" بیگم فیروز نے مجھ سے قریب تر ہوتے ہوئے کہا ۔ "تم مردوں کو کھڑکیوں سے بیر ہے کیونکہ وہ عورتوں کی گھٹن کو دور کر سکتی ہیں ۔" وہ میرے قریب تر ہوگئی ۔ اور میں نے محسوس کیا جیسے قریب ہی کوئی کھڑکی کھلتی جارہی ہو ۔ کمرے میں خاموشی چھاگئی ۔ اور ایک رنگین سی گھٹن میری رگ وپے میں لہریں لینے لگی ۔

"سارہ ۔ سارہ ۔ دروازے بند کردو ۔" دُور سے آواز سنائی دی اور میں چونک پڑا ۔

وہی آواز وہی ۔ جیسے دور کوئی کراہ رہا ہو ۔ بیگم فیروز میری نظر میں دھندلا گئی ۔ وہ رنگین کھڑکی جو میرے قریب کھلی پڑی تھی ۔ بند ہوگئی ۔ اور اس کی جگہ نیلے آسمان میں ایک سنہری قوس لپکی ۔

"اب یہاں کوئی نہ آئے گا ۔ کوئی نہیں" کسی نے ہچکی سی لی میں اٹھ بیٹھا جیسے کسی نے مجھے بلایا ہو ۔ "میں جاتا ہوں ، میں جاتا ہوں ۔" مجھے اپنی آواز بھیانک سنائی دے رہی تھی ۔ اور میں چل پڑا یوں چل پڑا جیسے مجھے کہیں جانا تھا ۔ جیسے مجھے کسی نے بلایا ہو ۔ بیگم فیروز تو جیسے اس رنگین صوفے میں تحلیل ہو چکی تھی ۔

عثمان جاہ نے اگالدان میں پیک تھوک کر میری طرف دیکھا ۔ نادر صاحب اُسے کون نہیں جانتا ، کسی دلّی والے سے پوچھ لیجئے ۔ وہ دلّی کی طوائف ہے ۔ سمجھے آپ ، دلی میں وہ زعفرانی کے نام سے مشہور تھی ۔

زعفرانی اور نیلی دونوں بہنیں تھیں ۔ اس کا رنگ گہرا زرد تھا ۔ جیسے سورج مکھی کے پھول کی زرد کٹوری کا ہوتا ہے ۔ اور اس کی بہن کی آنکھیں نیلی تھیں ۔ گہری نیلی ۔ بڑی مشہور تھیں دونوں ۔ بھئی وہی زعفرانی جس کا چوبارہ زری پنواڑی کے اوپر تھا ۔ اماں وہی سبز جنگلے والا ۔ کون نہیں جانتا اسے بھئی ۔ نام بدل لینے سے شخصیت تو نہیں بدلتی نا ۔ اپنی وہی زعفرانی ہے ۔ اگرچہ اب مغیرہ بنی بیٹھی ہے لیکن صاحب واہ واہ کیا آواز پائی ہے ۔ واہ واہ واہ ،

ایک مرتبہ نواب حشمت جاہ کے ساتھ ان کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا ۔ نواب صاحب کو آپ جانتے ہی ہوں گے ۔ راگ کے دیوانے تھے ۔ خصوصاً ٹھمری کے ۔۔ بولے عصمی ، وہ ہمیں ہمیشہ عصمی کہا کرتے تھے ۔ کیا خوب دن تھے وہ ، دلّی یاد آتی ہے نادر صاحب تو اللہ جانتا ہے کہ سینے پر سانپ لوٹ جاتا ہے ۔

ہاں تو ہم کہہ رہے تھے نواب صاحب بولے عصمی آج تو کچھ سننے کو جی چاہتا ہے ۔ ہم نے کہا ۔ شوق سے چلئے ۔ بائی کا چوبارہ کچھ دور نہیں ۔ اور نادر صاحب اس وقت اتفاق سے ہم زرّی پان فروش کی دوکان کے قریب تھے ، اور صاحب یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ نواب صاحب زرّی کے ہاتھ کا بنا ہوا پان کا بیڑہ کھائے بغیر آگے چل دیں ۔ ہیں ؟ ہی ہی ہی ہی ۔" وہ ہنسنے لگے ۔ "کیا دن تھے وہ ۔ واہ واہ واہ ۔ ۔۔ایک ساعت کے لئے وہ خاموش ہوگئے ۔ پھر ٹھنڈی آہ بھر کر بولے تو صاحب نواب صاحب نے کہا عصمی یہیں کیوں نہ ہو جائے کچھ ، اس سبز جنگلے والے چوبارے میں کون رہتی ہے ۔"

"واہ واہ واہ ۔۔۔۔ نادر صاحب ۔۔ زندگی میں کئی باتیں ایسے موقعے پر ظہور میں آتی ہیں ۔ اور وہ مفہوم پیدا کرتی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے ، صاحب حیرت ،نواب صاحب نے منہ سے یہ بات نکالی ہی تھی کہ میاں اس چوبارے میں کون ہے کہ دفعتاً اوپر چوبارے سے اس نے ٹھمری کا بول کہا ۔ وہی استاد چاندوخان کی چیز ۔ وہ مشہور بھیرویں کا بول ۔

میں داسی بھئی تمہاری

اب نواب صاحب حیرت سے ہمارا منہ تک رہے ہیں ۔ اور ہمیں پان منہ میں ڈالنے کا ہوش نہیں اور زرّی پان فروش ہماری اس بات پر مسکرا رہا ہے ۔ لو صاحب اس کے بعد چوبارے پر نہ جانا ۔ ایسی بدذوقی ہم سے تو نہ ہو سکتی تھی ۔ صاحب اور حضور اوپر جاکر کیا دیکھتے ہیں ۔ دونوں بہنیں بیٹھی ہیں ۔ سبحان اللہ ۔ سبحان اللہ ۔ واہ واہ واہ جیسے ایک ہی ڈال پر دو مختلف رنگوں کے پھول کھلے ہوں ۔ ناک نقشہ ایک ، جیسے جڑواں ہوں ۔ لیکن انداز مختلف ۔ رنگ اپنا اپنا " اور تاثر ۔۔۔۔ واہ واہ اب نواب صاحب کبھی ایک بہن کی طرف دیکھتے

ہیں کبھی دوسری کی طرف ۔ توبہ ہے ۔" عثمان جاہ خاموش ہو گئے ۔ لیکن اُن کی کیفیت ان کے دل کے اضطراب کی غماز تھی اور آنکھوں میں وہ حسرت بھری چمک تھی جو ماضی کی یاد کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے ۔

"ہاں صاحب وہی زعفرانی ہے ۔ کسی بے فکرے امیر کو پھانس لیا ہے اور یہاں چلی آئی ہے ۔ سوپور میں کیا نام ہے اس کا غفران وہ کسی اچھے خاندان سے نہیں معلوم ہوتا ۔ ورنہ صاحب یوں السار میں منہ چھپا کر نہ بیٹھے رہیں ۔ نہ کسی سے ملنا نہ کسی کو بلانا ۔ آپ ہی کہئے یہ طور اطوار کیا اچھے خاندان سے متعلق ہو سکتے ہیں ۔ آج تک ہمارا ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا ۔ لیکن صاحب وہ کہتے ہیں نا خدا قدرتوں سے پہچانا گیا ہے ۔ کسی نے دیکھا نہیں ۔ بس تو ۔۔۔ اور حضرت ہم تو اولین افواہ پر ہی تاڑ گئے تھے ۔ کہ وہی ظالم ہے لیکن صاحب زرد ناگن ہے وہ جس کا ڈسا پانی نہیں مانگتا ۔ اور دیکھو تو معصومیت اور غم کی تصویر سبحان اللہ کیا تصویر ہے ۔ تو صاحب وہ غفران صاحب پھنس گئے ہوں گے ۔ اب گذارہ تو غفران صاحب سے لے رہی ہیں اور رومانی تسکین کھڑکی سے " وہ قہقہہ مار کر ہنسے، "پہلے دلی میں چاہنے والے صدر دروازے سے آتے تھے ۔ اس سوپور میں وہ کھڑکی سے آتے ہیں ۔ راگ وہی ہے بندش وہی ہے ذرا تال بدل کر آڑی کر لی گئی ہے ۔ ہی ہی ہی ہی ۔ یہ چیز ہے بس لیکن صاحب واہ واہ واہ واہ کیا انداز سبحان اللہ ۔ تفصیلات قائم کرنا ختم ہے ان پر ۔ رکھ رکھاؤ بھی رہے اور بات بھی ۔ تو صاحب کیا طریقہ قائم کر رکھا ہے ۔ داد دینے کو جی چاہتا ہے واللہ ۔ یعنی بالکل وہی بات ہے مکڑی والی ۔ وہ آپ نے سنا ہی ہوگا مکڑی کا قصہ ہی ہی ہی ہی کیا انداز ہے ۔ واہ واہ واہ واہ ، جب مکھی جال میں پھنس جاتی ہے حضور تو یہ نہیں کہ اسے دبوچ لیا ۔ نہ صاحب اسے گدگدی کی جاتی ہے ۔ ہی ہی ہی ہی " وہ ہنسنے لگے جیسے انہیں کوئی گد گدا رہا ہو ۔" اور شکار ہنستا ہے ، ہنسے جاتا ہے اور صاحب اتنا ہنستا ہے اتنا ہنستا ہے کہ روح قفس عنصری سے پرواز کر جاتی ہے ۔" وہ ہنستے ہنستے تھک کر خاموش ہو گئے ۔" اسے کہتے ہیں رکھ رکھاؤ ۔" اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کرتی جارہی ہو ۔

"اہم اہم" کچھ دیر کے بعد وہ کھانسنے لگے اور پھر سنبھل کر بولے ۔ "تو نادر صاحب سننے میں آیا ہے کہ سارا دن وہ مخملی ناگن اپنے زہریلے حسن سے غفران کو ڈستی رہتی ہے ۔ حتیٰ کہ شام تک وہ جذبات کی شدت سے بے حال ہو کر دیوانہ وار باہر نکل جاتا ہے ۔ اجی صاحب کون دیوانہ ہو کر باہر نہ نکلے گا ۔ آخر برداشت کی حد ہوتی ہے ۔ اور صاحب غفران نے اس ناگن سے بچنے کے لئے سوپور کے ڈاک بنگلہ کے قریب ایک کوٹھی لے رکھی ہے ۔ تاکہ وہاں وہ اس زرد ناگن سے دور سکون سے وقت کاٹ سکیں ۔ تو صاحب ہوتا یہ ہے کہ زعفرانی انہیں سر شام ہی وہاں چلے جانے پر مجبور کر دیتی ہے ۔ پھر وہ احساسِ فراغت سے اٹھ کر بناؤ سنگار کرتی ہے اور اپنے محبوب کے انتظار میں بیٹھ جاتی ہے کہ کب کھڑکی پر دستک ہو اور کب "میں داسی بھئی تمہاری" "ہی ہی ہی ہی" وہ ہنسنے لگے ۔

صمدو حجام چمڑے پر استرا چلاتے ہوئے راز دارانہ انداز میں کہنے لگا ۔ "اجی بابوجی اس پٹھے کو ساری بات مالم ہے ۔ رئیس زادہ ہے وہ کیا نام ہے اسخا ۔ ارفان یا عرفان ، مجھے تو آجتخ اسخا نام سمجھ میں نہیں آیا ۔ پانی کی طرح اس پر روپیہ بہاتا ہے بابوجی ۔ ڈیڑھ سو دو سو خابل ہوتا ہے اور پھر باخی چونچلے جو ہوتے ہیں امیروں خے ۔ اس لڑخی خو سینے سے لگا خر رخھا ہے ۔ پھر بابوجی وہ خیسے غوارا خرے گا خہ وہ رات خے وخت خسی سے ملے ۔ سوچ خی بات ہے ہاں ۔ پٹھا عیشی آدمی ہے اور جناب یہ عیشی آدمی ، خیا بات چھپی ہے ان سے ۔"

"تو تمہارا مطلب ہے اسے اس کھڑکی کا بھید معلوم ہے ۔" میں نے پوچھا ۔ واہ بابوجی الٹا خڑخی خی غلطی تو اس نے خود لغار رخھی ہے ۔ پٹھا سارا دن عیش خرتا ہے اس لونڈیا خے ساتھ اور جب شام پڑتی ہے تو چپخے سے دوسرے بنغلے میں چلا جاتا ہے ۔ خس منہ سے رات غھر غزارے ۔"

صمدو نے مسکرا کر میری طرف دیکھا ۔

"تم تو جانتے ہو بابوجی تم سے خیا چھپا ہے ۔"

"نہ بھئی مجھے نہیں معلوم" ۔ میں نے اسے اکسایا ۔

"بات یہ ہے" ۔ وہ میرے قریب تر ہو کر بولا ۔ "خہ ان رئیس زادوں خے ہاتھ پلے خچھ نہیں ہوتا ۔ بس حرص ہی ہوتی ہے بابوجی ۔ تو وہ سارا دن

اپنی حرص پوری کرتا ہے اور شام کوٹل جاتا ہے اور جناب وہاں سے اپنے خسی نوکر کو بھیج دیتا ہے کہ اس لونڈیا کا دل بہلا آئے۔"

"ہائیں ـ ـ ـ ـ ـ خود بھیجتا ہے۔"

"ہاں بابو جی" اس کی آنکھوں میں روشنی چمکی۔ "ہم ان امیر زادوں کے لچھن اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ اپنا نواب عظمت بیگ تھا نا اسکا بھی یہی طریقہ تھا۔ بڑا دلچسپ آدمی تھا بابو صاحب" اور وہ ہنسنے لگا۔ ہی ہی ہی ہی۔

صمدو حجام کے جانے پر جب دروازہ بند ہوا تو میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ایسے محسوس ہوا مجھے جیسے قریب ہی کوئی کہہ رہا ہو دروازہ بند کردو سارہ اب کوئی نہیں آئے گا۔

چند ایک ساعت کے لئے تو میں کمرے میں مضطرب گھومتا رہا۔ پھر چپکے سے ان جانے میں کھڑکی کھول کر باہر نکل گیا۔

چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اور اس اندھیرے میں دور روشنی کی ایک درز سی چمک رہی تھی۔ ایک مخملی رنگین سرگوشی مرتعش تھی۔ اور میں دبے پاؤں چلا جا رہا تھا۔

"کون ہے"۔ بغلی بند گلی کے فقیر کی آواز سن کر میں چونکا اور مجھے احساس ہوا کہ میں مغیرہ کی کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوں۔

بڈھے فقیر نے ایک قہقہہ لگایا۔

"دوسروں کی کھڑکیوں کو کیوں گھورتے ہو میاں۔ تمہارے اپنے گھر کوئی کھڑکی نہیں کیا۔"

"میں ـ ـ ـ میں ـ ـ ـ" میں فقیر کی بات سن کر گھبرا گیا۔

بوڑھے فقیر نے پھر قہقہہ لگایا۔ "پاگل ہیں۔ سبھی پاگل ہیں۔ کھڑکی کے دیوانے کوئی دوسرے گھر کی کھڑکی کھولتا ہے کوئی اپنے کی۔"

میں گھبرا کر مڑا۔ دیوار کے ساتھ ایک لپٹا ہوا سایہ دیکھ کر میں ہچکچایا۔ کون ہو تم میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ لیکن میری قوت گویائی گویا سلب ہو چکی تھی۔

بڈھے نے پھر قہقہہ لگایا۔ "جاؤ بابا وہ بولا، جاؤ۔ گھر والا چاہے دروازے

سے آئے یا کھڑکی سے کیا فرق پڑتا ہے ۔"

"غفران" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا ۔ وہ سایہ جھجھک کر پیچھے ہٹ گیا ۔ ایک ساعت تک گلی میں موت کی سی خاموشی طاری رہی ۔ پھر کھٹ مغیرہ کی کھڑکی کھل گئی اور وہ سایہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کھڑکی کی طرف لپکا اور پھلانگ کر اندر داخل ہوگیا اور کھڑکی بند ہوگئی ۔

بڈھے کے بھیانک قہقہے سے گلی گونجنے لگی ۔

بڈھے نے چلا کر کہا ۔ "گھر والے کیا نہیں کرتے ۔ کیا نہیں کرتے ۔ کون ہے جو گھر میں کھڑکی نہیں بناتا ۔ یہ دروازے ، یہ کھڑکیاں ! اس نے ازسرنو قہقہہ لگایا ۔

میری نگاہوں تلے ایک سرخ فوارہ پھوٹ نکلا ۔ ایک رنگین قوس ایک خونیں محراب جس کے بازو ملے جارہے تھے ۔ دفعتاً میں نے محسوس کیا جیسے میں اس گھور اندھیرے میں کھڑا رنگین قوس کی ایک کھڑکی تعمیر کر رہا تھا ۔

"نہیں نہیں میں چلایا ۔ مجھے فرخ آباد جانا ہے فرخ آباد ۔۔۔۔" اور میں بھاگا ۔ دور رات کی اکسپریس کا وسل سنائی دے رہا تھا ۔

اور پیچھے بڈھے فقیر کے قہقہے کی آواز گونج رہی تھی ۔

○

لکھ پتی

شیخ عبدالصمد اُٹھ بیٹھے ۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے ۔ دل میں گویا ایک اضطراب سا لہریں لے رہا تھا ۔ دل کی دبی دبی حسرت کی وجہ سے وہ بے حد پریشان تھے ۔ جی چاہتا تھا کہ کچھ کریں ۔ باآواز بلند کسی سے باتیں کریں ۔ سر پر پگڑی رکھ کر بازار میں چکر لگائیں ۔ ادھر سے اُدھر چلے جائیں ۔ اُدھر سے اِدھر آئیں ۔ لوگوں کے سلام کا جواب بڑے وقار سے دیں ۔ گردن اٹھا کر یوں چلیں جیسے سیٹھ ارجن داس چلا کرتے ہیں ۔ بات کرتے وقت کھنکھار کر گلا صاف کریں ۔ حتیٰ کہ لوگ محسوس کرنے لگیں کہ وہ اب چچا صمدو نہیں بلکہ شیخ عبدالصمد ہیں ۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر لوگوں کو بتا دیں کہ اب وہ معمولی دوکاندار نہیں بلکہ ایک لکھ پتی ہیں ۔ لاکھ پتی ! شیخ عبدالصمد نے خوشی کی اٹھان کو دباتے ہوئے زیرِ لب اپنے آپ سے کہا ۔ اور جھاڑن اٹھا کر اپنی مختصر سی دوکان میں پڑی ہوئی چیزوں کو جھاڑنے لگے ۔ آج وہ بار بار دوکان کو جھاڑ رہے تھے ۔ شاید ان جانے میں دوکان کی غلاظت کو شدت سے محسوس کر رہے تھے ۔ یا اس مختصر سی منیاری کی دوکان پر دل ہی دل میں شرما رہے تھے ۔ دوکان کو جھاڑ کر وہ بیٹھ گئے ۔ لیکن جلد ہی گھبرا کر اُٹھ بیٹھے ۔ جیسے اس چھوٹی سی دوکان میں اُن کا دم گھٹ رہا ہو ۔ آخر وہ جوتا پہن کر اُٹھے اور چل پڑے ۔ بڑی دیر کے بعد انہیں احساس ہوا کہ وہ بازار میں جا رہے ہیں ۔ اِس احساس پر دفعتاً اُن کی گردن اکڑ گئی ۔ انہوں نے پگڑی کو سرکا کر ماتھے کی طرف کر دیا ۔ پھر ان کی نگاہوں کے سامنے سیٹھ ارجن داس کی تصویر آگئی جو بازار سے گزرتے ہوئے لوگوں کے سلام کا جواب دیا کرتے تھے ۔ دل میں ایک خاموش ارادہ قائم ہوگیا اور وہ ایڑیاں اٹھا کر چلنے لگے ۔ لیکن اس کے باوجود بازار کے لوگ اس قدر بے حس تھے کہ شیخ صمد کی اس تبدیلی کا ذرا احساس نہ ہوا ۔

"چچا صمدو ہے ۔ سلام علیکم"! شیخ اعظم نے قریب سے گزرتے ہوئے کہا ۔ "اچھے تو ہو نا چاچا"۔ ؟ "اللہ کا شکر ہے"۔ ان جانے میں خواہ مخواہ اُن کے منہ سے نکل گیا ۔ "آپ کی مہربانی ہے" گردن آپ ہی آپ جھک گئی ۔ ایڑیاں زمین میں گڑ گئیں ۔ اعظم کے جانے کے بعد انہیں شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہوا ۔ طبیعت میں غصے کی دبی دبی سی لہر پیدا ہوئی ۔ لیکن اب ہو ہی کیا سکتا تھا ۔ "خیر خیر"! اُنہوں نے اپنے آپ کو تسلی دی اور پھر گھر کی ڈیوڑھی میں جا داخل ہوئے ۔ دبے پاؤں کوٹھے پر چڑھ کر وہ چارپائی پر جا بیٹھے اور بجھے ہوئے حقے کے کش لگانے لگے ۔ ثانیہ بھر کے لئے وہ یونہی کھوئے کھوئے سے بیٹھے رہے ۔ پھر شاید بڑھتے ہوئے اضطراب سے چھٹکارا پانے کے لئے یا اُسے تسکین دینے کے لئے غیر معمولی طور پر کھنکھار کر اُنہوں نے واحد کی ماں کو آوازیں دینی شروع کیں ۔

واحد کی ماں نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا اور گھبرا کر بولی ۔ "خیر تو ہے"۔ "خیر" انہوں نے حقے کا کش لگا کر دُہرایا ۔ "گھر میں تیسرا پھیرا ہے آج"۔ وہ بولی ۔

"اوہ" وہ گھبرا گئے ۔ ان کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا ۔

ان کا جی چاہتا تھا کہ واحد کی ماں سے وہ راز کہہ دیں جس نے اُن کے اندر کھلبلی مچا رکھی تھی ۔ انہوں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ۔ لیکن معاً ان کی نگاہ واحد کی ماں کے پاؤں پر جا پڑی ۔ اور اُنہیں یاد آیا کہ بیگم کب سے زری کی جوتی کے لئے تقاضہ کر رہی ہے اور پھر اُنہیں یاد آیا کہ بیگم سے گلے کا ہار بنوا دینے کا وعدہ بھی تو کر رکھا ہے ۔ "یعنی بات یہ ہے ۔ ۔ ۔" وہ کہتے کہتے رک گئے ۔ "یعنی" انہوں نے پھر کچھ کہنے کے لئے بات شروع کی ۔ لیکن اُنہیں خود معلوم نہ تھا کہ وہ کیا کہنے والے ہیں یا انہیں کیا کہنا چاہئے ۔ بجھے ہوئے حقے کے ایک لمبے کش نے ان کی ڈھارس بندھائی ۔ "میں نے کہا"۔ وہ بولے ۔ "ایک دن کے لئے شہر چلا جاؤں" "شہر؟" واحد کی ماں چلائی ۔ "ابھی تو شہر سے آئے ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا ۔ "ہاں ہاں" وہ پینترا بدل کر بولے ۔ "سوچتا ہوں کچھ مال لے آؤں"۔ "مال؟" واحد کی ماں نے ہونٹ پر انگلی رکھ لی ۔ "مال کیا کرنا

ہے ۔ عید سے ایک ہفتہ پہلے لے آنا"۔ "نہیں نہیں" خواہ مخواہ اُن کے منہ سے نکل گیا ۔ "تمام چیزیں ختم ہو رہی ہیں ۔ بی مارکہ خضاب کے صرف دو ڈبے ہیں ۔ پشم کی بھی صرف ایک گچھی رہ گئی ہے ، اور تھوک فروش سے حساب بھی کرنا ہے"۔ "تو پھر میں کیا کہہ سکتی ہوں ؟" وہ بولی جو جی میں آئے کیجئے لیکن واحد کی ماں کا انداز اس کی بات کو جھٹلا رہا تھا ۔ "اچھا؟" انہوں نے بیگم کے تیور چڑھے دیکھ کر اپنے آپ کو اس مشکل سے بچانے کے لئے کہا ۔ "ایک گلاس پانی تو دینا۔" اور پھر بجھے ہوئے حقے کو چُوسنے لگے ۔

شیخ صمد قصور میں معمولی سی منیاری کی دوکان کیا کرتے تھے ۔ معمولی سی ۔ ۔ ۔ لیکن اس کے سوا چارہ بھی تو نہ تھا ۔ بڑی دوکان کے لئے اُن کے پاس سرمایہ نہ تھا ۔ کیسے ہوتا سرمایہ ان کے والد فخر الدین نے مرتے وقت عبدالصمد کے لئے پھوٹی کوڑی بھی نہ چھوڑی تھی ۔ لے دے کر ایک مکان تھا جس میں وہ رہتے تھے ۔ اور زیور بھی تھا ۔ زیور تو خیر مالیت میں کافی تھا ۔ لیکن عبدالصمد کی والدہ نے وہ سب اپنے قبضے میں لے لیا تھا تاکہ صمد اُسے ضائع نہ کر دے ۔ حتیٰ کہ اُس نے صمد پر یہ ظاہر ہی نہ کیا تھا کہ اس کے پاس اتنا زیور ہے ۔ دراصل وہ بچاری ڈر گئی تھی ۔ ڈرنے کی بات تو تھی ہی ۔

قصور میں فخر الدین کی اچھی خاصی دوکان تھی ۔ دس پندرہ روپے روزانہ کی بکری ہو جاتی تھی ۔ گھر میں کھانے پینے کو کافی تھا ۔ قصبہ بھر میں فخر الدین کی ساکھ تھی ۔ حتیٰ کہ قصور کا مشہور ساہوکار عظمت رائے بھی ضرورت کے وقت بغیر کسی تحریر کے ہزاروں روپے دے دیا کرتا تھا ۔ فخرالدین نے بھی ساہوکار کے ساتھ خوب نباہی تھی ۔ وعدہ پورا کرنے میں کبھی ایک دن کے لئے بھی نہ چوکے تھے ۔ عظمت رائے ان کی ایسی ہی عزت کیا کرتا تھا جیسی شیخ احمد علی یا شیخ عارف کی ۔ اگرچہ ان کے مقابلے پر شیخ فخرالدین کی کوئی حیثیت نہ تھی ۔ شیخ احمد علی مشہور کارخانے والے تھے اور عارف چمڑے کا بیوپار کرتے تھے ۔ اس کے باوجود فخرالدین خوش نہ تھے ۔ حالانکہ گھر میں کھانے پینے کو بہت تھا ۔ بیگم اچھے سے اچھا کپڑا پہنتی تھی ۔ بچہ باقاعدہ سکول میں پڑھتا تھا ۔ مانا کہ برادری میں ان کی عزت تھی ۔ بلکہ تمام قصبے میں خاصہ وقار تھا ۔

لیکن اس کے باوجود انہیں اطمینان حاصل نہ تھا ۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ بھی احمد علی کی طرح کارخانے کے مالک ہوں یا محمد یوسف کی طرح ان کی بھی لاہور میں بڑی دوکان ہو اور اس کے لئے کم از کم ایک لاکھ روپے کی ضرورت تھی ۔ بڑا کاروبار شروع کرنے کے لئےایک لاکھ کیا چیز ہے ۔ بہرحال ایک لاکھ سے کم میں تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا ۔ اگر فخرالدین احتیاط سے کام لیتے تو شاید ایک لاکھ بھی جمع ہو ہی جاتا ۔ لیکن دقت یہ تھی کہ وہ شیخ ہوتے ہوئے بھی خرچ کرنے میں کافی دلیر تھے ۔ وہ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ بیگم میلی میلی رہے یا اُس کی حیثیت محمد علی کی بیوی سے کم سمجھی جائے یا وہ گرمیوں میں چولھا جھونکے ۔ اگر بیگم کبھی چولھے پر بیٹھی دکھائی دیتی تو وہ پریشان ہو جاتے ۔ ”میں نے کہا صمد کی ماں یہ کیا کر رہی ہو تم کسی محلے والی نے آکر دیکھ لیا تو کیا کہے گی ۔ میں پوچھتا ہوں کیا عارف کی بیوی کبھی چولھے پر بیٹھی ہے؟“ میں تو آگ تاپنے بیٹھی تھی ذرا“۔ بیگم بات ٹالنے کی کوشش کرتی ۔ ”آگ تاپنا ہے تو انگیٹھی لے کر پلنگ پر بیٹھو جیسے قاعدہ ہے“۔

فخرالدین کو بس ایک ہی ڈر تھا کہ اس کا رہن سہن عارف اور احمد علی سے کم تر نہ ہو ۔ جبھی تو اچھی خاصی دوکان چلانے کے باوجود فخرالدین کے پاس بیس تیس ہزار سے زیادہ سرمایہ جمع نہ ہوسکا تھا ۔

آخر ایک دن تنگ آکر فخرالدین نے لکھ پتی بننے کی عملی کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا کہ اپنا تمام تر سرمایہ کسی کام پر لگا دیا جائے کوئی ایسا کام ہو انہوں نے سوچا جو چند دنوں ہی میں ہزاروں کو لاکھوں میں بدل دے ۔

بڑی چھان بین کے بعد انہوں نے اپنا سارا سرمایہ چمڑے کے بیوپار میں لگا دیا ۔ لیکن اس وقت فخرالدین یہ بات قطعی طور پر بھول گئے کہ جو بیوپار چند دنوں میں ہزاروں کو لاکھوں میں بدل سکتا ہے ، وہ لاکھ کو آن کی آن میں خاک بھی بنا سکتا ہے ۔ دراصل لاکھ روپیہ پیدا کرنے کی خواہش اُن پر اس قدر مسلّط ہو چکی تھی کہ انہوں نے خسارے کے پہلو پر سوچنے کی تکلیف ہی گوارا نہ کی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو ماہ کے قلیل عرصے میں فخرالدین کا تمام تر سرمایہ ڈوب گیا ۔ اور خسارہ پورا کرنے کے لئے انہیں اپنی دوکان سے بھی ہاتھ دھونا پڑا ۔ بد قسمتی

کا یہ تھپیڑا فخرالدین کے لئے ناقابل برداشت تھا۔

اگر صرف سرمائے کے ضائع ہونے کا سوال ہوتا تو شاید وہ اُسے برداشت کر لیتے۔ لیکن اپنے وقار کو مٹی میں ملتا ہوا دیکھ کر انہیں بے حد صدمہ ہوا۔ بیگم نے بہتیری کوشش کی کہ انہیں سمجھائے۔ لیکن "بیگم" وہ چلائے "لوگ کیا کہیں گے۔ بنی بنائی عزت خاک میں مل گئی۔ اُف!"

اس اُف نے انہیں صاحب فراش کر دیا۔ اسی شام کو خون کی ایک قے ہوئی۔ اور شام کے دھندلکے میں ان کے عزیز اور رشتہ دار حکیم، ڈاکٹر کی طرف بھاگے۔ لیکن ڈاکٹروں کی دوائیاں اس صدمے کا سدِّ باب نہ کر سکیں۔ آدھی رات کے وقت اُن کے مکان سے ایک دبی سی چیخ کی آواز اُٹھی اور چند ہی ساعتوں میں کہرام مچ گیا۔

اگرچہ فخرالدین کی موت پر بیگم غم سے دیوانی ہوگئی تھی لیکن اس قدر ہوش باقی تھا۔ کہ وہ تمام زیور اکٹھا کر کے صحن کے ایک کونے میں زمین تلے دبا کر اُسے محفوظ کر سکے۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں وہ زیور فخرالدین کے کسی قرض خواہ کی بھینٹ نہ چڑھ جائے۔ ہاں ڈرنے کی بات تو تھی ہی۔

باپ کی وفات کے بعد گھر کا تمام بوجھ عبدالصمد پر آپڑا۔ وہ اس زمانے میں دسویں جماعت میں پڑھا کرتا تھا۔ اس حادثے کے بعد پڑھائی سے اُس کا جی اچاٹ ہوگیا لیکن بیکار بیٹھنا بھی تو مشکل تھا۔ آخر گھر چلانا کوئی آسان کام تھوڑا ہے۔

چنانچہ عبدالصمد نے ماں کی مدد سے کئی ایک کام شروع کئے۔ لیکن سرمائے کی کمی اور نا تجربہ کاری کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے۔ سب سے پہلے انہوں نے دودھ دہی کی دکان کھولی۔ لیکن گوالوں سے نپٹنا۔ کڑاہیوں کو رگڑ رگڑ کر مانجنا، دودھ میں مناسب مقدار میں پانی اور ماش کا آٹا ملانا اور دہی تولتے ہوئے چابکدستی سے ترازو کو جُھلانا۔ شیخ صمد جیسے ناتجربہ کار نوجوان کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس کے بعد ماں نے انہیں پان سگریٹ کی دوکان کھول دی۔ مگر اس میں بھی وہ کتھے سے ہاتھ رنگنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکے۔ بالآخر اُنہوں نے منیاری کو آزمایا۔ اگرچہ منیاری کی دوکان میں اُنہیں خاص فائدہ نہ ہوا۔ لیکن

اتنا ضرور ہوا کہ اصل زر کھائے بغیر گھر کی روٹی چلنے لگی ۔
اُن دنوں جب کبھی وہ دوکان سے گھر آتے تھے تو ماں اُنہیں ان کے والد کی باتیں سنایا کرتی ۔ بیتی ہوئی باتیں سناتے ہوئے وہ دوپٹے سے گال پر گرا ہوا آنسو پونچھ کر کہتی ۔ ”واحد بیٹا ! تیرے ابا کی بڑی ساکھ تھی یہاں ۔ بڑی عزت کرتے تھے لوگ اگرچہ دوکان کچھ ایسی بڑی نہ تھی ۔ لیکن اس گھر کا ٹھاٹھ کسی شیخ کی حویلی سے کم نہ تھا ۔ مجھے چولھے پر بیٹھنے نہ دیتے ۔ کبھی بیٹھ جاتی تو کہتے کسی نے دیکھ لیا تو کیا کہے گا“۔ یہ تفصیل سناتے ہوئے بیگم کا دل بھر آتا ۔ آواز بھرا جاتی ۔ کچھ دیر کے لئے وہ خاموش ہو جاتی ۔ پھر ایک لمبی آہ بھر کر کہتی ۔ ”بس ! ان کی صرف ایک خواہش تھی کہ ان کا بھی کارخانہ ہو ۔ لیکن اس کے لئے کم از کم ایک لاکھ روپیہ چاہئے تھا ۔ ایک لاکھ روپیہ پیدا کرنا اُن کے لئے کیا مشکل تھا ۔ اگر وہ میری بات مانتے تو نہ جان سے جاتے نہ ہماری یہ حالت ہوتی ۔ لیکن خرچ کرتے وقت اُنہیں کون روک سکتا تھا ۔ اب باپ کی آخری خواہش کو پورا کرنا تمہارا فرض ہے بیٹا“۔

ماں کو روتے دیکھ کر ان کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوتی کہ وہ ایک لاکھ روپیہ پیدا کریں اور اپنا کارخانہ بنائیں ۔ لیکن یہ خواہش شدید ہونے کے باوجود کچھ نہ کر سکی اور ان کی غربت کو اور بھی واضح کرتی چلی گئی ۔ اس احساسِ غربت نے ان کی خواہش کو اور بھی شدید کر دیا اور یہ چکر یونہی چلتا رہا ۔ حتےٰ کہ امید مایوسی میں بدل گئی ۔

پھر ایک زمانے کے بعد جب بوڑھی ماں کی وفات پر انہیں معلوم ہوا کہ وہ بیس ہزار کی مالیت کے زیور کے واحد مالک ہیں تو ان کے دل میں وہ دبی دبی یاس آمیز امید ازسرِنو بیدار ہوگئی ۔ ”ایک لاکھ“! انہوں نے تھیلی کو انگلیوں سے کھجلاتے ہوئے دبی زبان میں کہا ۔ ”ایک لاکھ!“ ان کی آنکھوں کے سامنے کارخانے کی چمنیاں ابھرنے لگیں ۔ لیکن اس کے باوجود مدت تک انہیں زیور بیچ کر کاروبار میں لگانے کی ہمت نہ پڑی ۔ جب کبھی وہ اس بارے میں منصوبے بناتے تو ان کے دل میں والد صاحب کے کارخانے کی یاد تازہ ہو جاتی ۔ اور وہ ڈر جاتے ۔ بہرحال انہوں نے زیور کی بات کو بیگم سے چھپا کر رکھا تاکہ وہ اُس

پر قبضہ نہ جما بیٹھے ۔

پھر حالات خود بخود سدھرنے لگے ۔ لڑائی چھڑنے پر ان کی چھوٹی سی دوکان کے مال کی قیمت دُگنی ہوگئی ۔ اور انہیں احساس ہونے لگا کہ وہ زیور چالیس ہزار روپے کی مالیت کے ہیں ۔ یہ واقعہ اُن کی زندگی میں بے حد اہم تھا ۔ کیونکہ اگر یہ بات واقع نہ ہوتی تو شاید انہیں زیور کو مصرف میں لانے کی کبھی ہمت نہ پڑتی اس کے علاوہ رام لال صراف انہیں زیور بیچنے پر اکسا رہا تھا اور سونے کی قیمت روز بروز بڑھ رہی تھی اور انہیں ڈر تھا کہ وہ پھر گر نہ جائے ۔ اس لئے انہوں نے رام لال کی معرفت سارا زیور چالیس ہزار میں بیچ دیا ۔ جن میں سے بیس ہزار تو انہوں نے امپیریل بنک میں جمع کروائے ۔ باقی روپوں سے موٹر کے پُرانے پُرزے خرید لئے ۔ کئی ایک ماہ بعد جب انہیں رام لال کا تار ملا کہ ان کا مال چوگنی قیمت پر بِک سکتا ہے تو وہ سناٹے میں آگئے ۔ اُنہیں اس بات کا یقین نہیں آتا تھا کہ وہ بھی اسی ہزار روپے کے مالک ہو سکتے ہیں ۔ جب وہ سودا کرنے کے لئے لاہور گئے تو ان کی آنکھوں تلے تمام دنیا گویا دھندلا گئی ۔ نگاہوں کے سامنے گویا ایک رنگین سا دھندلکا چھا گیا تھا ۔ گردوپیش کی تمام چیزیں مبہم ہوئی جا رہی تھیں ۔ اجسام پھیل کر عجیب و غریب شکلیں اختیار کرتے جا رہے تھے ۔ آوازیں ایک دوسرے میں خلط ملط ہو کر مسلسل شور میں تبدیل ہوئی جا رہی تھیں ۔ اس روز ہر چیز اور ہر بات غیر یقینی دکھائی دے رہی تھی ۔ "لاکھ پتی!" اُن کے دل میں دبی دبی سی آواز گونجتی ۔ لیکن وہ محسوس کرتے گویا کوئی انہیں چڑا رہا ہو ۔ ان سے مذاق کر رہا ہو ۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے ؟ اس تذبذب کے باوجود اُن پر ایک اضطراب چھائے جا رہا تھا جیسے وہ کسی خطرناک لیکن رنگین ہنڈولے میں جھول رہے ہوں ۔

پھر دھیرے دھیرے گردوپیش کا دھندلکا نکھرنے لگا ۔ چیزیں پھر سے واضح ہونے لگیں "ہوں ! تو واقعی میں اب لکھ پتی ہوں"۔ نہ جانے اس لئے کہ انہیں اِس حقیقت پر یقین ہوتا جا رہا تھا ۔ ان کے دل میں لکھ پتی ہونے کی اہمیت کم تر ہوتی جا رہی تھی ۔

رام لال سے ملنے کے بعد وہ قصور لوٹ آئے ۔ لیکن ابھی تک وہ نفسی

جھنجھناہٹ کی کیفیت قائم تھی ۔ گو اِس میں وہ شدت نہ تھی ۔ اب ان کے دل میں یہ خواہش بڑھتی جا رہی تھی کہ وہ اپنی اس تبدیلی کے بارے میں کسی سے بات کریں ۔ لوگوں پر واضح کر دیں کہ اب وہ عبدالصمد نہیں جو وہاں چھوٹی سی منیاری کی دوکان کیا کرتا تھا ۔ اور جسے قصبے والے چچا صمدو کہا کرتے تھے ۔ شاید وہ اپنی بیوی سے تمام باتیں کہہ کر اس راز کے بھنور سے مخلصی پا لیتے ۔ لیکن اُنہیں ڈر تھا کہ راز فاش کرتے ہی اُنہیں بیگم کے لئے ہار بنوا کر دینا پڑے گا ۔ اگرچہ ہار تو ایک ہزار روپے ہی میں بن جاتا ۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ ایسا کرنے سے لاکھ روپے میں ایک ہزار کی کمی واقع ہو جاتی اور نہ جانے کمی کبھی پوری ہوتی بھی کہ نہیں ۔ اسی لئے اُن کے لئے کسی چیز پر خرچ کرنا اب اور بھی مشکل ہو گیا تھا ۔ اس سے پہلے جب وہ محض چند سو روپوں کے مالک تھے ، تب بھی وہ خرچ کرنے سے ہچکچاتے تھے ۔ لیکن مجبوری کی حالت میں انہیں اپنی پونجی کا بیشتر حصہ بھی خرچ کرنا پڑتا ۔ تو اُنہیں یہ خیال نہ آتا کہ پونجی میں کمی واقع ہو جائے گی ۔ کیونکہ ان کی پونجی تو ویسے ہی اِس قدر قلیل تھی کہ اس میں مزید کمی کے خدشے کی گنجائش ہی نہ تھی ۔ شاید اسی لئے انہوں نے اس زمانے میں اپنے بیٹے عبدالصمد کو لاہور میں ٹائپ سیکھنے کے لئے بھیج دیا تھا ۔ ورنہ چالیس پچاس روپے ماہوار کا بوجھ اٹھانا ان کے لئے ناممکن تھا ۔ اور ممکن ہوتا بھی تو وہ طبعاً اتنا خرچ برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہوتے ۔ کیونکہ لکھ پتی ہونے کی مسلسل خواہش کے باعث ان میں فراخدلی نام کو نہ رہی تھی ۔

بجھے ہوئے حقے کو چُوستے ہوئے ان کے سامنے ایک عظیم الشان کارخانے کی چمنیاں بلند ہونے لگیں ۔ بڑی چمنی کے پاس ہی بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا چلتے چلتے فخرالدین کی شکل اختیار کر گیا ۔ وہ عبدالصمد کو حیرت اور تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا ۔ "اہم" عبدالصمد کی کھنکھار گونجی اور اَن جانے میں انہوں نے اپنی پگڑی کو پیشانی پر سرکا لیا ۔ آ ۔ آ ۔ آ ۔ آ چمنی سے چکّی کی کوک سنائی دی ۔ وہ چونک پڑے ۔ جیسے انہیں کوئی بلا رہا ہو ۔

"میں نے کہا" بیگم انہیں پانی کا گلاس دیتے ہوئے بولی ۔ "اب کے شہر گئے تو واحد کو گرم کوٹ کے لئے روپے دیئے بغیر نہ آنا ۔ بیچارہ کب سے کوٹ

کے لئے کہہ رہا ہے"۔ "گرم کوٹ؟" انہوں نے حیرانی سے بیوی کی طرف دیکھا۔ "اب تو دسمبر بھی گذر گیا ہے۔ اب تو اس کیلئے ٹھنڈے کپڑوں کی فکر کرنا چاہئے"۔ توبہ! تم تو حد کر دیتے ہو ایسا بھی کوئی نہ ہو۔ اللہ مارے چند پیسوں کے لئے اولاد کو سردی میں ٹھٹھرتے دیکھنا؟" "لیکن واحد کی ماں۔۔۔" شیخ صمد نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ میں نہیں جانتی لیکن ویکن۔ توبہ ایسا پیسہ بھی کیا جو کسی کے کام نہ آئے۔ تمہیں تو بس دن رات جمع کرنے کی پڑی ہے۔ میں کیا جانتی نہیں۔ آگ لگے ایسی دولت کو جو باپ کا کلیجہ پتھر کر دے"۔

"اچھا۔ اچھا!" وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھے۔ "دے آؤں گا بابا! دے آؤں گا"۔

"اور میرا ہار" وہ مسکرا کر بولی۔ "میرے ہار کی بھی فکر ہے یا وعدوں ہی میں ٹالے جائیں گے" "اچھا۔ اچھا"! وہ مزید گھبراہٹ سے بولے "تو میں جاتا ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ سیڑھیاں اُترنے لگے۔

"توبہ ہے"! بیگم کی آواز سنائی دی۔ "چار پیسے آجائیں تو انسان کی آنکھیں ہی بدل جاتی ہیں۔ دوسرے کی تکلیف کا تو خیال ہی نہیں رہتا۔ اللہ کرے کسی کے پاس چار پیسے نہ ہوں"۔

اگرچہ شیخ صمد کی بیوی کے منہ سے ایسی ایسی باتیں سننے کے عادی ہو چکے تھے لیکن نہ جانے کیوں اُس روز انہیں اس کی بات بُری لگی۔ شاید اس لئے کہ اس روز واقعی اُن کے پاس روپیہ تھا۔ اس روز وہ لاکھ پتی تھے۔ " آنکھیں ہی بدل جاتی ہیں۔ دوسرے کی تکلیف کا احساس نہیں رہتا"۔ ان کے کانوں میں بیوی کے فقرے بار بار گونجے۔ اور وہ اپنے آپ کو دکھی محسوس کرنے لگے۔ اس سے پہلے بیوی کی باتوں پر اُنہیں کبھی ایسا شدید احساس نہ ہوا تھا۔ بلکہ اس کی باتیں سن کر وہ چپکے سے ہنس دیتے۔ "پگلی ہے!" ان کی نگاہ اپنے بوٹ پر جا پڑی۔ یہ بوٹ انہوں نے چھ برس ہوئے نیلامی میں خریدا تھا۔ چھ برس میں وہ کئی بار اُس کی مرمت کروا چکے تھے۔ حتےٰ کہ اب اس کی کھیسیں تک نکل آئی تھیں۔ جابجا سوت کے موٹے ٹانکے دکھائی دینے لگے تھے۔ "ٹو" جو کسی زمانے میں بلبلے کی طرح ابھری ہوئی تھی۔ اب پچک کر رہ گئی تھی کنارا تمام کا تمام

خرد برد ہو رہا تھا ۔ تلا کئی ایک مقامات پر کھلا ہوا تھا ۔ اس کے باوجود وہ اُسے پہنے پھرتے تھے ۔ ان کا گرم کوٹ بھی تو جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا ۔ آستینوں کے کنارے تو بالکل ہی گھس گئے تھے ۔ حالانکہ انہوں نے کئی بار اُسے خود مرمت کیا تھا ۔ جیبوں کے کنارے کا کپڑا بھی گھس گیا تھا اور تاگے نکل آئے تھے ۔ کالر کی بھی یہی حالت تھی ۔ اس کے باوجود اُسے پہنے پھرتے تھے ۔ انہیں نیا کوٹ بنوانے کا کبھی خیال تک نہ آیا تھا ۔ اگر وہ اپنی ذات پر خرچ کرنے لگتے تو گھر کا کیا حال ہوتا ۔ "دوسرے کی تکلیف کا احساس نہیں رہتا"۔ ان کے دل میں بیوی کی آواز گونجی ۔ انہوں نے ایک لمبی آہ بھری ۔ اور آنسو پینے کی کوشش کرنے لگے ۔ نہ جانے کیوں اس روز خواہ مخواہ ان پر مظلومیّت کا احساس چھائے جا رہا تھا ۔

سٹیشن پر گاڑی سے اُترنے کے بعد شہر کی گہما گہمی کو دیکھ کر وہ واحد کی ماں کی بات بھول گئے ۔ دھیرے دھیرے اپنی اہمیت کا احساس از سرِ نو ابھرنے لگا ۔ بازاروں میں گھومتے ہوئے دوکانوں میں سجے ہوئے مال کی طرف دیکھ کر یہ احساس اور بھی نکھرنے لگا ۔ پہلے وہ شہر کی چیزوں کو دیکھ کر حسرت آمیز آہیں بھرا کرتے تھے ۔ کیونکہ وہ محسوس کرتے تھے کہ یہ تمام چیزیں اُن کی پہنچ سے باہر ہیں ۔ لیکن اس روز وہ چیزیں حقیر سی دکھائی دے رہی تھیں ۔ کوئی خوش پوش جوان پاس سے گذرتا تو اپنے پھٹے ہوئے کوٹ پر شرم محسوس کرنے کے بجائے اُن کے چہرے پر تحقیر آمیز مسکراہٹ پھیل جاتی اور وہ اِک شانِ استغنا سے آگے نکل جاتے ۔

اخبار والے کو دیکھ کر ان جانے میں ان کا ہاتھ جیب ٹٹولنے لگا ۔ اس سے پہلے وہ ریڈنگ روم میں چلے جایا کرتے تھے ۔ اور چند سرخیاں دیکھ کر لوٹ آتے ۔ خبروں میں انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ وہ ایسا محسوس کرتے جیسے وہ باتیں کسی اَن دیکھی دنیا سے تعلق رکھتی ہوں ۔ لیکن اب گویا وہ اخبار خریدنا اپنا حق سمجھتے تھے ۔ انہیں اخباری دنیا سے ایک گہرا تعلق سا محسوس ہونے لگا تھا ۔ جیسے اب وہ خود اخباری دنیا میں آ داخل ہوئے ہوں ۔ حتیٰ کہ مطالعہ کے دوران میں اخبار میں کہیں نہ کہیں اپنا نام دیکھنے کی چھپی چھپی امید لگی رہتی ۔ اگرچہ ابھی

تک یہ امید پوری نہ ہوئی تھی ۔ لیکن اس بات پر اُنہیں دُکھ محسوس نہیں ہوا تھا ۔ سماج کا سرمایہ دارانہ نظام بدل دو ۔ کامریڈ عاصمی کی قرار داد"۔ اخبار کی پہلی سُرخی پڑھ کر وہ بھونچکے رہ گئے "نظام بدل دو ؟ ؟ سماج کو بدل ڈالو ۔ آج شب کو جنتا ٹاکیز میں پرجا مندر کی پیشکش" ان کے پاس ہی گذرتے ہوئے ٹانگے پر لگا ہوا لاؤڈ سپیکر چلّایا ۔ وہ پھر ٹھٹھکے ۔ جھٹ اخبار کو لپیٹ کر جیب میں ٹھونس لیا اور جلدی جلدی قدم اٹھانے لگے ۔ جیسے اس چیختے چلاتے ہوئے متحرک ٹانگے سے دور بھاگ رہے ہوں ۔ جلدی سے انہوں نے چاروں طرف دیکھا ۔ سامنے دو آدمی پنواڑی کی دوکان پر کھڑے ان کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ اُدھر دودھ والا تمسخر آمیز انداز میں ہنس رہا تھا ۔ چوک میں کھڑا ہوا سپاہی انہیں گھور گھور کر دیکھ رہا تھا ۔ انہوں نے محسوس کیا جیسے وہ سب ان کے راز سے واقف تھے ۔ اس احساس پر اُنہوں نے اپنی رفتار کم کر دی لیکن اس کے باوجود وہ اس چوک سے دور چلے جانا چاہتے تھے ۔ دُور دُور ۔ اپنے کارخانے کی طرف ۔

سامنے شیخ احمد علی کا کارخانہ دیکھ کر وہ رُک گئے ۔ دونوں چمنیوں سے دھواں نکل رہا تھا ۔ نیچے سفید چار دیواری میں بڑے پھاٹک پر ایک پٹھان لاٹھی لئے کھڑا تھا ۔ اندر چار ایک روئی سے بھرے ہوئے چھکڑے کھڑے تھے جن کے اردگرد مزدوروں کے گروہ تھے ۔ احمد علی کا کارخانہ دیکھ کر انہیں اپنا کارخانہ یاد آیا ۔ گردن ازسرِنو اکڑ گئی ۔ دل میں احمد علی کا سا وقار پیدا ہوگیا ۔ اور وہ خراماں خراماں آگے بڑھنے لگے ۔ کونے میں چھپی ہوئی سگرٹ کی دوکان دیکھ کر وہ ادھر ہوئے اور ٹکہ دے کر بولے ۔ "دو سگرٹ"! ابھی وہ سگرٹ سلگانے بھی نہ پائے تھے کہ دوکان پر رکھا ہوا سیٹ چلّانے لگا ۔ زمینوں اور کارخانوں کو قوم کی ملکیت قرار دینے کی تجویز پر حکومت غور کر رہی ہے ۔" سلگتی ہوئی رسّی ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی ۔ دوکاندار مسکرانے لگا ۔ اُس کی معنی خیز مسکراہٹ دیکھ کر وہ عجلت سے آگے بڑھے ۔ "لاحول ولاقوۃ" نہ جانے کس بات پر وہ ان جانے میں لاحول پڑھنے لگے ۔ پھر دفعتاً انہوں نے محسوس کیا کہ سگرٹ بجھا جا رہا ہے ۔ اسے چمکانے کے لئے انہوں نے دو لمبے لمبے کش لگائے ۔

دفعتاً اُن کی نگاہ دیوار پر پڑی ۔ سامنے موٹے حروف میں لکھا تھا ۔ "جنتا

جاگی ۔ عوام کا اپنا روزنامہ" نیچے ایک بھاری بھر کم مزدور پھاوڑا اٹھائے یوں کھڑا تھا ۔ جیسے کارخانے کو گرانے آرہا ہو ۔ "لاحول ولاقوۃ"! وہ گھبرا کر آگے نکل گئے ۔ نہ جانے اس روز رام لال کی دوکان اس قدر دور کیوں ہوگئی تھی ۔

"کیسا بے ہودہ راستہ ہے"۔ انہوں نے قریب ہی ایک بچے کو پھسلتے ہوئے دیکھ کر اپنے آپ سے کہا ۔ عین اس وقت ان کی نظر دائیں طرف کے مختصر سے پارک میں ایک تن تنہا بنچ پر پڑی ۔ اس تن تنہا خالی بنچ کو دیکھ کر انہیں تھکن محسوس ہونے لگی ۔ اور وہ ستانے کے لئے بنچ پر جا بیٹھے ۔

بنچ پر بیٹھے ہوئے اُنہوں نے دور سے واحد کو آتے دیکھا ۔ اس وقت اُسے دیکھ کر انہوں نے خوشی بھرا اطمینان محسوس کیا ۔ جیسے پردیس میں بیگانوں کے درمیان کسی ایسے عزیز کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے جس پر بھروسہ کیا جا سکے ۔ "واحد واحد"! انہوں نے باآواز بلند پکارا ۔ آواز سن کر واحد ٹھٹھکا اُس نے بڑھ کر ادھر دیکھا ۔ والد کو پہچان کر ایک ساعت کے لئے رکا جیسے کچھ سوچ رہا ہو ۔ اس کے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں تھے ۔ "واحد"! وہ بولے "کہاں جا رہا ہے تُو"

"جہاں میری مرضی"! وہ غصّے میں چلّایا ۔ "آپ کو اس سے کیا ؟"

"ہائیں !" وہ حیران رہ گئے ۔

"کیا کہہ رہا ہے تو؟" "میری بات سُننے کی تکلیف آپ کیوں کرنے لگے"۔ وہ قریب آکر بولا۔ " یہ دیکھئے"! اُس نے اپنے کوٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔ تین مہینے سے منتیں کر رہا ہوں کہ مجھے ایک کوٹ بنوا دیجئے ۔ لیکن آپ نے پروا تک نہیں کی ۔ اتنا خیال بھی نہ آیا آپ کو کہ میں یہاں سردی میں ٹھٹھر رہا ہوں ۔ یہ دیکھئے"۔ اس نے پھٹی ہوئی آستینوں کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ۔ "کیا یہ کوٹ کسی شریف آدمی کے پہننے کے لائق ہے ۔ لیکن آپ کو میری تکلیفوں کی کیا پرواہ ۔ آپ کو تو صرف روپیہ جمع کرنے کی فکر لگی ہے ۔ آپ تو لکھ پتی بننا چاہتے ہیں"۔ وہ رُک گیا ۔

"لکھ پتی" !!! انہوں نے محسوس کیا جیسے واحد نے اُن کے منہ پر طمانچہ دے مارا ہو ۔ جیسے وہ بھی اُن کے راز سے واقف ہو ۔ "لعنت ہے ایسی دولت پر" وہ چلّایا ۔ "جو اپنوں کا پیٹ کاٹ کر جمع کی گئی ہو"۔ معاً ان کی نظر اپنے

پھٹے ہوئے بوٹ پر پڑی ۔ پھر اُنہوں نے اپنے پھٹے ہوئے کوٹ کی طرف دیکھا ۔ اور واحد سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اُن کی زبان گویا منہ میں معلق رہ گئی تھی ۔ "واحد" !! کہہ کر وہ رُک گئے ۔ آنکھیں بھیگ گئیں ۔ واحد کو جاتے دیکھ کر ۔ وہ تڑپ کر لپکے ۔ "واحد" ٹھیرو تو"۔ "ٹھیروں کیسے"۔ وہ بولا "نوکری کر لی ہے"۔ وہ حیران رہ گئے ۔ "کب تک آپ کے ٹکڑوں پر پڑا رہتا۔" اور وہ چل پڑا ۔ اُنہوں نے گھبرا کر اس کے پیچھے دوڑنے کی کوشش کی لیکن ابھی چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ کینوس کا ایک بڑا سا متحرک تختہ واحد اور ان کے درمیان آکھڑا ہوا ۔ تختے کے نیچے پہیّے لگے ہوئے تھے اور ایک چھوٹا سا لڑکا اسے دھکیل رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ رُک گئے ۔ پھر جو اُنہوں نے تختے کی طرف غور سے دیکھا تو اس پر موٹے حروف میں "لکھ پتی" لکھا تھا ۔ لڑکا اُنہیں ٹھٹھکے ہوئے دیکھ کر دانت نکالنے لگا ۔ جیسے انہیں چڑا رہا ہو ۔ "آج شب کو کراؤن ٹاکیز میں "لکھ پتی" اشتہار کی طرف غور سے دیکھ کر اُن کے تن بدن میں گویا آگ لگ گئی ۔ لیکن لڑکے کی زیر لب ہنسی کو محسوس کر کے کھسیانے سے ہوگئے ۔ عین اُس وقت کسی نے اُنہیں پکارا ۔ "چچا صمدو ! چچا صمدو !" اور وہ بوکھلا کر چاروں طرف دیکھنے لگے ۔ حتےٰ کہ شیخ عظمت اللہ نے پیچھے سے آکر اُن کا بازو پکڑ لیا ۔ "میں نے کہا تم یہاں کہاں" ؟ عظمت اللہ چلاّئے ۔ "اس شہر میں آنا تو مصیبت ہے ۔ دیکھو تو میلا لگا ہوا ہے ۔ میلا ۔ ہی ہی ہی ہی !" وہ ہنسے ۔ "یہاں آکر لکھ پتی اور مجھ سا فاقہ مست سب ایک ہو جاتے ہیں ۔ سب ایک ہو جاتے ہیں ۔ ہی ہی ہی ہی !!"

"تم کیسے آ گئے یہاں" وہ کچھ کہنے کی خاطر بولے ۔ "یہ دیکھو یہ"۔ عظمت اللہ نے دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا پنجرا بڑھاتے ہوئے کہا ۔ "اخاہ کیا بٹیر ہے یہ ۔ اصلی لڑاکا نسل کا ہے ۔ اجی کیا کہنے ہیں ۔ میدان کا سورما ہے ۔ سورما ۔ یہ دیکھو ۔" انہوں نے چابکدستی سے بٹیر کو پنجرے میں سے نکال کر اُنہیں دکھاتے ہوئے کہا گردن کی یہ دھاریاں اور چھوٹی تیز چونچ دیکھا اصلی نسل کی یہی نشانی ہے ۔ ہاں ۔ پورے پچیس روپے میں خریدا ہے ۔ کیا چیز ہے ۔ اُف"۔ "پچیس روپے"؟ عبدالصمد نے حیرانی سے دہرایا ۔" اجی پچیس روپے کیا

چیز ہیں ۔ اسے تو میں پچاس روپے پر خریدنے کے لئے راضی تھا ۔ وہ تو سمجھو رورعایت میں پچیس لے لئے اس نے مجھے جانتے ہیں نا یہاں ۔ ہاں یہ سمجھ لو کوڑیوں کے مول ہاتھ آگیا ہے ۔" "لیکن پچیس ! روپے" شیخ عبدالصمد بڑبڑائے ۔ ہی ہی ہی ہی" شیخ عظمت ہنسنے لگا "تم سے لکھ پتی تو صرف روپے کی قدر جانتے ہیں ۔ چیز کی نہیں ۔ ہی ہی ہی ہی ۔" عبدالصمد کا رنگ پیلا پڑگیا ۔ دل ڈوب گیا ۔ "ویسے بات کر رہا ہوں"۔ شیخ عظمت ہنستے ہوئے بولے ۔ "وہ دھن وان کیا جانیں جینے کی لذت کو بیچارے"!! آج شیخ محمد علی کرختے والے کے پاس گیا تھا ۔ وہاں معلوم ہوا کہ لوہے کے سٹے میں انہوں نے آدھا لاکھ کمایا ہے ۔ آدھا لاکھ سوچنے کی بات ہے ۔ پر شیخ نے یہ خبریوں سنی گویا کچھ ہوا ہی نہیں ۔ ابی ایک لاکھ آجائے یا چلا جائے کیا فرق پڑتا ہے اور یہاں یہ حالت ہے کہ پچھلے چھ مہینے سے یہ بٹیر خریدنے کو جی تڑپ رہا تھا ۔ کل ۲۵ روپے کہیں سے ہاتھ لگے تو سیدھا یہاں چلا آیا ۔ جب سے خریدا ہے ایمان سے ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ جیسے قارون کی دولت مل گئی ہو ۔ جی چاہتا ہے سڑک پر کھڑا ہو کر ناچوں ۔ یہ خوشیاں ہم قلاشوں کو ہی نصیب ہیں ۔ دھن وانوں کو نہیں ۔ اب تم احمد علی کو دس ہزار کی موٹر دے دو ۔ کیا فائدہ اُسے کیا خوشی ہوگی اِس بات پر ۔ اونہوں ۔ ابی خوشی تو ہمیں ہوگی جب اس پنجرے کا ریسمیں غلاف بنائیں گے ۔ میں کہتا ہوں بھائی بڑا رحیم و کریم ہے وہ ۔ جسے پیسہ دیا ہے اس کے دل سے خوشی چھین لی ہے ۔ اب یہی دیکھو ۔" عظمت نے لکھ پتی والے پوسٹر پر بنی ہوئی تصویر کی طرف اشارہ کیا ۔ ویسے لکھ پتی ہے لیکن جیسے تپ دق کا مریض ہو ۔ ہی ہی ہی ہی"۔ وہ ہنسے ۔ بے چارا تماشہ بنا ہوا ہے ۔ ہی ہی ہی ہی ۔ ابی آج تو وہ دن آیا ہے کہ بے چارے لکھ پتی کاروں میں منہ چھپائے جان بچانے کے لئے بھاگے پھر رہے ہیں ۔ نہ لوگوں کی ہمدردی نصیب ہے ۔ نہ دل کی خوشی ۔ ہی ہی ہی ہی ۔ اچھا تو میں چلتا ہوں" عظمت نے عبدالصمد سے زبردستی ہاتھ ملاتے ہوئے کہا ۔ "کب آؤ گے واپس بھئی جلدی آجانا ۔ کہیں کھو نہ جانا ۔ یہاں" ہی ہی ہی ہی ۔ اور وہ ہنستے ہوئے چلا گیا ۔

لمحہ بھر کے لئے تو وہ حیران کھڑے رہے ۔ ویسے تو شیخ عظمت مانا ہوا باتونی تھا ۔ قصور میں سب اُسے گپّی کہا کرتے تھے لیکن اس روز اس کا ایسی باتیں کرنا !! نہ جانے اُن سب کو شیخ عبدالصمد کے لکھ پتی ہونے کا کیسے علم ہو چکا تھا ۔

لکھ پتی !! ہا ہا ہا ہا ۔ پاس ہی کوئی قہقہہ مار کر ہنسا ۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا ۔ وہ لفنگے پوسٹر کے پاس کھڑے تصویر کا منہ چڑا رہے تھے ۔ "اچھا تماشہ ہے یہ لکھ پتی"۔

"سالے کو وہ پڑتی ہیں کہ سمجھ آجاتی ہے"۔ دوسرے نے تصویر کی طرف پاؤں چلاتے ہوئے کہا ۔

عبدالصمد نے محسوس کیا جیسے وہ اس سے مخاطب ہیں ۔ وہ جلدی جلدی آگے چلنے لگے ۔ لیکن سڑک پر بھیڑ دیکھ کر اُن کا دل مارے خوف کے بیٹھنے لگا ۔ یوں معلوم ہو رہا تھا ۔ گویا تمام دنیا لکھ پتیوں کے خلاف اُٹھ کھڑی ہو ۔ خالی تانگہ دیکھ کر وہ بھاگ کر اُس پر جا بیٹھے ۔ یوں تانگے پر بیٹھنے کا پہلا موقعہ تھا ۔ اول تو وہ تانگے پر بیٹھا ہی نہ کرتے تھے ۔ اور کبھی بیٹھنے پر مجبور بھی ہو جاتے تو دیر تک تانگے والے سے جھگڑتے رہتے ۔ نہیں ۔ نہیں ۔ بھئی ہم تو دو آنے دیں گے ۔ لیکن آج اُنہیں کرایہ چکانے کا خیال تک نہ آیا تھا ۔

رام لال سے اُنہوں نے اپنے بنک کی کاپی لی اور اسی تانگے پر لوٹ آئے ۔ رام لال بھی حیران تھا کہ آخر ان کی پریشانی کی وجہ کیا تھی ۔ لیکن اُس نے اِس بارے میں بات چھیڑنا مناسب نہ سمجھا ۔ کاپی لے کر اُنہوں نے واسکٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لی اور اُسے اپنے بازوؤں میں دبا لیا ۔ اِس طرح شاید وہ اپنے اس راز کو محفوظ کر لینا چاہتے تھے ۔

راستے میں ہر قدم پر اُن کی جیب میں کاپی بوجھل ہوئی جا رہی تھی ۔ وہ بازو جس سے انہوں نے کاپی کو سینے سے لگا رکھا تھا ۔ سُوجا ہوا محسوس ہوتا تھا ۔ اُن کی خواہش تھی کہ ایک بار گھر پہنچ جائیں ۔ پھر وہ اس کاپی کو صحن کے اس کونے میں دبا دیں گے ۔ جہاں کبھی ان کی والدہ نے زیور دبایا ہوا تھا ۔ بس صرف گھر پہنچنے کی دیر ہے ۔ پھر وہ راز محفوظ ہو جائے گا ۔

لیکن گھر پہنچ کر نہ جانے اُنہیں کیا ہوا ۔ اک اضطراب سا چھا گیا ۔ دم گھٹنے لگا ۔ اور دفعتاً انہیں محسوس ہوا ۔ جیسے وہ اکیلے اس بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتے ۔ جو ہر لمحہ ان کے دل کو کچلے جا رہا تھا ۔ اُس خوفناک راز سے چھٹکارا پانے کی خواہش ان پر حاوی ہوئی جا رہی تھی ۔ یہ راز اُنہیں پاگل بنا دے گا ۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل کی خوشی کو کچل دے گا ۔

"واحد کی ماں" وہ بولے ۔ "واحد کی ماں"۔ ان کی بھرائی ہوئی آواز سن کر بیوی چونکی ۔ "ہائیں کیا ہے تمہیں ۔ میں نے کہا ۔ لاکھ روپیہ ۔ ایک لاکھ"۔ اُن کا حلق سُوکھ گیا ۔

"لاکھ روپیہ !! کیا کہہ رہے ہو ۔ شہر سے پی تو نہیں آئے ۔" "نہیں ۔ نہیں"۔ وہ بولے "ہمیں ایک لاکھ روپیہ ملا ہے ۔ ایک لاکھ روپیہ !!" میں کہتی ہوں وہاں شہر میں روپے بٹ رہے تھے کیا ۔" "نہیں نہیں۔" وہ بولے ۔ "تو کیا سٹہ لگایا تھا ۔" وہ ازراہِ مذاق کہنے لگی ۔ "ہاں ہاں" وہ بے خبری میں گنگنائے ۔ "یہ لو" اُنہوں نے وہ کاپی نکال کر اُس کی طرف پھینک دی ۔ "واحد کے ابا"۔ وہ چلائی ۔ "سچ کہہ رہا ہوں"۔ "ایک لاکھ ۔" واحد کی ماں نے چیخ ماری ۔ "نہیں ، تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو ۔" "اب چاہے جتنے ہار بنوالو ۔ وہ اپنی ہی دھن میں بولے ۔ "ہار" وہ کتاب کو سینے سے لگا کر بولی ۔ "میں کیا پاگل ہوں کہ ہار بنواؤں ۔" "واحد نے ہم سے خفا ہو کر نوکری کر لی ہے ۔" وہ بولے ۔

"واحد ملا تھا ؟" واحد کی ماں نے سرسری طور پر پوچھا ۔ "ہاں ۔ اب تم ہی بنوا کے دو اسے گرم کوٹ ۔"

"پھر سردیاں آئیں گی تو دیکھا جائے گا" وہ بے پروائی سے بولی ۔ "پر وہ تو خفا ہو گیا ہے ۔" اُنہوں نے کہا ۔ "ہونے دو ۔ ایسی بھی کیا ضد ہوئی ۔" وہ چلائی ۔ "تم نے تو اسے سر پر چڑھا رکھا ہے"۔

معاً انہوں نے محسوس کیا جیسے ان کے دل سے بوجھ اُٹھ گیا ہو ۔ جیسے انہوں نے کسی آفت سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا ہو ۔

واحد کی ماں نے دیوانہ وار کاپی کو دوپٹے میں لپیٹ کر یوں سینے سے لگا

لیا جیسے وہ کوئی خوفناک راز ہو ۔ "کسی سے بتایا تو نہیں" وہ اُن کی طرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی ۔ یہ کہتے ہوئے اُس کا حلق خشک ہوگیا ۔ جیسے ڈر سے گھگی بندھ گئی ہو ۔ "واحد کے ابا" وہ اُن کی طرف دیوانہ وار دیکھتے ہوئے خوفناک آواز میں چلّائی ۔ "دروازہ بند ہے نا ۔ واحد کے ابّا ۔" اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں ۔ منہ سوج گیا تھا ۔ ہاتھ کانپ رہے تھے ۔ جیسے رعشہ کی مریض ہو ۔ عبدالصمد نے اُن کی طرف دیکھا ۔ "تت تت" خواہ مخواہ اُن کے منہ سے نکل گیا ۔ بیچاری ۔

○

ماں

بڑھیا کا دوپٹہ شانوں پر گرا ہوا تھا ۔ گرد آلود بالوں کی ایک لٹ منہ پر آپڑی ۔ وہ قہر بھری نگاہوں سے نیچے چوگان کی طرف گھور رہی تھی ۔ سلاخ دار کھڑکی میں اسے یوں بیٹھے دیکھ کر ایسے معلوم ہوتا تھا ۔ جیسے وہ جگہ پاگل خانے کا ایک حصّہ ہے ۔

ریاض کی چیخ سن کر وہ دیوانہ وار اُٹھی ۔ "ہائے اللہ ۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا ۔ اور سیڑھیوں کی طرف بھاگی ۔ "کیا ہوا میرے لال کو ؟" ریاض کو بسورتے ہوئے آتے دیکھ کر ایک ساعت کے لئے بڑھیا نے اطمینان کا سانس لیا ۔ "توبہ !! میں نے کہا نہ جانے کیا ہوگیا ۔ توبہ !!" بیٹے کی خیریت سے مطمئن ہو کر بڑھیا غصے میں غرانے لگی ۔ "کس نے مارا ہے تجھے ؟ جاجی ۔ تو بتائے گا بھی یا نہیں ؟ میں کہتی ہوں کیوں رو رہا ہے تو ؟ گر پڑا تھا کیا ؟ دھکا دیا ہے کسی نے ؟ ادھر آ ۔" اُس نے لڑکے کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا اور سر پر ہاتھ پھیر کر لاڈ سے بولی ۔ "ایک بار تو اپنی ماں کو بتا دے پھل دیکھیو ۔ تو تو میلے جگر کا ٹکلا ہے ۔ ہاں ہاں کچھ بول تو سہی ۔" ریاض نے دو ایک جھوٹی ہچکیاں لیں اور بولا ۔ "بیدی نے میرا گھر ۔" "کیا کیا ہے بیدی نے" بڑھیا چلاّئی ۔ میرا گھر ۔" جاجی بسورنے لگا ۔ "کیا کیا ہے اس نے تیرے گھر کو ؟" "توڑ ۔ دی ۔ یا ۔ ہے ۔" جاجی ہچکیاں لیتے ہوئے بولا ۔ "کونسا گھر ؟" بڑھیا نے پوچھا ۔ "تو کچھ بتائے گا بھی یا نہیں ۔" "جو میں نے بنایا تھا ۔" جاجی زیرِ لب بڑبڑایا ۔ "اینٹوں سے ۔" "میں پوچھتی ہوں ۔" بڑھیا اُٹھ بیٹھی ۔ تیرا گھر توڑنے والی وہ ہے کون ناک کٹی ! مردود !! آ تو لے یہاں وہ چھوکری میں نے اُس کی ٹانگیں نہ توڑ ‌دیں تو ۔ بڑی بنی پھرتی ہے نواب زادی ۔ بچوں کے گھر توڑتے ہوئے شرم تو نہیں آتی" جوں جوں وہ کھڑکی کے

قریب آتی گئی ۔ اُس کی آواز بلند تر ہوتی گئی ۔ کھڑکی کے پاس پہنچ کر اُس نے جاجی کو چٹائی کی طرف دھکیل دیا جو کمرے کے ایک طرف بچھی ہوئی تھی اور پھر دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی ۔ "دہائی خدا کی" اس نے دایاں ہاتھ چلا کر یوں بات شروع کی جیسے نیچے چوگان میں سامعین کا مجمع جمع ہو ۔ "جب بھی لڑکا کھیلنے نکلتا ہے یہ چھوکری اُسے تنگ کرتی ہے چڑیل کہیں کی ۔ اب اماں کی گود میں جا چھپی ہے دوڑ کر ۔ کوئی پوچھے تجھے اس بات سے مطلب ؟ چاہے وہ گھر بنائے یا حویلی ۔ تو کیوں جل کٹ جاتی ہے ۔ میرا بیٹا تو یہیں کھیلے گا ۔ اسی میدان میں ہاں ۔ یہیں گھر بنائے گا ۔ اور میں دیکھوں گی کون توڑتا ہے اُسے ۔ بڑی لاڈو تو دیکھو جو لوگوں کے گھر توڑتی پھرتی ہے ۔ لاڈو ہے تو اپنی ماں کی ہوگی ۔ جا بیٹھا کرے اس کی گود میں ۔ یہاں میدان میں تو بچے کھیلیں گے ۔ کیوں نہ کھیلیں ہاں ۔ یہ میدان ہے کسی کا اجارہ نہیں اس پر ۔" بولتے بولتے بڑھیا کا دم چڑھ گیا ۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگا ۔ اس دوران میں کچھ دیر کے لئے وہ خاموش ہو کر چاروں طرف دیکھتی رہی ۔ اردگرد کے گھروں پر خاموشی طاری تھی ۔ چاروں طرف ویرانہ معلوم ہوتا تھا ۔ کھڑکیاں خالی پڑی تھیں ۔ کوئی شخص یا جانور حرکت کرتا ہوا دکھائی نہ دیتا تھا ۔ دُور سامنے دھوئیں کا ایک ستون سا لہرا رہا تھا اور چکی یوں ہونک رہی تھی ۔ جیسے دبی آواز میں اُس کا منہ چڑا رہی ہو ۔ یہ چھائی ہوئی خاموشی بڑھیا کے لئے ناقابلِ برداشت تھی ۔ وہ چاہتی تھی ۔ کہ کوئی اس کے روبرو آکر اُس کی باتوں کا جواب دے جیسے ۔ یا جواب نہیں دے تو اس کی باتیں سنے ۔ لیکن وہ خاموشی ۔ وہ یوں محسوس کر رہی تھی وہ خاموشی اسے چڑا رہی ہو ۔ محلے والے خاموشی کی اوٹ میں اس پر ہنس رہے ہوں ۔ اُس کی باتوں کا مذاق اڑا رہے ہوں ۔ یہ محسوس کر کے غصے سے اُس کی آنکھیں سرخ ہوگئیں ۔ اور وہ تازہ دم ہو کر پھر سے غرانے لگی ۔ "اب کیوں نہیں بولتی ۔ سچی ہے تو سامنے آئے نا ۔ کہتے ہیں جھوٹے کے پاؤں نہیں ہوتے ۔ جبھی تو سامنے آکر کھڑے ہونے کی ہمت نہیں پڑتی ۔ پر میں بتائے دیتی ہوں ۔ اب کے لڑکے کی طرف انگلی اٹھائی تو ناک چوٹی کاٹ لوں گی ہاں ۔"

آہستہ آہستہ بڑھیا کی گرج دھیمی پڑتی گئی ۔ حتیٰ کہ غرانے کی بجائے اس

نے بڑبڑانا شروع کر دیا ۔ کھڑکی کے ساتھ والی الماری سے کٹورے میں دال ڈالی اور کھڑکی میں بیٹھ کر اس میں سے کنکر چننے شروع کر دیئے ۔ اس کے باوجود اس کی بڑبڑاہٹ میں کوئی فرق نہ آیا ۔ حتیٰ کہ اُسے یہ احساس بھی نہ رہا کہ وہ بڑبڑا رہی ہے اور یبدی کی ماں ہی نہیں ، بلکہ سارے محلے کو کوس رہی ہے ۔

بڑھیا کا دوپٹہ شانوں پر گر گیا ۔ گرد آلود بالوں کی ایک لٹ منہ پر آگری ۔ سلاخدار کھڑکی میں اسے یوں بیٹھے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مکان پاگل خانے کا کوئی حصہ ہو ۔

دفعتاً بڑھیا نے مڑ کر چٹائی کی طرف دیکھا ۔ وہاں ریاض کا نشان تک نہ تھا ۔ "ہائے رے اس نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا ۔ لو پھر غائب ہوگیا ۔ ہزار بار کہا ہے اپنے گھر میں آرام سے بیٹھا کر ۔ پر اس کی قسمت میں آرام سے بیٹھنا ہو بھی ۔ ان شیطانوں سے ملے بنا چین نہیں پڑتا ۔" اس نے دال کا کٹورا کھڑکی میں رکھ دیا اور اُٹھ کھڑی ہوئی ۔ "نہ جانے کہاں گم ہوگیا ہے ۔ ہائے کتنا پیار ہے اُسے اپنے ساتھیوں سے ۔ چاہے وہ اُسے پیٹتے ہی کیوں نہ رہیں ۔ ان کے بغیر پل بھر نہیں رہ سکتا ۔ اُسے کیا معلوم کہ لوگ کیسے بیری ہیں ؟ اس کی جانے بلا ۔ جاجی ۔ او جاجی" بڑھیا نے سیڑھیوں کے قریب جا کر آواز دی ۔ اور پھر وہ ایک ساعت کے لئے خاموش کھڑی رہی ۔ "اب وہ کہیں ہو تو جواب دے ۔ نہ جانے کہاں چلا گیا ہے ۔ توبہ یوں دبے پاؤں پاس سے نکل جاتا ہے کہ آہٹ تک نہیں ہوتی ۔ اب میں کیا انتظام کروں اس لڑکے کا ۔" بڑھیا نے سیڑھیوں میں جھانکتے ہوئے کہا ۔ ابھی روتا ہوا آجائے گا ۔ کوئی دھکا دے گا ۔ یا منہ پر تھپڑ مار دے گا ۔ اس محلے کے بچوں کا کیا اعتبار ہے ۔" وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی ۔ "ایسے چالاک ہیں یہ سب ۔ اور جاجی اُسے تو کچھ پتہ ہی نہیں دنیا کا ۔"

کوٹھے پر پرلے کونے میں جاجی، بھپو اور نجو کو کھیلنے میں منہمک دیکھ کر ایک ساعت کے لئے وہ ٹھٹھکی ۔ پھر اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی ۔ لیکن جلد ہی اُس کے چہرے پر خونخوار سنجیدگی چھاگئی ۔ بھوئیں تن گئیں اور کولہوں پر ہاتھ رکھ کر وہ یوں کھڑی ہو کر بچوں کی طرف دیکھنے لگی ۔ جیسے کوئی

پولیس والا کسی کو جرم کرتے ہوئے دیکھ کر فاتحانہ انداز سے اُسے گھورتا ہے ۔
کونے میں بھپو بیٹھی تھی ۔ اس کے سر پر ٹاٹ کا پرانا ٹکڑا گھونگھٹ کی طرح لٹک رہا تھا ۔ نجو گھٹنے ٹیکے اس کے گھونگھٹ کو سنوار رہا تھا ۔ اور جاجی سیاہی سے اپنے منہ پر مونچھ بنا رہا تھا ۔ "بس اب ٹھیک ہے" نجو بولا ۔ "ہے نا بھئی ؟ تم ہو گھر والی اور میں گھر والا ۔" یہ سن کر جاجی نے وہ ٹھیکرا پھینک دیا ۔ جس میں توے کی سیاہی پڑی تھی ۔ "اوں" وہ بسورنے لگا ۔ "گھر والا تو میں ہوں ۔" نجو ہنستا ۔ "تم ؟" اس نے تحقیر آمیز انداز سے جواب دیا ۔ "کیوں بھپو" ججی نے جھک کر اس کا گھونگھٹ اٹھایا ۔ "یہ دیکھو میرے منہ پر مونچھ بھی ہے ۔ ہے نا بھئی ۔ اور نجو کے منہ پر تو کچھ بھی "نہیں" مونچھ کا کیا ہے ۔" نجو بے پروائی سے بولا ۔ "یہ لو" اُس نے انگلی سے ہونٹ پر سیاہی لگاتے ہوئے کہا ۔ "جاجی تو مہمان ہے مہمان ۔ جو گھر میں آیا کرتے ہیں ملنے کے لئے ۔ وہ مہمان" "یہ گھر تو ہمارا ہے ۔" جاجی چیخنے لگا ۔ "ملنے تو تم آئے ہو ۔ کیوں بھپو ۔" اُس نے دلہن سے پوچھا ۔ "ہاں" وہ بولی ۔ "ہم دونوں ملنے آئے ہیں ، میں اور بھپو ۔" نجو نے فاتحانہ انداز سے بھپو کی طرف دیکھا ۔ "ہم دونو مہمان ہیں تمہارے ۔" نجو نے کہا ۔ "تو پھر ہم نہیں کھیلتے ۔" جاجی بسورنے لگا ۔ گھر والی نے اپنا گھونگھٹ اتار کر پرے پھینک دیا ۔ معاً اس کی نگاہ بڑھیا پر پڑی اور وہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی ۔ نجو نے جاجی کی ماں کو دیکھا تو نظر بچا کر سیڑھیوں کی طرف بھاگا ۔ جاجی سہما ہوا کھڑا کا کھڑا رہ گیا اور ماں کی طرف نہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا ۔ "ہزار بار کہا ہے تجھ سے" بڑھیا غرائی ۔ "کہ بھپو اور نجو سے نہ کھیلا کر ابھی تو کل ہی بھپو نے تیرا پیسہ چرا لیا تھا ۔ چوٹی کہیں کی ! گھر والی بن کر تیرے پیسے چرا لیتی ہے ۔ مکار !! توبہ ذرا سی لڑکیوں کو کتنے فریب کرنے آتے ہیں ۔ کیا زمانہ آیا ہے ۔ اور وہ نجو !! اللہ بچائے اس سے ۔" بڑھیا نے لپک کر جاجی کا بازو پکڑ لیا اور اُسے گھسیٹ کر سیڑھیوں تک لے آئی "کہتی ہوں یہ جوڑا دور ہی رہے تو اچھا ہے ۔ لیکن تو سنے بھی کسی کی ۔ آ اب چل نیچے ۔" اُس کی آواز میں غصے اور پیار کے امتزاج کی عجیب سی جھلک تھی ۔
"نجو کی ماں تجھے اپنے گھر جانے دیتی ہے کیا ۔ ہوں؟ ابھی تو کل ہی کہہ رہی تھی

اے ہے کتنا گندا ہے تو جا گھر جا کر منہ دھو آ کیوں ؟ میرے لال کا منہ دیکھا نہیں جاتا کیا ۔ اپنے کا تو منہ دیکھے کبھی پانی تک نہیں چھوا ۔ اللہ ماری ناک بہتی ہے ۔ چھلکے جم جاتے ہیں ۔ اور وہ بھپو کی بہن ناک چڑھائے بغیر بات نہیں کرتی ۔ لے بیٹھ یہاں ۔" بڑھیا نے ریاض کو چٹائی پر دھکیلتے ہوئے کہا ۔ ریاض رونے لگا ۔ اُسے روتے دیکھ کر بڑھیا کا غصہ یکدم کافور ہوگیا ۔ پیار سے دونوں ہاتھ اُس کے منہ پر پھیر کر بولی ۔ "نہ میرے لال رو نہ تو ۔ میں تو تیرے ہی بھلے کی کہتی ہوں ۔ تو نہیں جانتا یہ نجو اور بھپو تو دونوں بھتنے ہیں بھتنے اور تو ۔ تُو تو اس گھر کا روشن دیا ہے ۔ تو کیا جانے انہیں ، یہ تو سب چالاک ہیں مطلب کے وقت آجاتے ہیں ہاں ۔ ان کے ساتھ نہ کھیلا کر تو ۔"

"میں تو نہیں کھیل رہا تھا ان کے ساتھ" جاجی منہ لٹکا کر بولا ۔ "وہ کھیل رہے تھے ۔ میرے ساتھ" نجو نے مجھے بلایا تھا اور میں اس کے ساتھ اوپر چلا گیا ۔ "ہاں میرے لال" بڑھیا اُسے پچکارنے لگی ۔ "تجھے کیا معلوم جو بھی پیار سے بلائے تو اس کے پاس چلا جاتا ہے ۔" "پیار سے تو نہیں بلایا تھا ۔" جاجی چمک کر بولا ۔ "ویسے ہی بلایا تھا ۔"

بڑھیا کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔ بڑھ کر ریاض کو سینے سے لگا لیا ۔ "تیری جانے بلا ۔" ریاض نے اُسے مسکراتے ہوئے دیکھا تو بولا ۔ "اماں اس وقت تو کوئی نہیں بلا رہا مجھے ۔" "اب تو دفع ہوگئے ہیں ۔" ماں نے جواب دیا ۔ "تو اب میں جاؤں ۔" ریاض نے شوق سے پوچھا ۔ "کہاں جاؤ گے تم" وہ مسکرا کر بولی ۔ "باہر" ریاض نے بازار کی طرف اشارہ کیا ۔ "کیسی اچھی دوکانیں سجی ہیں وہاں ۔ نجو کہتا تھا ۔ ۔ ۔" دفعتاً اپنی غلطی محسوس کر کے وہ رک گیا ۔ "بس تو پھر اُس کالے منہ والے نجو سے جا ملے گا ۔" بڑھیا نے پھر غصے سے کہا ۔ "نہیں اماں" ریاض بولا ۔ "وہ مجھے گھر والا بننے نہیں دیتا ۔ میں اس سے نہیں کھیلوں گا ۔" یہ سن کر بڑھیا پھر ہنسی ۔ ابھی سے گھر والا بننے کا شوق ہے تجھے ۔ آخر اپنے باپ کا بیٹا ہے نا ۔" بڑھیا کی مسکراہٹ میں دبی دبی آہ جھلک رہی تھی ۔ "تین بیاہ کئے" وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی "پر دل نہیں بھرا" "گھر والے کا تو گھر ہوتا ہے اماں ۔" ریاض اپنی ہی دھن میں بولا ۔ "اور مہمان کا تو گھر بھی نہیں

ہوتا ۔" "گھر !!" بڑھیا نے اس ویران کمرے کا جائزہ لیکر لمبی آہ بھری ۔ ریاض نے اُسے اپنے آپ میں کھوئے ہوئے دیکھ کر الماری میں سے ٹوٹا ہوا کبوتر اٹھا لیا اور چپکے سے سیڑھیوں کی طرف چل پڑا ۔ دفعتاً بڑھیا کو احساس ہوا کہ وہ جا رہا ہے ۔ پلو سے آنکھیں پونچھ کر وہ سیڑھیوں کی طرف بھاگی ۔ "جاجی ۔ کسی سے کھیلو نہیں جاجی اور دیکھیو موٹر تانگے کا خیال رکھیو ۔" لیکن ریاض جا چکا تھا ۔ ایک لمبی آہ بھر کر وہ واپس کھڑکی میں آ بیٹھی ۔ ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا اور ہاتھ سے سر تھام کر بیٹھ گئی ۔

"گھر !!" بڑھیا کی آنکھ میں آنسو آ گئے ۔ ریاض کی چھوٹی سی بات نے اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا تھا ۔ بیتی ہوئے باتیں اس کے دل میں تازہ ہو رہی تھیں ۔ ۔ ۔ جب وہ گھر گھر تھا اور وہ گھر والی تھی ۔ جب گھر میں گھر والا اس کے ساتھ رہا کرتا تھا ۔ اب تو وہ گھر ویرانے سے بھی بد تر تھا ۔ پھٹی پرانی ٹوٹی ہوئی چیزیں چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں ۔ گھر والا نہ ہو تو گھر گھر نہیں ہوتا ۔ اس نے سوچا ۔ یہی جگہ پہلے کس قدر صاف ستھری ہوا کرتی تھی ۔ یہاں جاجی کے ابا کی چارپائی ہوتی تھی ۔ وہاں اس کا حقہ پڑا ہوتا ۔ اور اس کھونٹی پر پگڑی ۔ اُس نے ایک لمبی آہ بھری ایک بار پھر پلّو سے آنکھیں پونچھیں، کرتے سے ناک صاف کی اور پھر ٹھوڑی ہاتھ پر رکھ کر بیٹھ گئی ۔

کمرے میں چاروں طرف ٹوٹی پھوٹی چیزوں نے اودھم مچا رکھا تھا ۔ جیسے ان چیزوں کو احساس ہو چکا تھا کہ اب گھر گھر نہیں رہا، اس کا شیرازہ بکھر چکا ہے ۔ بڑھیا نے غور سے الماری میں پڑے کھلونوں کی طرف دیکھا ۔ ایک ساعت کے لئے اُس کی آنکھ میں مسرت کی چمک جھلکی ۔ اس کے ذہن سے سوکن کا خیال اتر گیا ۔ "اپنی جان کھائے ۔" وہ بولی ۔ "چاہے کہیں رہے ۔ مجھے کیا ۔ میرا اپنا لال جیتا رہے خدا زندگی دراز کرے ۔ اس کے ہوتے ہوئے مجھے کس چیز کی کمی ہے ۔ اللہ رکھے جوان ہو گا ۔ چاند سی بہو لائے گا ۔ پھر سے گھر گھر بن جائیگا ۔ میں بھی پاگل ہوں جو خواہ مخواہ گھر والے کے بارے میں سوچتی ہوں ۔ ۔"

نچلی سیڑھیوں سے دبی ہوئی چیخ کی آواز سن کر وہ چونکی اور بھاگ کر اُدھر

گئی ۔ "یا اللہ فضل !! کون ہے ۔" اُس نے سیڑھیوں میں منہ ڈال کر پوچھا ۔ کوئی جواب نہ ملنے پر وہ نیچے اُتر گئی ۔ سب سے نچلی سیڑھی پر ییدی گری پڑی تھی ۔ اُسے دیکھ کر بڑھیا نے دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام لیا ۔ "توبہ میں سمجھی ۔ ۔ ۔" دفعتاً وہ رُک گئی ۔ اور اطمینان کا سانس لے کر بولی ۔ "ہزار بار سمجھایا ہے تمہیں کہ دھیان سے سیڑھیوں پر پاؤں دھرا کرو ۔ لیکن تم سنو بھی کسی کی ۔ ہر بات میں شرارت ہر بات میں شوخی ۔ اچھا ہوا اپنے کئے کی سزا پالی ۔ صبح تمہیں نے حاجی کا گھر توڑا تھا نا ۔ اسے دھکا دیا تھا نا تو نے ۔ اب معلوم ہوا کہ گر کر کیسی چوٹ لگتی ہے ۔ ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا تمہارے ساتھ ۔ جو اوروں کو دھکے دے اس کا یہی حشر ہوتا ہے ۔ اللہ بڑا انصاف والا ہے ۔ ہاں ۔"

بڑھیا کو دیکھتے ہی ییدی کو رونا بھول گیا ۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹی اور پھر اُٹھ کر بھاگ گئی ۔

"توبہ" بڑھیا اسے بھاگتے ہوئے دیکھ کر چلائی ۔ "یہ سب بھتنے ہیں بھتنے ۔ کسی بات کا اثر نہیں ہوتا ان پر ، ڈھیٹ کہیں کے ۔ چوٹ کھا کر بھی آرام نہیں آتا انہیں ۔ ان پر خدا کی مار ۔ یوں دور بھاگتے ہیں مجھ سے جیسے میں کوئی ڈائن ہوں ۔ کہتے ہیں کوئی نصیحت کی بات نہ کرے ۔ جیسے جی میں آئے کریں کوئی روکنے والا نہ ہو ۔ توبہ کیا زمانہ آیا ہے ۔" بڑبڑاتے ہوئے وہ کوٹھے پر چڑھ آئی ۔ "مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کسی کو نصیحت کرنے کی ۔ چاہے ہر روز سیڑھیوں میں گریں ۔ مجھے کیا ۔ لیکن گرنے کے لئے کیا ہماری سیڑھیاں ہی رہ گئی ہیں ۔ گرنا ہی ہے تو کہیں اور جا کر گریں ۔ لیکن اُنہوں نے تو میرے ماتھے پر ہی کلنک لگانے کی قسم کھا رکھی ہے ۔ اب اللہ کرے وہ لڑکا خیر خیریت سے گھر آجائے ۔ نہ جانے کہاں سیر سپاٹے کرتا پھرتا ہے ۔ ایسا شوق چڑھا ہے اُسے سیر سپاٹے کا آخر اپنے باپ پر ہی جانا تھا نا ۔ اور یہ بھتنے اُسے دم لینے دیتے ہیں کیا ۔ وہ بیچارا کیا کرے جس کے چاروں طرف شیطان بستے ہوں ۔ وہ کب تک اُن کے اثر سے بچا رہے گا ۔ ابھی تو خیر معصوم ہے ۔ لیکن آخر یہیں جوان ہو کر ۔ توبہ اللہ نہ کرے اس پر ان کا اثر ہو ۔ توبہ ۔"

"پکڑیو ۔ پکڑیو ۔ ارے ٹھہر جا تو ۔" نیچے بازار میں دینے سبزی فروش نے شور مچایا ۔

شور سن کر بڑھیا کا ماتھا ٹھنکا اور وہ بازار کی کھڑکی کی طرف بھاگی ۔ "باپو باپو ۔ ۔ ۔" نیچے دینا اپنے باپ کو آوازیں دے رہا تھا ۔ "ارے کیا ہوا ہے تجھے ۔" رحیم قصائی نے پوچھا ۔ "کاجر اٹھا کر لے گیا ہے یہاں سے ۔" دینے نے جواب دیا ۔ "کبھوں گا نامیں اس کی ماں سے دوکان سے چیزیں اٹھاتا رہتا ہے ۔" "گاجر لے گیا ہے تو کیا ہوا ۔" رحیم بولا ۔ "پر یہ انڈا بھی تو توڑ گیا ہے ۔" دینا چلایا ۔ "باپو آکر مجھے مارے گا ۔"

"اے ہے کون لے گیا ہے اس کی گاجر" کھڑکی میں سے اس نے سر نکال کر پوچھا ۔ دینے نے اُسے دیکھا تو لگا چلانے ۔ "یہ دیکھ لے مائی تیرے لڑکے نے انڈا توڑ دیا ہے ۔ یہ دیکھ ۔ یہ ۔"

"اے ہے ۔" وہ چلائی ۔ "کیا کہہ رہا ہے تو ۔ میرا بیٹا کیوں توڑنے لگا کسی کا انڈا ۔ کسی پر بہتان لگاتے ہوئے شرم نہیں آتی تجھے ؟"

"بہتان کون لگاتا ہے ۔ میں کہتا ہوں ابھی ابھی وہ یہاں سے گاجر اٹھا کر بھاگا ہے چاہے پوچھ لو رحیم سے ۔ کیوں چاچا ۔ ؟"

"بڑے آئے ہو تم اور تمہارا چاچا ۔ اے ہے ان بازار والوں پر خدا کی مار ۔ ایک نا ایک جھگڑا چھیڑے رہتے ہیں ۔ فساد کئے بغیر جی نہیں لگتا ان کا ۔ توبہ ۔ جاجی تو کب سے باہر گیا ہوا ہے اور تم کہہ رہے ہو انڈا توڑ گیا ہے ۔ دوپہر کے وقت بھی دکھتا نہیں تمہیں ۔ کوئی اور ہو گا وہ جس نے تمہارا انڈا توڑا ہے ۔ خواہ مخواہ میرے بیٹے کا نام لگا دیا ۔ تمہیں تو اِس سے بیر ہے بیر ۔ سمجھتے ہوں گے لاوارث لڑکا ہے ۔ جو چاہیں کہہ دیں ۔ پر میں بتائے دیتی ہوں ۔ میرے بیٹے کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا تو آنکھیں نوچ لوں گی ہاں "کیوں کیا ہوا ۔" دینے کا باپ بھاگا بھاگا دوکان پر پہنچا ۔ "بڑھیا کے لڑکے نے انڈا توڑ دیا ہے یہ رہا ۔ جھپٹ کر گاجر اٹھا کر بھاگا تو انڈا ٹوٹ گیا ۔" دینا بسورنے لگا ۔

"اے ہے پھر وہی بات ۔ کیڑے پڑیں تیری اس زبان میں ۔" بڑھیا چلائی ۔

"چلو کیا ہوا پھر ۔" دینے کے باپ نے سر کھجلا کر کہا ۔ "تو دھیان رکھا کرنا اپنی چیزوں کا ۔ اچھا مائی جانے دے اب ۔" دینے کے باپ نے ہاتھ جوڑے ۔ یہ اور سنو ۔ جانے دے ، اچھا مائی معاف کر اب ۔ دینا تو بچہ ہے ۔" اس کے باپ نے کہا ۔ "اے ہے بچہ ۔" بڑھیا چلائی "یہ بچہ ہے ذرا باتیں تو سنو اس بچے کی ۔ قینچی کی طرح چلتی ہے زبان ۔ بچہ ہے !! میرے بیٹے پر اتنا بڑا بہتان لگا دیا اس بچے نے ۔ چاہے انڈا اپنے ہاتھ سے ہی چھوٹ گیا ہو ۔ اور تم کہتے ہو ابھی بچہ ہے ۔" دینا بولنے لگا تو اس کے باپ نے زن سے اس کے منہ پر چپت رسید کی ۔ "بیٹھ اب یہاں خبردار جو منہ سے بات کی ۔"

"ارے بھئی" رحیم قصائی نے جالی دار دروازے سے منہ نکال کر کہا ۔ "یہ ریکاٹ والا باجہ کیوں چھیڑ دیا تو نے ۔" "اب تو جلتی کو ہوا دے رہا ہے" دینے کے باپ نے ہنس کر کہا ۔ "ہوا دینے کی ضرورت نہیں یہاں ۔ چابی بھری ہوئی ہے ۔" وہ ہنسا ۔

ان کی باتیں سن کر بڑھیا نے سر پیٹ لیا ۔ اور لگی تمام بازار والوں کو صلواتیں سنانے ۔ بازار والے اس کی باتیں سن کر ایک دو مرتبہ دبی آواز سے ہنسے ۔ پھر یوں خاموش ہو گئے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو جیسے وہ بڑھیا نہ جانے کس سے باتیں کر رہی ہو ۔

چلّا چلّا کر بڑھیا کی گھگھی بندھ گئی ۔ لیکن وہ وہیں کھڑی رہی اور رُکے بغیر بڑبڑاتی رہی ۔ جب اُس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کی بات نہیں سن رہا تو پلّے کی گرہ سے ایک گھسی ہوئی اکنی کھولی اور کھڑکی میں اُسے پھینک کر بولی ۔ "یہ لے اپنے انڈے کی قیمت" زن سے اکنی دینے کے سر پر آلگی ۔ "کیا سمجھا ہے تم نے" وہ چلّائی ۔

عین اس وقت بازار کے پرلے سرے پر بڑے زور سے موٹر کا ہارن سنائی دیا ۔ اور پھر پہیے بریک تلے چیخے ۔ غوں اوں ۔ ۔ ۔ ارے ، دوڑو ۔ پکڑو پکڑو ۔ اوہ" پھر ایک لمبی چیخ سنائی دی ۔ "ہائے میرے اللہ ۔" بڑھیا نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا ۔ اس کی پیشانی پسینے سے شرابور ہوگئی اور دل ڈوب گیا ۔

آسمان پر مٹیالے بادل چھائے ہوئے تھے ۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی ۔ لوگ کھڑکیاں بند کر کے کمروں میں بیٹھے تھے ۔ بازار میں دوکان داروں نے بھی دوکانوں کے پٹ بند کر رکھے تھے ۔ جاجی کی ماں ، گھر پر چھائی ہوئی خاموشی سے گھبرا کر باورچی خانے میں جا بیٹھی ۔ چولھے میں آگ ٹمٹما رہی تھی ۔ لیکن گویا اس میں گرم کرنے کی طاقت نام کو نہ تھی ۔ کمرے میں چاروں طرف دھوآں بھرا ہوا تھا ۔ آگ کو دیکھ کر بڑھیا نے اور بھی ٹھنڈ محسوس کی اور پھر سے بڑے کمرے میں آ گئی ۔ اس تنہائی اور خاموشی میں اُس کا دم گھٹ رہا تھا ۔ جی چاہتا تھا کہ کسی سے کوئی بات کرے ۔ لیکن گھر میں کوئی ایسا نہ تھا جس سے بات کی جا سکے ۔ الماری میں پڑے ٹوٹے ہوئے طوطے کو دیکھ کر اس کے دل پر اک ٹھیس لگی ۔ آن جانے میں پلو سے وہ آنسو پونچھا جو کب سے خشک ہو چکا تھا ۔ اس نے طوطے کے سر پر پیار دیا ۔ اور چپ چاپ اس کی طرف دیکھنے لگی ۔ پہلے اس ٹوٹے ہوئے طوطے سے باتیں کیا کرتی تھی ۔ لیکن اب اُسے دیکھ کر کوئی بات نہ سوجھتی تھی اسے شاید اب اسے کھلونے سے باتیں کرنے کی ضرورت نہ رہی تھی ۔ وہ بیچارا تو آپ چونچ جھکائے چپ چاپ بیٹھا تھا جیسے پرواز کی طاقت نہ رہی ہو ۔ اس سے دل کی بات کہنے سے کیا فائدہ تھا ۔ وہ تو آپ دکھی معلوم ہوتا تھا ۔

معاً بڑھیا نے محسوس کیا کہ کمرے میں اس کا دم گھٹ جائے گا ۔ اُس نے لپک کر کھڑکی کھول دی اور پھر اس میں بیٹھ کر باہر دیکھنے لگی ۔ تمام گھر گویا ویران پڑے تھے ۔ آسمان پر بے پناہ اُداسی چھائی ہوئی تھی ۔ دور کوئی چکی ہونک رہی تھی ۔ بڑھیا اس چھائی ہوئی اُداسی سے گھبرا اُٹھی اور پیالے میں دال ڈال کر اس میں سے کنکر چننے میں مصروف ہو گئی ۔ شاید اس غرض سے کہ اس کی توجہ کسی کام میں لگ جائے ۔ لیکن اس کی آنکھوں تلے دال کے دانے دھندلائے جا رہے تھے ۔ اس کی نگاہ میں وہ پھیل رہے تھے ۔ پھیل رہے تھے ۔ اور پیالے کی دیواریں ناچ رہی تھیں ۔ اکتا کر اس نے پیالا پرے رکھ دیا اور سیخوں سے سر ٹیک کر چپ چاپ بیٹھ گئی ۔

”آ ۔ آ ۔ جا آ ۔“ نیچے میدان سے بیدی کی آواز سُن کر وہ چونکی ۔ ایک لمبی آہ بھری ۔ پھر مسکرانے لگی ۔ ”توبہ ۔“ وہ بڑبڑائی ۔ ”چاہے بارش ہو یا

طوفان اِن بچوں کی بلا سے ۔ انہیں اپنے کھیل سے غرض ۔" بڑھیا نے پھر دال کا پیالہ سامنے رکھ لیا ۔ دال کے دھندلے دانے واضح ہونے لگے ۔ کٹورے کی دیوار.س مناسب خم کھائے کھڑی تھیں ۔ "بچے بھی کیا چیز ہیں ۔" وہ بڑبڑانے لگی ۔ پھر کھڑکی سے نیچے کی طرف جھانکنے لگی ۔ میدان میں کوئی نہ تھا ۔ "نہ جانے کہاں چھپے بیٹھے ہیں ۔" وہ بولی ۔ سامنے مینہ کی بوندیاں خلا میں ناچ رہی تھیں ۔ مٹیالے بادل گلابی دکھائی دے رہے تھے ۔ پرے دھنک کا ایک مبہم ٹکڑا واضح ہوا جا رہا تھا ۔ چند لمحوں کے لئے وہ ایسے ہی میٹھی رہی ۔ جیسے کوئی خوش کن امید رچائے میٹھی ہو ۔ کچھ دیر تک تو وہ کھڑکی کی طرف کان لگاکر سنتی رہی ۔ لیکن میدان سے کوئی آواز نہ آنے پر پھر سے اس کے انداز میں وہی پرانی حسرت اور اداسی عود کر آئی اور وہ سینکوں سے سر ٹیک کر چپ چاپ بیٹھ گئی ۔

سیڑھیوں میں دھڑام کی آواز سُن کر وہ چونکی ۔ "یا اللہ توبہ ۔ نہ جانے ۔ ۔ ۔" وہ سیڑھیوں کی طرف بھاگی ۔ چوتھی سیڑھی پر بھپو گری پڑی تھی ۔ "یا میرے اللہ ۔" بڑھیا اسے دیکھ کر چلائی "اُٹھ میری بچی" وہ اُسے اٹھاتے ہوئے بولی ۔ "ہائے رے یہ سیڑھیاں ۔" نہ جانے کس منحوس نے بنایا تھا انہیں ۔ جو آتا ہے گر پڑتا ہے ۔ جو اوپر چڑھنے لگتا ہے نیچے پھسل جاتا ہے ۔ پاؤں دھرنے کے لئے جگہ بھی ہو یہاں ۔ اللہ ماری پل صراط کھڑی کر دی ہے ۔ اُٹھ میری بچی ۔ آمیں کپڑے جھاڑ دوں ۔ کیوں میں واری کہاں لگی ہے چوٹ ۔ ہائے میں مر جاؤں ۔ سارا گھٹنا لہولہان ہو رہا ہے ۔ آمیں ہلدی کی پٹی باندھ دوں ۔ آ بھی نا ۔" لیکن بھپو پیچھے ہٹ گئی ۔ دو ایک منٹ کے لئے اُس نے بڑھیا کی طرف دیکھا ۔ پھر سیڑھیاں اتر کر اپنے گھر کی طرف چل پڑی ۔ بڑھیا اُسے جاتے دیکھ کر ہنس پڑی ۔ "ڈرتی ہے تو پٹی بندھوانے سے ۔ اچھا تو نہ سہی ۔ نہ سہی ۔ جیسے تیری مرضی ۔ میں تو بیٹی تیرے ہی بھلے کی کہتی تھی ۔ اچھا جا ۔ جا کر آگ کے سامنے بیٹھیو ۔ چوٹ کو ٹھنڈ نہ لگ جائے ۔" یہ کہہ کر وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی ۔ "کیوں نہ گریں بچے ان سیڑھیوں سے ۔ دیکھو تو قطب منیار کی طرح گھومتی ہیں ۔ توبہ ایسے گھر سے تو جھونپڑے میں رہ لینا کہیں اچھا ہے ۔" کمرے میں اس کی نگاہ ٹوٹے ہوئے مٹی کے طوطے پر پڑی ۔ ہاں

اس روز جب جاجی طوطے سمیت سیڑھیوں میں گر پڑا تھا اور اُٹھتے ہی طوطے کے ٹوٹ جانے پر روتا رہا تھا ۔ اپنی چوٹ کا خیال نہ آیا تھا اسے ۔ بڑھیا کی آنکھوں کے خشک آنسو ازسرِنو بہنے لگے اور وہ منہ پر دوپٹہ لے کر کھڑکی میں بیٹھ گئی ۔ نہ جانے وہ کب تک وہاں بیٹھی رہی ۔ بادل پھٹ گئے ۔ آسمان پر پڑی ہوئی رنگین قوس فضا میں تحلیل ہوگئی ۔ سُورج نکلنے پر سارا میدان دھوپ سے منور ہوگیا لیکن بڑھیا کو گویا خبر ہی نہ ہوئی ۔ وہ چپ چاپ جوں کی توں بیٹھی رہی ۔

بازار سے دینے سبزی فروش کی چیخ سن کر وہ گویا جاگ اُٹھی ۔ "ہائیں" اُس نے اپنا سینہ تھام کر کہا ۔ اللہ خیر کرے اور پھر بازار کی کھڑکی کی طرف گئی ۔ "پھر چرائے گا تو ؟" دینے کا باپ ہاتھ میں جوتا اُٹھائے دینے کے سر پر کھڑا تھا ۔ دینا دونوں ہاتھ سر پر رکھے رو رہا تھا ۔ "جانے بھی دے چودھری ۔" کریم قصائی چلایا ۔ "جانے دوں ؟" آج چونی ہے کل نہ جانے کیا چیز چرائے گا ۔" یہ کہہ کر چودھری نے پٹاخ سے ایک جوتا چلایا اور دینا ازسرِنو چیخنے لگا ۔ "اے ہے" بڑھیا چلائی ۔ "اتنے سے بچے پر ہاتھ اٹھاتے شرم نہیں آتی ۔ اے لوگو تمہارے سامنے لڑکا پٹ رہا ہے اور تم مزے سے دیکھ رہے ہو جیسے تماشہ ہو ۔ توبہ کیا زمانہ آیا ہے ۔ سگے باپ کا خون سفید ہوگیا ۔"

"میں تو اس کا لہو پی لوں گا ۔" دینے کا باپ اوپر بڑھیا کی طرف دیکھ کر غرایا ۔ "یہ کہتے ہوئے شرم تو نہیں آتی تمہیں ۔" وہ چلائی ۔ "تمہیں نہیں معلوم بی بی ۔" وہ بولا ۔ "اس لڑکے نے چونی چرائی ہے ۔" "چونی چرائی ہے تو کیا خون کر دو گے اس کا ۔ چونی کی خاطر لڑکے کو مار مار کر ادھ مؤا کر دیا ہے تم نے ۔" "لیکن چوری ۔ ۔ ۔" چودھری نے کچھ کہنے کی کوشش کی ۔ "اے ہے بچہ ہے پیار سے سمجھاؤ تو آپ ہی سمجھ جائے گا ۔" "اونہہ بچہ" وہ بولا ۔ "منہ پر داڑھی آنے کو ہے اور ابھی بچہ ۔" "بچہ نہیں تو اور کیا ہے ۔" وہ بولی ۔ "اس کی ماں سے پوچھو جاکر" "ہونہہ" وہ ہنسا ماں نے ہی تو سر چڑھا رکھا ہے اسے ۔" بڑھیا نے قمیض کے پلّے سے چونی نکال کر چودھری کی طرف پھینکتے ہوئے کہا ۔ "یہ لے اپنی چونی اور خبردار جو لڑکے پر ہاتھ اٹھایا ۔ توبہ کیا زمانہ آیا ہے ۔ ہاتھ اٹھاتے وقت خدا کا خوف نہیں آتا انہیں ۔ ننھی سی جان کو یوں

پیٹ رہا ہے جیسے لڑکا نہ ہوا دھان کا مٹھا ہوا ۔" "لیکن اماں ، اس نے چوری جو کی ہے ۔" رحیم قصائی بولا ۔ "چوری کی ہے تو اسے سمجھا ۔ یوں اٹھ کر پیٹنا شروع کر دینا ۔ آخر وہ تیرا بیٹا ہے ۔ توبہ توبہ ۔"

کچھ دیر تک تو بازار والے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے پھر جلد ہی وہ اپنے اپنے کام میں لگ گئے ۔ لیکن وہ کھڑکی میں کھڑی بولتی رہی ۔ بولتی رہی ۔ حتیٰ کہ شام ہوگئی ۔ اگلے روز جب اُس نے آسمان کی طرف دیکھا تو آپ ہی آپ بولی ۔ "شکر ہے آج آسمان صاف ہوا ہے دو دن سے اللہ ماری بارش نے پریشان کر رکھا تھا ۔ بچوں کو کھیلنے کے لئے جگہ نہ ملتی تھی ۔ آج تو میدان میں کھیلیں گے ۔" وہ اطمینان سے کھڑکی میں بیٹھ گئی ۔ لیکن بچے میدان میں نہ آئے ۔ کچھ دیر تک تو وہ انتظار کرتی رہی ۔ پھر اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے کہنے لگی ۔ "آجائینگے ابھی ۔ ابھی تو سارا دن پڑا ہے ۔" لیکن اس کے باوجود بچوں کی غیر حاضری کی وجہ سے وہ اک خلا سا محسوس کر رہی تھی ۔ "نہ جانے کیا ہوا ہے اُنہیں" وہ مسکرانے لگی ۔ "چھپ چھپ کر کونوں میں کھیلتے ہیں ۔ یہ نہیں کہ باہر دھوپ میں آ کر کھیلیں پر وہ بھی کیا کریں ۔ کوئی کھیلنے بھی دے اُنہیں ۔ ماں کو پتہ چلے تو جھٹ جھڑکیاں دینا شروع کر دیتی ہے ۔ اور باپ ۔ توبہ باپ تو اپنے بچوں کے دشمن ہو رہے ہیں آج کل ۔"

دروازے میں آہٹ سن کر وہ اُٹھ بیٹھی ۔ "کون ہے ؟ اوہ تم ہو ۔" اس نے نجو اور بیدی کو دیکھ کر کہا ۔ "آجاؤ ۔ اے ہے تمہارے ساتھ کھیلنے والا نہیں تو کیا یہاں آؤ گے بھی نہیں تم ؟" بڑھیا نے پلّو سے آنکھیں پونچھ کر کہا ۔ "نہ جانے کیوں نہیں آتے تم ۔ کوٹھے پر کھیلنے کے لئے ایسی اچھی جگہ بنی ہے ۔ ایسی اچھی جگہ ہے گھر گھر کھیلنے کے لئے ۔ ہے نا بیدی ۔" اس نے بیدی کے دونوں ہاتھ پیار سے پکڑ کر انہیں جھلاتے ہوئے پوچھا ۔ "تم تو جانتی ہو نا ۔ جب تم گھر والی بنا کرتی تھی ۔ اور ۔ اور ۔ وہ" اس کا گلا جذبات کی شدت سے رُندھ گیا ۔ "اتنی جلدی بُھول گئی ۔ اے ہے کیا زمانہ آیا ہے ۔ ساتھی ساتھی کو بھول جاتا ہے ان دنوں ۔"

"آؤ بیدی ۔" نجو نے اشارہ کیا ۔ اور وہ دونوں کوٹھے پر چڑھ گئے ۔ بھیا

زمانہ آیا ہے ۔" بڑھیا اپنی ہی دھن میں کھڑی بڑبڑاتی رہی ۔ "پَر ان کا کیا قصور یہ عمر ہی ایسی ہے ۔ ان کیلئے تو بس آج ہی آج ہے ۔ کل تو ہے ہی نہیں ۔ اچھا جیتے رہیں ۔ ہائیں ۔" اس نے مڑ کر دیکھا اور دونوں کو غائب پا کر مسکرا دی ۔ "چپکے سے یوں دبے پاؤں کھسک جاتے ہیں کہ پتہ ہی نہیں لگتا ۔ وہ بھی یوں ہی نکل جایا کرتا تھا اور میں بیٹھی کی بیٹھی رہ جاتی تھی ۔" وہ ہنسی ۔

بڑھیا دبے پاؤں کوٹھے پر چڑھ گئی ۔

کوٹھے پر پرلے کونے میں نجو چٹائی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے پر بیٹھا تھا ۔ اسُ کے پاس دونوں بھپو اور ییدی کھڑی تھیں ۔ "کیوں نجو" ییدی پوچھ رہی تھی ۔ "بھپو تو مہمان ہے نا ۔" "نہ بھئی ۔" بھپو چلائی "ہم نہیں کھیلتے ۔" بڑھیا یہ دیکھ کر سیڑھیوں میں کھڑی ہوگئی ۔ اور چوری چوری انہیں دیکھنے لگی ۔ وہ ڈرتی تھی کہ بچے اسے دیکھ نہ پائیں ورنہ وہ بھاگ جائیں گے ۔ نہ جانے وہ اس خیال سے ڈرتی کیوں تھی ۔ اُسے ایسے محسوس ہو رہا تھا ۔ جیسے ان کے چلے جانے پر آسمان پر پھر سے مٹیالے بادل چھا جائیں گے اور گھر پر گہری خاموشی طاری ہو جائے گی ۔ وہ ڈرتی تھی کہ بچے اُسے دیکھ نہ لیں ۔ اس لئے وہ چپ چاپ وہیں کھڑی رہی ۔ سر دیوار پر ٹیک دیا اور غور سے بچوں کا کھیل دیکھنے لگی ۔ لیکن اس کی نگاہیں دور نہ جانے کہاں دیکھ رہی تھیں ۔

کھیلنے کے بعد جب وہ سب اس کے قریب سے گزرنے لگے تو وہ چونکی ۔ قمیض سے آنکھیں پونچھ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی ۔ بس اور نہیں کھیلو گے کیا ۔" "اونہہ" نجو نے گال میں زبان دے کر کہا اور وہ تینوں سیڑھیاں اُترنے لگے ۔ اُنہیں جاتے دیکھ کر بڑھیا نے ایک کسک محسوس کی ۔ اس کا جی چاہتا تھا ۔ کہ کسی بہانے انہیں واپس بلا لے ۔ لیکن وہ کیا کر سکتی تھی ۔ اس نے دیوار سے سہارا لگا لیا ۔ پھر دفعتاً اسے کچھ یاد آیا ۔ "ییدی نجو" وہ چلائی "ٹھہرنا ذرا ۔ ذرا ٹھہرنا ۔" بڑھیا بے تحاشا سیڑھیاں اُترنے لگی ۔ "نہ جانے کیا ہوگیا ہے میری یاد کو دو دن سے میں نے تمہارے لئے لڈو سنبھال رکھے ہیں ۔" "لڈو !!" ییدی نے منہ کا پانی نگلتے ہوئے دہرایا ۔ "ہاں لڈو" ۔ وہ بولی ۔ "بیاہ والے گھر سے آئے تھے ۔ میں نے تمہارے لئے رکھ چھوڑے "یہ لو" بڑھیا نے

مٹی کی ہنڈیا سے چار لڈو نکالے ۔ "یہ لو نجو ۔ یہ تم لو بھپو اور بیدی یہ تم اور یہ" اس نے چوتھے لڈو کی طرف دیکھ کر لمبی آہ بھری ۔ پھر آنکھ پونچھ کر کھڑکی کی طرف چلی گئی اور سر سیخوں پر ٹیک کر غور سے اس چوتھے لڈو کی طرف بھری ہوئی آنکھوں سے دیکھنے لگی ۔ نیچے میدان میں گاما کھڑا تھا جو کئی روز کے بعد گاؤں سے واپس آیا تھا ۔ گامے نے بھپو کو دیکھ کر دانت نکالے پھر منہ بنا کر پوچھنے لگا ۔ "وہ یہیں ہے دانتوں والی ۔" "ہاں" نجو نے دانت دکھاتے ہوئے کہا ۔ "وہ" "نہیں نہیں" بھپو چلائی ۔ "اب وہ وہ نہیں ۔" "وہ نہیں" گامے نے حیرانی سے بھپو کی طرف دیکھا ۔ "اوہ ۔ ۔ ۔ لڈو ۔" گامے نے ان کے ہاتھ میں لڈو دیکھ کر حیرانی سے پوچھا ۔ "چرائے ہیں ؟" "اونہوں" بیدی نے سر ہلایا ۔ "تو" گاما پوچھنے لگا ۔ نجو نے دانت نکال کر اشارہ کیا ۔ "اُس نے دیئے ہیں" "اُس نے" گامے نے پھر دانت نکالے "جھوٹ" "سچ" نجو بولا ۔ "اُسی نے دیئے ہیں" "دانتوں والی نے ؟" گامے نے دہرایا ۔ "ہاں ۔ پر ۔ ۔ ۔" بیدی نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ۔ "جھوٹ" گامے نے شور مچایا۔ "وہ کیا دیگی ۔ مجھے دو" "چپ" بیدی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سلاخدار کھڑکی کی طرف اشارہ کیا "ماں ۔"

کھڑکی میں سلاخوں پر سر ٹکائے بڑھیا ایک لڈو ہاتھ میں پکڑے ہوئے ، دور افق کی طرف کھوئی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی ۔ اسے اس سلاخ دار کھڑکی میں بیٹھے دیکھ کر ایسے محسوس ہوتا تھا ۔ جیسے کوئی پنچھی پنجرے میں دم توڑ رہا ہو ۔

○

مسز کٹلے کا خاوند

مسٹر کٹلے کی کہانی کو کہانی نہیں کہا جا سکتا نہ ان کی زندگی میں کوئی خاص واقعہ ہوا ہے نہ ان کی روزمرہ زندگی میں کوئی نئی بات ظہور پذیر ہوئی ہے ۔ محبت تو ایک عام سا واقعہ ہے جو ہر کسی کی زندگی میں رونما ہوتا ہے ۔ البتہ مسٹر کٹلے کی محبت کی ایک تفصیل محبت کی عام تفصیلات سے ذرا مختلف تھی ۔ یعنی مسٹر کٹلے کی اسمارہ سے پنتیس سال کی عمر میں محبت ہوئی تھی ۔ اس میں مسٹر کٹلے کا کوئی قصور نہ تھا ۔ اس کے باوجود لوگ اکثر مسٹر کٹلے سے پوچھتے ہیں "مسٹر کٹلے! تو آپ کو جوانی گزارنے کے بعد محبت کا آزار ہوا ۔" اور یہ سوال کرنے کے بعد معنی خیز انداز میں مسکرانے لگتے ہیں۔ لوگوں کی یہ زیرِ لب مسکراہٹ دیکھ دیکھ کر یا نہ جانے کیوں اب تو مسٹر کٹلے بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ جوانی گنوا کر محبت کرنے میں انہوں نے ایک جرم کیا ہے ۔ یہ احساس جرم مسٹر کٹلے کے انداز میں روز بروز اجاگر ہوتا جاتا ہے اور وہ بات کرتے کرتے جھینپ جاتے ہیں ، چاہے بات محبت کے بجائے کوریا کی جنگ کے متعلق ہو رہی ہو اور چاہے مخاطب اس بات سے قطعی طور ناواقف ہو کہ انہوں نے اسمارہ سے محبت کی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ کی بھی تھی یا نہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں مسٹر کٹلے کا کوئی قصور نہ تھا ۔ اوّل تو عشق کرنا اپنے بس میں نہیں تھا دوسرے عشق عمر اور زمان و مکان سے بے نیاز ہے ۔ اس کے علاوہ وہ جوانی میں اسمارہ سے کیسے محبت کر سکتے تھے ۔ جب وہ جوان ہوئے تھے اس وقت اسمارہ اپنی ماں کی گود میں پڑی انگوٹھا چوستی تھی ۔ اس صورت میں مسٹر کٹلے کا جوانی میں محبت کرنا کیسے ممکن تھا ۔ قصور تو اسمارہ کا تھا ۔ جس نے جوان ہونے میں اتنی دیر لگا دی ۔ اور پھر مسٹر کٹلے سے ملاقات کرنے میں اتنی تاخیر کی ۔ مسٹر کٹلے اسمارہ سے ملے اور اُسے دیکھے بغیر کیسے محبت کر سکتے تھے ۔ ویسے اور لڑکیاں تو کئی تھیں ۔ مسٹر

کٹلے پورے پنتیس سال دنیا کے مختلف ممالک میں آنکھیں کھول کر گردو پیش کو دیکھتے ، رہے تھے ۔ لیکن جو لڑکیاں اُن سے ملیں اُن میں وہ بات نہ تھی جو اسمارہ میں تھی ۔ پھر وہ اُن سے کیسے محبت کر سکتے تھے ۔

اسمارہ کو دیکھئے تو اس میں کوئی خصوصیت نہیں ۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک عورت ہے ۔ ایک بھر پور عورت ۔ لمبا قد چوڑا چہرہ ، مضبوط جسم ۔ اُسے دیکھ کر آدمی سوچنے لگے گا کہ وہ کس لحاظ سے عورت سمجھی جا سکتی ہے ۔ کیونکہ اس کے تمام تر اعضاء مردانہ دکھائی دیتے ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود وہ عورت ہے بھر پور عورت اور کوئی اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتا ۔ مسٹر کٹلے خود بھی اس بات کا فیصلہ آج تک نہیں کر سکے کہ ''اسمارہ میں وہ خصوصیت'' کونسی ہے ۔ وہ بات کونسی ہے جو اسمارہ میں ہے اور دوسری لڑکیوں میں نہیں ہے ۔ مسٹر کٹلے اسمارہ کی اس انفرادیت کو شدت سے محسوس کرتے ۔ اگرچہ بیان نہ کر سکتے تھے اور اسی وجہ سے انہیں اسمارہ سے ابھی تک والہانہ محبت ہے ۔ حالانکہ ان کی شادی کو تقریباً دس سال ہو چکے ہیں ۔

مسز کٹلے سے پوچھئے کہ تمہیں مسٹر کٹلے سے کیسے محبت ہوئی تو وہ مسکرا دیگی ۔ اور پھر ہنس کر کہے گی ۔ ساری بات یوں آناً فاناً ہوگئی کہ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا ۔ کٹلے نے آکر وہ شور مچایا اور چیخ چلاّ کر ایسی گڑ بڑ ڈالی کہ میں کیا کہوں ۔ بس ان کی شورا شوری کا نتیجہ یہ ہوا کہ بات کو سمجھنے سے پہلے ہی بات پکی ہوگئی ۔ اور پھر جو ہوش آیا تو شادی ہو چکی تھی ۔''

بات یوں ہوئی کہ ان دنوں اسمارہ کو ایک نوجوان سے دلچسپی تھی ۔ اس کا نام فاروق تھا ۔ فاروق سارا سارا دن آکر اسمارہ کے پاس بیٹھا رہتا تھا ۔ اسمارہ فاروق کی خاموش نگاہوں میں ایک دبا دبا اضطراب محسوس کیا کرتی تھی ۔ اس کی خواہش تھی کہ فاروق سلگنا چھوڑ کر بھڑک کر جلنا شروع کر دے ۔ لیکن فاروق اپنی طبیعت سے مجبور تھا ۔

پھر دفعتاً کپتان کٹلے اسمارہ کے گھر میں آ دھمکے ۔ وہ اسمارہ کے چچا کو اپنے دوست کا کوئی پیغام دینے آئے تھے ۔ پیغام دینے کے بعد وہ کچھ دیر بیٹھے رہے ۔ پھر اسمارہ کی والدہ سے معذرت کرنے کے بعد اُٹھے ۔ ''مجھے اب جانا

ہے ۔ ضروری کام ہے بہت ہی ضروری ۔"

اسمارہ کی ماں نے اخلاقاً چائے کے لئے اصرار کیا ۔ لیکن مسٹر کٹلے بالکل مجبور تھے ۔ وہ رخصت ہونے کے لئے تیار تھے کہ اسمارہ آگئی ۔ مسٹر کٹلے نے ایک نظر اسمارہ کی طرف دیکھا ۔ "مائی گاڈ" انہوں نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے دل ہی دل میں کہا ۔

پھر جانے کیا ہوا ۔ ایک گھنٹہ گزر گیا، دو گھنٹے گزر گئے ۔ شام ہوگئی ۔ لیکن مسٹر کٹلے وہیں صوفے پر بیٹھے تھے ۔ وہ اسمارہ کو مختلف ممالک کے حالات سنا رہے تھے اور اسمارہ ان کے جوشِ بیان سے محظوظ ہو رہی تھی ۔ اور مسٹر کٹلے کا وہ ضروری کام تو گویا اب ناپید ہو چکا تھا ۔ جلد ہی مسٹر کٹلے نے محسوس کر لیا کہ اسمارہ فاروق میں دل چسپی لے رہی ہے ۔ فاروق اور اسمارہ کو تنہائی میں بیٹھے دیکھ کر ان کا شوق اور بھڑکا ۔ اور وہ زیادہ جوش میں آگئے ۔

اس کے بعد اسمارہ کے کمرے میں منتوں ، چیخ پکار اور دھمکیوں کی آوازیں گونجنے لگیں اور بیچاری اسمارہ کے ہوش جواب دے گئے ۔ اسے مسٹر کٹلے سے کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ مگر اس کا کیا کیا جاتا کہ وہ کپتان تھے ۔ اور بے چارا فاروق محض فاروق تھا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی ان کی شادی ہوگئی ۔

ہاں تو مسٹر کٹلے کی کہانی کو کہانی نہیں کہا جا سکتا ۔ ان کی زندگی میں کوئی خاص بات ظہور پذیر نہیں ہوئی ۔ لیکن اس کے باوجود مسٹر کٹلے کو دیکھ کر آپ محسوس کریں گے ۔ جیسے وہ بذات خود اک کہانی ہیں ۔ اُن کا دُبلا پتلا جسم ، چھوٹا قد ، دھنسی ہوئی نیلی آنکھیں ۔ جن میں عمر کی جھلک واضح ہوتی ہے ۔ لیکن مسٹر کٹلے کی شخصیت کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں ۔ جیسے اسمارہ کی "اُس بات" کا اظہار ممکن نہیں ۔ جسے مسٹر کٹلے نے بڑی شدت سے محسوس کیا تھا ۔

اگر آپ کو کبھی تتھیا گلی جانے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے مسٹر کٹلے کو ضرور دیکھا ہوگا ۔ سڑک پر چھڑی جُھلاتے ہوئے یا پوسٹ آفس میں احتیاط سے خطوط سپردِ ڈاک کرتے ہوئے یا ڈاکٹر دانیا کی دوکان پر "نَردِگر" خریدتے ہوئے ۔ وہ اپنے دوستوں کے لئے بھی اکثر "نَردِگر" خریدا کرتے ہیں ۔

آپ کو دیکھ کر وہ معاً آپ کی طرف متوجہ ہوجائیں گے ۔ "آئیے آئیے

چائے کا ایک پیالہ کیسا رہے گا ۔ تکلف نہیں کیجیے ۔ آپ کٹلے کو تو جانتے ہوں گے ۔ میں مسز کٹلے کا خاوند ہوں ۔ جی ہاں ۔ ۔ ۔ آپ کی تعریف ۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر ۔"

زبیری کا ارادہ تو یہ تھا کہ ایبٹ آباد جا کر چھٹیاں بسر کرے ۔ وہ تو محض اتفاق تھا کہ ایبٹ آباد کے راستے میں اُنہیں ہاشمی مل گیا "بھئی واہ" وہ چلانے لگا ۔ "زبیر ایبٹ آباد میں کیا دھرا ہے ، جانا ہے تو تتھیا گلی جاؤ ۔ میرا کاٹیج وہاں خالی پڑا ہے ۔"

ہاشمی کی وجہ سے زبیر کا پروگرام بدل گیا ۔ اور وہ ایبٹ آباد کے بجائے تتھیا گلی آپہنچے ہاشمی کا کاٹیج پہاڑ کی ایک ویران چوٹی پر واقع تھا ۔ جس کے اردگرد اونچے درخت کھڑے تھے ۔ ایک طرف برساتی نالہ بہہ رہا تھا ۔ درمیان میں لکڑی کا چھوٹا سا کاٹیج تھا جس کے قریب ہی پتھر کا بنا ہوا ایک اور مکان تھا ۔ ان دو مکانوں کے علاوہ اُس چوٹی پر اور کوئی آبادی نہیں تھی ۔

پہلے دو ایک دن تو زبیری ضروری انتظامات میں مصروف رہے ۔ تیسرے یا چوتھے دن گردونواح کے متعلق جانتے کے لئے انہوں نے اس ویران چوٹی کا ایک چکر لگایا ۔

پتھر کے پختہ مکان کے مختصر سے برآمدے میں چند بچے کھیل رہے تھے ۔ ایک ننھی سی بچی سہمی ہوئی بیٹھی تھی ۔ ایک بچہ کھڑا درختوں کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ اس سرسبز مرغزار میں کھو گیا ہے ۔ جیسے وہ اپنے ماں باپ سے بچھڑ گیا ہے ۔ ایک بارہ سال کا لڑکا سیڑھیوں پر ہاتھوں میں ٹھوڑی تھامے بیٹھا تھا جیسے زندگی کے کسی مسئلے پر بڑے انہماک سے غور کر رہا ہے ۔

ساتھ والی کھڑکی سے ایک دم قہقہہ سنائی دیا ۔ کوئی عورت اندر کھلکھلا کر ہنس رہی تھی ۔ اس قہقہے میں نسائی نمائش قطعی مفقود تھی ۔ وہ قہقہہ کسی کو لبھانے یا متوجہ کرنے کے لئے نہ تھا ۔ زبیری نے اس عجیب قہقہے کو سنا اور محسوس کیا جیسے کوئی زندگی کی جملہ لذتوں سے مدہوش ہو کر ہنس رہا ہے ۔ نسائی ہونے کے باوجود اس میں مردانہ جھلک تھی ۔

پتھر کے مکان کے آگے وہ گھومتا ہوا پہاڑی سے نیچے اتر گیا ۔ لمبے لمبے

درخت چاروں طرف کھڑے تھے ۔ چاروں طرف سنسان ٹیلے پھیلے ہوئے تھے اس گھومتے ہوئے راستے پر زیری سوچتا جا رہا تھا ۔ دفعتاً ایک موڑ پر وہ چونکا ۔ اس کے روبرو ایک دُبلا پتلا شخص کھڑا تھا ۔ ہاتھ میں چھڑی تھی ۔ اُس کی گہری نیلی آنکھیں اَن کہے غم سے بھری ہوئی تھیں اُس کے ہونٹوں پر مبہم سا تبسم تھا جیسے وہ کِھل کر کچھ چھپانے کی ناکام کوشش میں لگے ہیں ۔

"آپ آپ ۔" وہ رُک گیا ۔ "میرا مطلب ہے آپ یعنی" اُس نے مسکرانے کی کوشش کی "ادھر ۔ اس طرف ۔ کیا آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں ؟"

"معاف کیجئے ۔" زیری نے گھبرا کر کہا ۔ "میں ۔ یعنی آپ کی تعریف ۔"

"میں میں" وہ بولا ۔ "میں مسز کٹلے کا خاوند ہوں ۔ جی ہاں ۔"

"میں نہیں سمجھتا ۔" زیری نے حیرانی س اُس کی طرف دیکھا ۔

وہ ہنسنے لگا ۔ "آپ مسز کٹلے کو نہیں جانتے ؟" اس کے انداز سے یوں معلوم ہوتا تھا ۔ جیسے مسز کٹلے کو نہ جاننا جرم ہے ۔ "معاف کیجئے آپ ادھر سے آرہے ہیں ؛ میں سمجھا شاید ہم سے ملنے آئے ہیں ۔ معاف کیجئے ۔"

"جی میں اپنے کاٹیج سے آرہا ہوں ۔ ذرا گھومنے نکلا ہوں ۔"

"اپنے کاٹیج سے ۔" مسٹر کٹلے نے سر کھجلایا ۔

"میں ہاشمی کاٹیج میں رہتا ہوں ۔" زیری نے کہا ۔ "یہ قریب ہی جو لکڑی کا ڈبہ سا بنا ہے ۔"

"اوہو" مسٹر کٹلے نے قہقہہ لگایا ۔ "حد ہوگئی ۔ لیکن خیر خیر ۔ تو وہ لکڑی کا ڈبہ آباد ہوگیا آخر بڑی خوشی کی بات ہے ۔ بڑی خوشی کی بات ہے ۔"

"میرا نام زیری ہے ۔"

"بہت خوب پھر تو صاحب روز ملاقات ہوگی ۔ میں آپ کا پڑوسی ہوں ۔ سو لانگ سو لانگ" اور وہ ہنستا ہوا پتھر کے مکان کی طرف چل پڑا ۔

"میں ابھی حاضر ہوں گا ۔ آپ ذرا گھوم آئیے ۔ ہاہاہاہا ۔ گھوم آئیے آپ ۔" وہ بڑبڑاتا ہوا نکل گیا ۔

یہ پہلا دن تھاجب زیری مسٹر کٹلے سے ملا جانے کیوں ۔ لیکن زیری اس

ملاقات سے بے حد محظوظ ہوا تھا۔ مسز کٹلے کا خاوند ۔ ۔ ۔ وہ دیر تک ہنستا رہا۔ کٹلے ۔ مسٹر کٹلے ۔ خوب آدمی ہے ۔ زیبری نے دل ہی دل میں سوچا ۔

شام کے وقت جب زیبری لیٹے ہوئے مطالعے میں مشغول تھا۔ مسٹر کٹلے آدھمکا "ہیلو ہیلو کیا نام ہے آپ کا ۔ معاف کیجئے ۔ مجھے نام یاد نہیں رہتے ۔ ابھی سے لیٹ بھی گئے آپ ۔ نہیں صاحب یہ تتھیا گلی ہے ۔ یہاں یہ بات نہیں چلے گی کہ شام ہی سے پڑ کر سو گئے ۔ ذرا موسم تو دیکھئے ۔ اس موسم میں نیند آتی ہے کیا ؟ اونہوں جی چاہتا ہے انسان آہیں بھرے اور پہلو بدلتا رہے ۔ کیوں کیا خیال ہے ۔"

"آئیے آئیے تشریف رکھئے ۔" زیبری اُٹھ کر بیٹھ گیا ۔

"اونہوں" وہ ہنسنے لگا ۔ "ان تکلفات سے گذارہ نہ ہوگا ۔ ہوں ۔ تو یہ لکڑی کا ڈبہ بھی آباد ہو ہی گیا آخر کار ۔" اُس نے آہ بھری ۔ "بہت اچھا ہوا ۔ بہت اچھا ہوا ۔ خیر خیر دیکھا جائیگا ۔ تو آپ ہاشمی صاحب کے دوست ہیں ۔ بے کار ہے ہاشمی صاحب کی دوستی بالکل بیکار ہے ۔ یقین کیجئے ۔ وہ کبھی یہاں آکر رہے ہی نہیں ۔ کبھی کبھار یہاں آتے ہیں ، دو دن کے لئے ۔ اب بتائیے دو دن میں کیا ہو سکتا ہے ۔ لیکن صاحب معلوم ہوتا ہے آپ یہاں ہوٹل بازی کر رہے ہیں ۔ یہ نہیں چلے گا یہاں ۔ مسز کٹلے کو معلوم ہوگیا تو ہم دونوں پٹ جائیں گے ۔ وہ آپ ہی کا گھر ہے ۔ وہ سامنے والا سمجھے۔آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو آواز دے دیجئے ۔ ہمارے ملازم کا نام علیا ہے ۔ چھوٹا سا لڑکا ہے ۔ لیکن کام کرنے میں بڑا تیز ہے ۔ اور مسز کٹلے ! بڑی اچھی ہے بے حد اچھی ۔ اب میں کیا عرض کروں کتنی اچھی ہے ۔ بس آپ ایک بار دیکھئے صرف ایک بار ۔ آپ کو دیکھ کر بے حد خوش ہوگی ۔ یقین جانئے یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے ایسی اچھی بیوی ملی ہے بس یوں سمجھ لیجئے آپ کہ اُس مکان میں صرف ایک میں ہی ہوں ۔ جس کا کوئی مقصد نہیں ۔ جو بیکار ہے ۔ گھر کی بلی اور طوطے تک ہر فرد اپنا کام بڑی خوش اسلوبی سے سر انجام دیتا ہے اور مسنا کٹلے ۔ اُس کی تو کوئی بات نہ پوچھئے ۔ تو کل جائے وہیں رہے گی ۔"

وہ اُٹھا ۔ ”اب آپ آرام کیجئے ۔ لیکن ہاں ، مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا ۔ چائے کے متعلق مسز کٹلے کہا کرتی ہے، بس جناب چائے لپٹن کی۔لپٹن کی ۔ ہا ہا ہا ہا ۔“ وہ قہقہے لگاتا چلا گیا ۔ اس کی آواز کچھ دیر تک زیبری کے کانوں میں گونجتی رہی ۔

اگلے روز جب زیبری پتھر کے مکان میں چائے پینے کے لئے گیا تو اس نے پہلی مرتبہ مسز کٹلے کو دیکھا ۔ اس کے بال کھلے تھے ۔ جسم پر ڈھیلے ڈھالے کپڑے لٹک رہے تھے ۔ اعضا بھاری اور بھدے تھے ۔

السلام و علیکم ، زیبری نے اُس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا ۔

مسز کٹلے نے ایک ساعت کے لئے سر اٹھایا ۔ زیبری نے محسوس کیا کہ گویا وہ نگاہیں اُسے پرکھ رہی ہیں ۔ پھر وہ آنکھیں جھک گئیں ۔ مسز کٹلے کچھ بننے میں مشغول ہوگئی ۔ مسٹر کٹلے حسبِ عادت مسلسل باتیں کئے جا رہا تھا ۔

”کیوں مسز کٹلے یہ چائے لپٹن کی ہے ؟“ وہ چلا رہا تھا ۔ لیکن مسز کٹلے چپ چاپ کام میں مشغول تھی ۔ اُس کے چہرے پر گویا بیزاری سی چھائی ہوئی تھی ۔

ساتھ والے کمرے میں تینوں بچے چپ چاپ بیٹھے تھے ۔ تنھا فرش پر گھسٹ گھسٹ کر چل رہا تھا ۔ لڑکی گڑیاں سامنے رکھے کھوئی ہوئی نگاہوں سے دیوار کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ لڑکا کرسی پر بیٹھے کھڑکی سے باہر متواتر دیکھے جا رہا تھا ۔

باہر بادل کا دھندلکا چھا رہا تھا ۔ جو چاروں طرف سے اس پتھر کے مکان کی طرف گویا یورش کر رہا تھا ۔

”مسز کٹلے“ کٹلے چلا رہا تھا ۔ ”کھانا پکانے میں مسز کٹلے کا کوئی جواب نہیں۔ کل قاسم کہہ رہا تھا کہ مسز کٹلے کے ہاتھ کا پکا ہوا گوشت کھا کر خاوند کا جی چاہتا ہے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے ۔

مسز کٹلے کا گونگا چہرہ جذبات کے اظہار سے بیگانہ تھا ۔

بادل کی ”دھوڑی“ پتھر کے مکان کے گرد گھیرا ڈالتی جا رہی تھی ۔

اس کے بعد دو چار دن مسٹر کٹلے دکھائی نہ دیا ۔ پانچویں روز صبح سویرے

ہی آموجود ہوا ۔ اس کے بال پریشان تھے غالباً رات بھر جاگنے کی وجہ سے آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں اور اس کی صورت اشک زدہ دکھائی دیتی تھی ۔

"معاف کیجئے پروفیسر" وہ چلایا ۔ "معاف کیجئے ۔ آپ سوچتے ہوں گے ۔ کٹلے بے حد واہیات آدمی ہے ۔ پروفیسر صاحب واقعی میں واہیات آدمی ہوں ۔ خواہ مخواہ رات کو میں نے چلا چلا کر آپ کی نیند خراب کی ۔ مجھے بے حد افسوس ہے ۔ بے حد ۔ لوجی کیا یہ حماقت نہیں ۔ خواہ مخواہ دوسروں کو بُرا بھلا کہنا اور اُس شریف عورت کو ۔ ۔ ۔ مجھے تو شرم آتی ہے اپنے آپ پر ۔"

زیری حیرانی سے کٹلے کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس بات کی وجہ سے یوں معذرت کئے جا رہے ہے ۔

"مسٹر کٹلے" پروفیسر تنگ آکر بولا ۔ "کیا کہہ رہے ہیں آپ ۔ خواہ مخواہ معذرت کرنیکا مطلب ؟"

"میں جانتا ہوں ۔" کٹلے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا ۔ "آپ نے میرا شور تو ضرور سُنا ہوگا ویسے اخلاقاً ۔ ۔ ۔ میں سمجھتا ہوں ۔"

"نہیں مسٹر کٹلے رات مَیں دوسرے شو پر گیا ہوا تھا ۔ آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں اور ویسے بھی میں سو جاؤں تو ڈھول پیٹنے پر بھی نہیں جاگتا ۔"

"سچ !" کٹلے کی آنکھوں میں شکر گذاری کا جذبہ واضح طور پر جھلکنے لگا ۔

"یہ تو بہت اچھا ہے ۔ بہت اچھا ۔ شکر ہے پروفیسر آپ ہمارے پڑوس میں آبسے ہیں ۔ لیکن میری حماقت دیکھئے نا مَیں آپے سے باہر ہو جاتا ہوں اور خواہ مخواہ چلانا شروع کر دیتا ہوں ۔ حالانکہ یقین جانئے اُس کی شرافت کا کوئی جواب نہیں ۔ اتنی اچھی اور نیک ہے کہ میں کیا عرض کروں ۔ اگر وہ نہ ہو تو جانے میرا کیا حشر ہو ۔ لیکن میں نے اس کی زندگی حرام کر رکھی ہے ۔ پروفیسر آپ نہیں جانتے وہ کتنی اچھی ہے ۔ آپ نہیں جانتے ۔ خیر خیر ، شکر ہے ۔ آپ گھر پر نہ تھے ۔ ورنہ آپ مجھے بری طرح کوستے ۔ مجھ سے نفرت کرتے ۔ مگر وہ ایسی اچھی ہے کہ میری حماقتوں اور زیادتیوں کو شکوہ کئے بغیر برداشت کرتی ہے یقین جانئے اُس نے کبھی طعنہ تک نہیں دیا مجھے ۔ خیر خیر ، وہ تو شکر ہے

آپ تھے نہیں گھر پر ۔ اچھا پھر ملاقات ہوگی ۔ خدا حافظ ۔" اور بڑبڑاتا ہوا چلا گیا ۔

اُس کے جانے کے بعد دیر تک زیبری سوچتا رہا ۔ جانے مسٹر کٹلے کا مطلب کیا تھا ۔ شاید بیوی سے جھگڑ پڑا ہو ۔ لیکن گھروں میں یہ تو ایک عام سی بات ہے ۔ اس بات پر پڑوسی سے معذرت کرنے کا مطلب اس روز باہر جاتے ہوئے وہ کٹلے کے مکان کے قریب سے ہو کر گزرا ۔ مگر وہاں اُسے کوئی خاص بات دکھائی نہ دی ۔ مسٹر کٹلے اندر کمبل لپیٹے پڑا تھا ۔ باہر دھوپ میں مسز کٹلے بڑے انہماک سے کچھ بن رہی تھی ۔ اس سے دور تھا بر تنوں سے کھیل رہا تھا ۔ لڑکی حسبِ دستور کھوئی کھوئی نگاہوں سے درختوں کی طرف دیکھ رہی تھی اور بڑا لڑکا گیند ہاتھ میں پکڑے اس پر غور کر رہا تھا ۔

زیبری سوچ رہا تھا ۔ جانے یہ بچے اس قدر کھوئے ہوئے کیوں رہتے ہیں ۔ اور مسز کٹلے کی آنکھیں ہر گزرنے والے کو پرکھا کیوں کرتی ہیں ۔ جیسے جانچ رہی ہیں ۔ شبہات سے بھری جانچ ۔

دو ایک دن مسٹر کٹلے دکھائی نہ دیا ۔ جب زیبری کو معلوم ہوا کہ وہ اسی روز سے بیمار پڑا ہے تو زیبری رسماً اس کی عیادت کے لئے گیا ۔ بستر پر رومال سر پر باندھے ہوئے مسٹر کٹلے پڑا تھا ۔ دیوار سے سر ٹیک رکھا تھا ۔ فرش پر مسز کٹلے سوئٹر بننے میں مصروف تھی ۔ اور اس کے سامنے آرام کرسی پر ایک اجنبی جوان بیٹھا تھا ۔

"اخاہ پروفیسر صاحب ہیں" کٹلے نے نحیف آواز میں کہا ۔ "آئیے پروفیسران سے ملئے ۔ آپ میرے دوست مسٹر قاسم ہیں ۔"

قاسم نے زیبری کی طرف نقادانہ نظر سے دیکھا اور مصافحہ کر کے بیٹھ گیا ۔

"یہ ہمارے پڑوسی پروفیسر زیبری ہیں ۔ اور پروفیسر صاحب یوں سمجھ لیجئے کہ قاسم صاحب میرے واحد دوست ہیں ، واحد دوست ۔ میرے سچے غمخوار اور بہی خواہ ۔"

ایک ساعت کے لئے مسز کٹلے کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم جھلکا ۔ اور دفعتاً غائب ہوگیا ۔

"چائے پئیں گے نا پروفیسر صاحب ۔" مسٹر کٹلے چلانے لگا ۔ مسز کٹلے خاموشی سے اُٹھی اور کیتلی چولہے پر رکھ کر پھر سے بیٹھ کر اُسی انہماک سے سویٹر بننے لگی ۔

"اخاہ پروفیسر صاحب مجھے ایک لطیفہ یاد آیا ۔" مسٹر کٹلے نے بات چھیڑی ۔ قاسم نے کوئی توجہ نہ دی مسز کٹلے نے جمائی لے کر ایک اکتاہٹ بھرے انداز میں دیوار سے ٹیک لگالی ۔

کچھ دنوں کے بعد علی الصبح جب پروفیسر بیدار ہوا تو اُس نے دیکھا کہ مسٹر کٹلے کھڑکی کے پاس کھڑا ہے ۔ منہ زرد ہو رہا تھا ۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پھر بیمار پڑ گیا ہے ۔ پروفیسر نے جلدی سے اُٹھ کر دروازہ کھولا ۔ "آئیے آئیے ۔ اندر آئیے ۔"

"اندر کیا آؤں پروفیسر میں بے حد شرمندہ ہوں ۔" وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا ۔ "توبہ حماقت کی بھی انتہا ہوتی ہے پروفیسر لیکن اب تم سے کیا پردہ ہے ۔ رات میں نے اتنا شور مچایا اور اس قدر گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختا رہا لعنت ہے مجھ پر ۔ جانے کیا ہے ۔ خواہ مخواہ رائی کا پہاڑ بنا لیتا ہوں ۔ رات تو تم نے مجھے جی بھر کر کوسا ہوگا ۔"

"ہاں رات کو آوازیں آرہی تھیں ۔" پروفیسر نے بات چلانے کے خیال سے کہا ۔

"آوازیں" ۔ ۔ ۔ رات تو چیخوں تک نوبت آپہنچی ۔ نہ جانے کیا ہو جاتا ہے مجھے اب اپنے ذہن کا علاج کروانا پڑے گا ۔ میری نظر دھندلا جاتی ہے ۔ اپنے بہترین دوست کے متعلق ایسی باتیں سوچنا ۔ اف پروفیسر میں تو پاگل ہوں پاگل ۔ اور بات کس قدر معمولی تھی جب میں سینما دیکھ کر گھر لوٹا ۔ تو قاسم بیٹھا تھا ۔ مسز کٹلے کے ساتھ ۔ میں نے ان دونوں کو اکٹھے بیٹھے دیکھ کر خواہ مخواہ غصے میں چلانا شروع کر دیا ۔ جانے کیا ہو جاتا ہے مجھے انہیں اکٹھے دیکھ کر ۔ میں نے سمجھا ۔۔۔۔۔ تف ہے مجھ پر ۔ اب میں آپ کو کیسے بتاؤں پروفیسر مگر آپ سے کیا پردہ ہے اب ۔ بات ساری یوں تھی کہ کل رات قاسم جو اندھیرے میں ہمارے گھر کی طرف آرہا تھا ۔ اس خیال سے کہ میں گھر پر ہی

ہوں گا اور ذرا گپ شپ رہے گی ۔ وہ اکثر رات کو آجایا کرتا ہے ۔ اگرچہ بد قسمتی سے میں بسا اوقات باہر ہوتا ہوں ۔ خیر اندھیرے میں جو وہ آیا تو بے چارہ گر پڑا ۔ کپڑے سارے کیچڑ میں لت پت ہو گئے ۔ بیچاری مسز کٹلے نے دوڑ کر اُسے اٹھایا اور اندر لے گئی اور میرا سلیپنگ سوٹ پہنا دیا ۔ ابھی قمیض کے بٹن بھی نہ لگائے تھے کہ میں آپہنچا ۔ اس کے بٹنوں کا بیچاری کو کیا خیال رہتا ۔ آخر افراتفری میں اس کے اپنے بٹن بھی کھل گئے تھے ۔ بے چاری اکیلی قاسم کی اتنی بڑی لاش کو اندھیرے میں اٹھا کر گھر لائی تھی ۔"

"آپ ہی سوچئے پروفیسر ایک گھبرو جوان کو گود میں اٹھا کے لانا یہ کچھ مسز کٹلے ہی کا کام ہے ۔ اگر مجھے اٹھانا پڑ جاتا تو ۔ ۔ ۔ توبہ توبہ ۔ لیکن میری حماقت دیکھئے میں سمجھا کہ اُس نے اپنے بازو اس کے گلے میں ڈال رکھے ہیں ۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ جب کسی کو اٹھایا جائے تو بازو گلے میں ڈالنے ہی پڑتے ہیں ۔ دراصل بات یہ تھی قاسم نے مسز کٹلے کا سہارا لے رکھا تھا اور مسز کٹلے نے جو منہ قاسم پر جھکا رکھا تھا ۔ صرف اس لئے تھا کہ وہ اس وقت اُس سے پوچھ رہی تھی ۔ زیادہ چوٹ تو نہیں آئی ۔ اور میں سمجھا اُس کے منہ سے منہ ملا رہی ہے ۔ پاگل پنا اور کیا ۔ اف"

اُس نے اپنا سر ہاتھوں سے تھام لیا ۔ "مجھے تو کسی ہسپتال میں ہونا چاہیئے ۔ یقین جانئے یہ میرا شک مجھے کسی روز پاگل خانے میں لے جائیگا ۔ پروفیسر مجھے بچاؤ ۔"

"وہ بے چاری اُس کے زخموں پر دوا مل رہی تھی ۔ اور میں کیا سمجھا ؟ اب میں تمہیں کیا بتاؤں پروفیسر اگر مسز کٹلے کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو کپڑے پھاڑ کر گھر سے نکل جاتی ۔ یہ اسی کی ہمت ہے کہ میری ایسی بے ہودہ باتیں برداشت کرتی ہے ۔ بڑی اچھی ہے پروفیسر آئے دن میری اس قسم کی واہیات باتیں برداشت کرتی ہے ۔ آئے دن ہر مرتبہ میں یہ عہد کرتا ہوں کہ آئندہ اس پر ایسے الزامات نہ لگاؤں گا ۔ لیکن جانے مجھ پر کیوں جنوں طاری ہو جاتا ہے ۔ اور میں سب وعدے بھول جاتا ہوں ۔ لیکن وہ ہر بار مجھے معاف کر دیتی ہے ۔ سچے دل سے معاف کر دیتی ہے ۔"

"لیکن مسز کٹلے" زیری نے کچھ کہنے کی کوشش کی ۔

"میں جانتا ہوں" کٹلے نے اُسے خاموش کر دیا ۔ "میں جانتا ہوں تم مجھے لعنت ملامت کرو گے ۔ لیکن میں کیا کروں ۔ میں اپنے آپے میں نہیں رہتا ۔ ایسے موقعے پر چلانے لگتا ہوں ۔ میرے منہ سے کف جاری ہو جاتا ہے ۔ میرا سر گھومنے لگتا ہے ۔ میری آنکھوں میں خوف اتر آتا ہے اور جب وہ وقت بیت جاتا ہے تو اپنے وجود پر شرم محسوس کرنے لگتا ہوں ۔"

یہ کہہ کر مسٹر کٹلے خاموش ہوگیا اور دیر تک چپ چاپ خیالات میں کھویا رہا ۔ پھر دفعتاً اس نے اپنا سر اٹھایا ۔ "اچھا پروفیسر اب میں جاتا ہوں ۔" لیکن وہ رُک گیا ۔ "اگر تم بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں ، میرا مطلب ہے ۔ ویسے تو مسز کٹلے نے مجھے معاف کر دیا ہے ۔ لیکن پھر بھی تم جانتے ہو دل میں ناراضگی تو رہتی ہے ۔ سو اگر تم کسی وقت اسے سمجھا دو تو یہ رہی سہی خلش بھی نکل جائے ۔ کسی وقت بر سبیلِ تذکرہ بات کر دینا ۔ اور ہاں ویسے تو مجھے مکمل اعتماد ہے ۔ پھر بھی ذرا احتیاط رہے ۔ مطلب ہے یہ بات باہر نہ نکلے ۔" وہ ہنسنے لگا ۔

"فکر نہ کرو مسٹر کٹلے ۔" زیری نے جواب دیا اور کٹلے "شکریہ شکریہ" چلاتا ہوا باہر نکل گیا ۔ اُسی رات زیری نے سوچا کہ مسٹر کٹلے کے گھر سے ہو آئے ۔ حقیقت یہ ہے کہ پروفیسر کی دلچسپی اُس سے روز بروز بڑھتی جا رہی تھی ۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بات کیا ہے ۔ لیکن وہ محسوس کرتا تھا کہ اس پتھر کے مکان سے کوئی اسرار وابستہ ہے ۔

زیری نے دروازہ کھٹکھٹایا ۔ "آئیے" مسز کٹلے کی آواز سنائی دی ۔

"سلام علیکم" پروفیسر نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا ۔

کمرے میں چارپائی پر مسز کٹلے پڑی تھی ۔ اور پاس ہی آرام کرسی پر قاسم بیٹھا تھا ۔

"اوہ" پروفیسر بولا ۔ "معاف کیجئے ۔ مسٹر کٹلے کہاں ہیں ؟"

قاسم نے جواب دیا ۔ "ابھی باہر گئے ہیں ۔"

"اوہ ۔ ۔ اوہ آپ مسز کٹلے ۔" پروفیسر نے جانے کیا کہنے کی کوشش کی ۔ "میرا مطلب ہے ۔ ۔ ۔"

قاسم نے جواب دیا۔ "اُن کی طبیعت اچھی نہیں۔"

"اچھا تو میں پھر حاضر ہوں گا۔" پروفیسر باہر نکل آیا۔ ساتھ والے کمرے میں ایک لالٹین جل رہی تھی۔ جس کے قریب پنگوڑے میں تھا سو رہا تھا۔ اس کے قریب چارپائی پر لڑکی بیٹھی لالٹین کے شعلے کو گھور رہی تھی۔ کمرے کے دوسرے کونے میں بڑا لڑکا کونے کی طرف منہ موڑے دیوار پر کچھ لکھ رہا تھا۔

اگلے روز صبح سویرے مسٹر کٹلے پھر آموجود ہوا۔ "پروفیسر" وہ اُسے دیکھتے ہی چلایا۔ "وہ میرا واحد دوست تھا۔ ساری تتھیا گلی میں۔ اس نے ہمیشہ میری خیر خواہی کی۔ لیکن وہ بھی چلا گیا ہے۔ ہمیشہ کے لئے چلا گیا ہے۔ میرا عزیز دوست قاسم!"

زبیری نے پوچھا۔ "وہ کب۔"

"آج صبح۔ مجھے بتاؤ پروفیسر مجھ سے ناراض ہو کر تو نہیں گیا۔ کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کل اسے تار آگیا اور اُسے جانا پڑا۔ تار وصول کرتے ہی وہ مجھے اطلاع دینے کے لئے گھر آیا۔ لیکن میں باہر تھا۔ دوسرے شو کے بعد گھر پہنچا۔ رات کے دو بجے تک وہ بیچارا بیٹھا میرا انتظار کرتا رہا۔ کتنا لگاؤ تھا اُس کو مجھ سے۔ میری حماقتوں کے باوجود میری بدحواسیوں کے باوجود۔ ایسا دوست مجھے کبھی نہیں ملے گا۔ لیکن پروفیسر دوستوں کے معاملے میں مَیں بڑا خوش قسمت ہوں۔ مجھے ایک نا ایک دوست مل ہی جاتا ہے۔ مگر افسوس کہ میں اُن سے اچھا سلوک نہیں کرتا۔ آج میں بڑا دکھی ہوں پروفیسر۔ اگر ناگوار نہ ہو تو آؤ ہم اکٹھے چائے پئیں۔ مسز کٹلے ہمارا انتظار کر رہی ہے۔"

مسز کٹلے نے میز پر چائے کے برتن پہلے ہی سے چن رکھے تھے۔ "آئیے" وہ مسکرا کر بولی۔ ۔ ۔ ایک مبہم سی پُراسرار مسکراہٹ۔ "میں نے تم سے کہا نہ تھا پروفیسر کہ مسز کٹلے انتظار کر رہی ہے۔ دیکھ لیا نا۔ تشریف رکھئے صوفے پر۔ بیٹھئے نا۔ ذرا ان کی تواضع کرو نا مسز کٹلے۔ اب قاسم کے جانے کے بعد پروفیسر زبیری کے سوا ہمارا کون ہے۔"

مسز کٹلے نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

کٹلے نے پریشانی سے پوچھا۔ "کیوں کیا بات ہے۔"

"وہی سر درد" وہ سر اٹھائے بغیر بولی ۔ "سخت درد ہے ۔"
کٹلے نے جواب دیا ۔ "تو اسپرو کی گولی لے لونا ۔"
"سب ختم ہوگئیں ۔" وہ بولی ۔ "ایک بھی نہیں ۔"
"اچھا اچھا" مسٹر کٹلے اٹھا "میں لاتا ہوں ۔ ابھی لایا یہ پاس ہی تو دوکان ہے ۔ پندرہ منٹ میں آیا ۔"
"ٹھہریئے مسٹر کٹلے" زیری نے صوفے سے اُٹھتے ہوئے کہا ۔ "میں بھی ۔ ۔ ۔"
"نہیں نہیں" کٹلے چلایا اور کمرے سے باہر نکل گیا ۔ پروفیسر مجبوراً پھر صوفے پر بیٹھ گیا ۔
کٹلے کے بڑے لڑکے نے باپ کو باہر جاتے دیکھا تو ایک نظر اُس نے اپنی ماں کی طرف ڈالی جو اسی طرح سر ہاتھوں میں تھامے بیٹھی تھی ۔ پھر اُس نے پروفیسر زیری کی طرف دیکھا اور چپکے سے اُٹھ کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا ۔ اُس کو جاتے دیکھ کر اُس کی چھوٹی بہن نے اپنی گڑیاں اُٹھالیں اور چپکے سے ملحقہ کمرے کی طرف چل پڑی ۔ یہ دیکھ کر ننھا گھسٹ کر ملحقہ کمرے کی دہلیز پر چڑھنے لگا ۔
زیری نے ایک نظر کمرے پر ڈالی ۔ اُس نے محسوس کیا جیسے کمرے میں لٹکی ہوئی تصویریں اُلٹی ہوگئی ہیں
ٹھک ۔ ۔ ۔ ملحقہ کمرے کا دروازہ بند ہوگیا ۔
مسز کٹلے نے سر اٹھایا ۔ اُس کی آنکھیں خون کی طرح سُرخ تھیں ۔ وہ اُٹھی ۔ "میرا سر" وہ چلائی ۔ "میرا سر اور پھر دھڑام سے صوفے پر گر پڑی ۔ ۔ ۔ زیری کے منہ سے اِک چیخ نکل گئی ۔
"آباہا ۔" ساتھ والے کمرے سے لڑکی کی مدھم آواز آئی ۔ "چپ" لڑکے نے کہا ۔ "چپ ، امی ۔ ۔ ۔"

خدا بخش

"چپ" یوسف نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا اور دوسرے ہاتھ سے ربڑ کی نالی میرے ہاتھ سے چھین کر اس پر ایک بڑی سی کتاب رکھ دی ۔ "سپرنٹنڈنٹ" اس نے میرے کان میں کہا ۔ ہم دونوں نے کتابیں ہاتھ میں پکڑ لیں اور یوں بیٹھ گئے جیسے پڑھنے میں شدت سے مصروف ہوں اور پاؤں کی چاپ کو غور سے سننے لگے جو صاف طور پر بورڈنگ کے برآمدہ سے سنائی دے رہی تھی ۔ بورڈنگ میں حقہ پینا قطعی طور پر منع تھا ۔ مگر خدا بخش ۔ ۔ ۔ وہ تو چاہتا تھا کہ کلاس روم میں بھی حقہ پیا جائے ۔ خدا بخش کو تین چیزوں کا خبط تھا ۔ حقہ پینا تہبند باندھنا اور مذاق کرنا ۔ خیر اس وقت تو وہ گنوار مسخرہ گاؤں گیا ہوا تھا ۔ پھر بھی ہم بورڈنگ کے کمرے میں حقہ پی رہے تھے ۔ حقہ حسبِ معمول میز کے نیچے چھپا ہوا تھا جس پر اتنا بڑا میز پوش پڑا تھا کہ وہ میز سے لے کر فرش تک لٹک رہا تھا ۔ حقے کی ربڑ کی نے کمرے میں بچھی ہوئی دری کے نیچے نیچے چلی آتی تھی ۔ اور درمیان میں جہاں ہم بیٹھا کرتے تھے ۔ ایک سوراخ سے بالشت بھر باہر نکلی ہوئی تھی ۔

"بارہ بجے ۔ سپرنٹنڈنٹ ؟" میں نے حیرانی سے کہا ۔

"اس قلندر کا کیا ہے ۔" یوسف مسکرایا ۔ "سالے کو وقت بے وقت کی بھی تمیز نہیں ۔" کھٹ کھٹ ۔ دروازے پر دستک ہوئی ۔

یوسف نے ربڑ کی نے کو مزید احتیاط سے ڈھانپا اور پھر دروازہ کھول دیا ۔

"چپ" منہ پر انگلی رکھے ہوئے خدا بخش داخل ہوا ۔

"ارے تم ؟" یوسف چلّایا ۔

"چپ" خدا بخش نے پھر اشارہ کیا ۔

"کیوں پیچھے پولیس لگی ہے کیا ؟" یوسف نے ازراہِ مذاق پوچھا ۔

"ایسی لگی ہے ۔" وہ بولا ۔ "کہ بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ۔ ذرا ٹھہرو ابھی آیا ۔"

خدا بخش کے اس پراسرار انداز کو دیکھ کر ہم دونوں دو ایک ساعت خاموش رہے ۔ "نہ جانے کیا نیا مذاق لے کر آیا ہے" یوسف نے کہا ۔

"مذاق" ۔ ۔ ۔ "دہقان کہیں کا ! اُسے کیا پتہ مذاق کسے کہتے ہیں ۔"

چار ایک منٹ ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے ۔ پھر وہ واپس آیا ۔ اس کے سر پر ایک چھوٹا سا ٹرنک تھا ۔

"ارے" یوسف چلایا ۔ "چوری کی ہے کیا ؟"

نہیں نہیں ۔ وہ ٹرنک رکھ کر بولا ۔ "چوری کی نہیں ۔ اپنی ہے اپنی ۔"

"اپنی کیا" مجھے اس کی اُلٹی سیدھی باتوں پر غصہ آجاتا تھا ۔

"آؤ بھی نا اب" خدا بخش نے دروازے سے باہر کسی سے کہا ۔ اور پھر ہاتھ باہر نکال کر ایک رنگین سی گٹھڑی کو اندر گھسیٹ لیا ۔ گٹھڑی کے اوپر لے سرے سے چوٹی لٹک رہی تھی ۔

"ہائیں !" میرے ہاتھ کی کتاب زمین پر گر گئی ۔

یوسف کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا ۔ "لڑکی !"

"چپ" خدا بخش بولا ۔ "قلندر نہ سن لے ۔"

"لیکن" میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی ۔

لڑکی نے آنکھ اٹھا کر دیکھا ۔ موٹی موٹی سیاہ آنکھیں ۔ گندمی رنگ پر جوانی کا نکھار ۔

ویسے تو ہم تینوں کی تمنا تھی کہ اللہ کرے چھت پھٹ جائے اور ایک لڑکی نازل ہو جائے لیکن اس وقت ہمارے دل دھک دھک کر رہے تھے ۔ رگوں میں خون خشک ہوا جا رہا تھا اور حلق میں کانٹا سا کھڑا ہوگیا تھا ۔ کبھی ہم خدا بخش کی طرف دیکھتے اور کبھی اس رنگدار کپڑوں میں لپٹی ہوئی گٹھڑی کی طرف ۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔

سمجھ میں آتا بھی کیسے ۔ خدا بخش کی ہر بات انوکھی تھی ۔ گاؤں کو جانے

سے پہلے جو اس نے بدتمیزی کی تھی ۔ ابھی تک میرے دل سے اس کے خلاف غصہ نہ گیا تھا ۔ دوپہر کے وقت بھاگا بھاگا آیا ۔ "لو بھئی" اس نے گپ ہانکی ۔ "پیسے آئے ہیں آج ۔ منی آرڈر پانچ روپیہ ۔"

"کیا واقعی" میں خوشی سے چلایا ۔

"رئیسی" ۔ ۔ ۔ خدا بخش نے منہ بنایا ۔ "آج چائے ہوگی ۔ بالائی کی قلفیاں اور سیر رہے گی ۔ کمپنی باغ کی سیر ۔"

ہم بے وقوف تھے ۔ جو اس کی بات مان جاتے تھے ۔ بھلا اسے کہاں سے منی آرڈر آتا ۔ جب کہ نہ اس کا گھر تھا نہ گھاٹ ۔ نہ اپنے نہ بیگانے ۔ ساری عمر اسکول کے وظیفے پر تعلیم پائی تھی اُس نے ۔ کرکٹ کا بہترین کھلاڑی تھا نا ۔ اس لئے کالج والے کھانا بھی دیتے تھے اور جیب خرچ بھی ۔

اس کے پاس صرف ایک پتلون تھی جسے وہ ہر چوتھے دن خود دھو کر استری کر لیتا تھا ۔ اور جہاں بھی جاتا اُسے کاغذ میں لپیٹے اٹھائے پھرتا کالج میں بھی تہبند باندھ کر جاتا تھا ۔ جب کلاس روم میں جانا ہوتا تو پھٹ سے پتلون چڑھا لیتا اور تہبند لپیٹ لیتا ۔ کالج ختم ہوتے ہی پتلون سے نکل کر تہبند میں لپٹ جاتا ۔ ارے یار یہ سارنگی کا غلاف پہن کر چلا نہیں جاتا ۔" پتلون کے متعلق وہ یوں اظہارِ خیال کیا کرتا تھا ۔

ہاں تو اس روز رات کے وقت اس نے تانگہ لیا ۔ آؤ یار وہ چلایا ۔ تمہیں سیر کرائیں ۔ کیا یاد کرو گے ۔

دو گھنٹے ہم کمپنی باغ میں گھومتے رہے ۔ پھر خدا بخش تانگے کو ویران سڑک پر لے گیا ۔ ذرا ٹھہرو ۔ وہ بولا ۔ اور اتر کر پیشاب کرنے بیٹھ گیا ۔ دفعتاً وہ اٹھ کر چلایا ۔ پیسہ ایک بھی نہیں ہے ۔ اور پھر بھاگا ۔ دو ایک ساعت کے لئے تو ہم حیران بیٹھے رہے ۔ پھر یوسف نے چھلانگ ماری اور بھاگ اُٹھا ۔ میں نے موقع کی نزاکت کو سمجھ کر جست بھری ۔ ہم کھیتوں میں بھاگ رہے تھے ۔ پیچھے پیچھے تانگے والا گالیاں دیتا ہوا آرہا تھا ۔ اگرچہ میں پوری طاقت سے دوڑ رہا تھا ۔ لیکن تانگہ والا ہر ساعت میرے قریب آتا جاتا تھا ۔ دفعتاً سڑک سے خدا بخش کی آواز آئی ۔ "او تانگہ والے سنبھال اپنا تانگہ ۔" اس نے زور سے گھوڑے کی پیٹھ

پر ایک دی اور گھوڑا فراٹے بھرتا ہوا بھاگا ۔ کوچوان رُک گیا اور گالیاں دیتا ہوا تانگہ کی طرف بھاگا ۔

عجیب قسم کے مذاق سوجھتے تھے اسے ۔ اس کی اسی عادت کی وجہ سے سزا کے طور پر اُسے ڈیڑھ مہینے کے لئے پرنسپل نے گاؤں بھیج دیا تھا اور آج وہ بیس دن کے بعد اس ڈرامائی انداز سے اس رنگین گٹھڑی کو ساتھ لئے آدھمکا تھا ۔ وہ رنگین گٹھڑی جس کے سر سے اتنی لمبی چوٹی لٹک رہی تھی ۔ ناک میں اتنی بڑی تتھ پڑی ہوئی تھی اور سر پر اتنا بڑا جھومر لگا تھا ۔

تمام تر قصور خدا بخش کا تھا ۔ اگر وہ مسخرا حامد سے چار ایک بھونڈے مذاق نہ کرتا تو سب کو اتنی خفت نہ اٹھانی پڑتی ۔ آپ جانتے ہیں حامد کو ۔ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے کی مثال کا موجد اگر کچھ وقت حامد کے ساتھ بسر نہ کرتا تو اسے اتنی بڑی حقیقت کبھی نہ سوجھتی ۔ ہماری بد قسمتی سمجھ لیجئے کہ حامد کا ابا جوتوں کی دوکان کے علاوہ ایک سینما ہال کا مالک بھی تھا ۔

ان ہی دنوں اس ہال میں ایک تھیٹریکل کمپنی بھی آگئی ۔ اور جیسا کہ امتحان کی بری عادت ہے ۔ کہ نہایت غیر مناسب موقعہ پر سر پر آ سوار ہوتا ہے ۔ وہ بھی تھیٹر کمپنی کے ساتھ ہی آپہنچا ۔

انہی دنوں حامد ایک روز ہمارے کمرے میں آیا ۔ اس کے ہاتھ میں تہ کیا ہوا گتہ سا تھا ۔ بڑے فیاضانہ انداز سے کہنے لگا ۔ ”یار میرے تھیٹر کا پاس ہے ۔ ہمارا اپنا ہال ہے نا ۔ اور اصول کے مطابق پروپرائٹر بکس کا پاس ہمارے پاس ہی رہتا ہے ۔ لیکن ! ۔ ۔ ۔ اس نے آہ بھری ۔ ”ہم تو تھیٹر جا ہی نہیں سکتے ۔ نہ تم نہ میں ۔ یونیورسٹی کا امتحان سر پر آگیا ہے ۔ میرا تو کوئی دوست نہیں ۔ تم لے لو ۔ یہ پاس کسی دوست کو دے دینا ۔ تاکہ کام آئے ۔“ یہ کہہ کر اُس نے وہ تہہ کیا ہوا گتہ میز پر رکھ دیا ۔ اور بڑی بے نیازی سے کمرہ سے باہر نکل گیا ۔

حامد اچھی طرح جانتا تھا کہ ہم تینوں فطرتاً سرہانے بالائی کا پیالہ رکھ کر سو نہیں سکتے اور پھر تھیٹریکل کمپنی ، وہ تھیٹریکل کمپنی جس میں بالو ، نجو اور ثریا کام کرتی تھیں ۔

"صرف ایک بار تھیٹر دیکھیں گے صرف ایک بار" خدا بخش کچھ دیر تک بھی صبر نہ کر سکا ۔ "لیکن ایک شرط ہے ۔" وہ خفت مٹانے کے لئے بولا ۔ "اگرچہ یہ پاس روز کام میں لایا جا سکتا ہے ۔ مگر کل سے اسے استعمال کرنا ہم پر حرام ہوگا ۔ خدا کی قسم !" وہ چلانے لگا ۔ "جو اسے کل استعمال کرے گا ۔ حرامی ہوگا ۔ ہاں البتہ ۔ آج ۔ آج ۔ کیا حرج ہے ؟"

لیکن بورڈنگ سے چل کر تھیٹر ہال تک پہنچنا کچھ آسان کام نہ تھا ۔ وہ بورڈنگ نہیں تھا ۔ وہ تو شہر سے پانچ میل کے فاصلے پر نہر کے کنارے پر ایک ویران کوٹھی تھی جسے زبردستی بورڈنگ بنا رکھا تھا ۔ وہاں زمین پر رات بھر سانپ رینگتے ، درختوں پر اُلو بولتا ۔ اور کمروں میں چیونٹیوں کی قطاریں چلتیں ۔ ہم میں سے کسی کے پاس سائیکل بھی نہ تھا ان سب باتوں کے علاوہ روز شام کو پرنسپل وزٹ پر آیا کرتا تھا ۔ کیونکہ دو دن پیشتر ہی اُس نے ایک لمبا چوڑا لیکچر دیا تھا جس میں تاکید کی تھی ۔ کہ اب ہم امتحان کے لئے تیاری شروع کر دیں اور وہ بلاناغہ یہ دیکھنے کے لئے کہ ہم مطالعہ کرتے ہیں یا نہیں روزانہ وزٹ کیا کرتا تھا ۔

"آہا" خدا بخش نے بیٹھے بیٹھے چٹکی ماری ۔ "بس بن گیا کام ۔"

"کیا ؟" یوسف نے پوچھا۔

"جب پرنسپل واپس جائے تو ہم اس کی لینڈو میں بیٹھ جائیں ۔"

"کھی کھی ای ۔" میری ہنسی نکل گئی ۔ اس میں میرا قصور نہ تھا ۔ خدا بخش کی بات چاہے کتنی معقول کیوں نہ ہو وہ اسے اس انداز سے ادا کرتا ہے کہ بے اختیار ہنسی نکل جاتی ہے ۔ "وہ کیا تمہیں گاڑی میں بٹھائے گا ۔" یوسف نے ہنس کر پوچھا ۔

"گاڑی میں نہیں بٹھائے گا تو لینڈو کے پیچھے جو سیٹ بنی ہوتی ہے وہ ۔"

اس بات پر مجھے بے حد غصہ آیا ۔ جب بھی وہ معقول بات کرتا تو مجھے غصہ آجاتا ۔ ایک غیر معقول آدمی کو معقول بات کرنے کا کیا حق ہے؟

نتیجہ یہ ہوا کہ ہم تینوں کوٹ بوٹ پہن رضائیوں میں لپٹ کر کتابیں سامنے

رکھے یوں پڑ گئے ۔ جیسے شدت سے مطالعہ میں مصروف ہوں ۔

"خوب خوب" پرنسپل نے دروازے سے جھانک کر کہا ۔ "شاباش ۔ اونہوں ، کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں ۔ لگے رہو کام میں ۔"

جب اس کی لینڈو چلنے لگی تو ہم درختوں کی آڑ سے نکل کر چپکے سے لینڈو کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے ۔

اس کے بعد ہمارا دستور ہوگیا کہ سارا دن چادر تان کر سوتے ۔ شام کو بیدار ہو کر مل کر تھیٹر والوں کو ، حامد کے باپ کو ، جس نے وہ ہال بنایا تھا اور حامد کو جس نے ہمیں وہ پاس دیا تھا گالیاں دیتے ۔ "یا اللہ" خدا بخش ہاتھ جوڑ کر دعا مانگتا ۔ "ان تھیٹر والوں کا بیڑا غرق ہو جائے ، اس ہال کو آگ لگ جائے ۔ اللہ کرے کوئی نواب بالو ، نجو اور ثریا تینوں سے نکاح کر کے انہیں گھر میں ڈال لے ۔" پھر وہ قسمیں کھانے لگتا ۔ "بھئی اب جو تھیٹر دیکھے وہ اپنے باپ کا نہیں ۔ یعنی میرا مطلب ہے کل سے ۔ آج تو شیریں فرہاد ہے نا ۔ بھئی شیریں بنتی ہے نجو کمبخت تو مزا آجاتا ہے اور وہ دشت کا نظارا ۔ اور پہاڑوں سے ندی کا نکلنا ۔"

وہ شترکینہ حامد بھی بڑا چوکنا رہنے والا شخص تھا ۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ ہم بلا ناغہ تھیٹر دیکھتے ہیں تو ایک روز اُس نے پرنسپل کو بھی اسی بکس میں مدعو کر لیا ۔ اس روز شیریں فرہاد کا کھیل تھا ۔ بکس میں پہنچ کر ابھی ہم تینوں ٹانگیں پھیلا کر راستے کی کوفت دور کرنے بھی نہ پائے تھے کہ حامد بھاگا بھاگا آیا ۔

"ارے یار" وہ بولا ۔ "تم آئے ہوئے ہو ۔ اب کیا ہوگا ۔ یہاں تو پرنسپل صاحب آرہے ہیں ، سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں وہ تو ۔" اُس نے جھٹ ہم کو اٹھا کر بکس کے کنارے نیچے فرش پر بٹھا دیا ۔ اور تین بوریاں اٹھا کر ہمارے سر پر یوں ڈال دیں ۔ جیسے ہم کارخانے کے مزدور تھے ۔

کچھ دیر کے بعد پرنسپل صاحب کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی اور وہ آکر ہمارے پاس والی کرسی پر دراز ہوگئے ۔ میری رگوں میں خون خشک ہوگیا ۔ یوسف بھی یوں پڑا تھا ۔ جیسے کب کا مرا ہوا ہو ۔ لیکن خدا بخش ہر دو منٹ کے بعد دبی آواز سے کہتا ۔ ہی ۔ ہی ۔ ہی ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر منہ پر ہاتھ رکھ لیتا ۔

جیسے ہنسی دبا رہا ہو ۔ کمبخت کو اس وقت بھی مذاق سوجھ رہا تھا ۔

کھیل شروع ہوا تو خدا بخش قطعی طور پر بھول گیا کہ وہ کون تھا اور کہاں بیٹھا تھا ۔ اور اس کے قریب والی کرسی سے لٹکتی ہوئی ٹانگیں کس کی تھیں ۔ ورنہ اگر اسے یہ سب باتیں یاد ہوتیں تو چاہے سٹیج پر شیریں کیسی ہی بے دردی سے فرہاد کو پیٹتی وہ کبھی باآواز بلند چلا کر نہ کہتا ۔ "اری مارتی کیوں ہے تو اُسے ۔"

اس کا یہ کہنا ہی تھا کہ تمام تماشائیوں کی نگاہیں ہماری طرف اُٹھ گئیں ۔ پرنسپل نے اُٹھ کر ہمارے سر سے بوریاں اتار دیں ۔ اور ہم تینوں شرم سے زمین میں گڑ گئے ۔

اس کے بعد وہ ہنگامہ بپا ہوا کہ توبہ ہے ! پرنسپل نے فیصلہ کر لیا کہ ہمارے نام امتحان کے لئے نہیں بھیجے جائیں گے ۔ ہم تینوں نے ہر ممکن طریقے سے کوشش کی ہے کہ پرنسپل اپنا ارادہ بدل دے ۔ لیکن بے کار ۔ اگر پرنسپل اس معمے کو صرف سمجھ ہی لیتا تو شاید اسے اس قدر غصہ نہ آتا ۔ وہ جانتا تھا کہ ہم تینوں کے پاس سائیکل نہیں تھے ۔ اور آموں والی کوٹھی کے قرب وجوار سے کرائے کا تانگہ ملنا ممکن نہیں تھا ۔ اس کے علاوہ جب وہ بورڈنگ میں "وزٹ" پر آیا تھا تو ہم تینوں رضائیوں میں لپٹے پڑھنے میں مصروف تھے ۔ پھر ہم اس سے پہلے تھیٹر میں کیسے پہنچ گئے ۔ یہ تھا وہ معمہ جسے حل کرنے سے وہ قاصر تھا ۔ اور اسی وجہ سے وہ غصے سے بھوت بنا ہوا تھا ۔

جب اُسے معلوم ہوا کہ ہم اس کی لینڈو کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر تھیٹر میں پہنچے تھے ۔ تو بے اختیار اس کی ہنسی نکل گئی ۔ اُسے ہنستے دیکھ کر خدا بخش رونی سی شکل سے بولا ۔ "کم از کم آپ ہماری ذہانت کی داد تو دیجئے ۔" اس پر پرنسپل بہت ہنسا ۔ اس نے ہمارے نام تو امتحان میں بھیج دئے ۔ لیکن خدا بخش پر یہ بندش لگا دی کہ وہ ڈیڑھ ماہ کے لئے اپنے گاؤں چلا جائے تاکہ وہاں تیاری کر سکے ۔

"جی کون سے گاؤں چلا جاؤں ۔" وہ بولا ۔

"تمہارا اپنا گاؤں نہیں کوئی ۔"

وہ مسکرا دیا ۔ "ہر گاؤں میرا اپنا ہی ہے جی ۔"

"تمہارے عزیز و اقارب نہیں کیا ۔" ؟ پرنسپل نے پوچھا ۔

"آپ جو ہیں" وہ بولا ۔ "یہ یوسف ہے اور یہ ہیں ۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا ۔

"اچھا" پرنسپل مسکرایا ۔ "تو تم میرے گاؤں میں چلے جاؤ ۔ وہاں ہماری حویلی خالی ہے ۔ میرا ملازم وہیں ہے ۔ وہ تمہیں دو وقت کی روٹی پکا دیا کرے گا ۔ باقی وقت تم پڑھ سکتے ہو ۔"

اور خدا بخش چلا گیا ۔ اور آج بیس دن کے بعد اس رنگین گٹھڑی کو اٹھائے واپس چلا آیا ۔

میں نے ایک نظر اس سرخ گٹھڑی کی طرف دیکھا میرا کلیجہ اچھل کر حلق میں آ اٹکا ۔ یوسف جو لڑکیوں کے معاملے میں اپنے آپ کو یوسف ثانی سمجھتا تھا ، اس وقت دبک کر ایک طرف بیٹھا ہوا تھا ۔ اس کی نگاہیں چھپنے کے لئے کونے تلاش کر رہی تھیں ۔

کمرے پر موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی اور ہمارے ذہن میں عجیب و غریب قسم کے سوال منڈلا رہے تھے ۔ نہ جانے وہ لڑکی کون تھی ؟ ۔ ۔ ۔ وہ چپ چاپ کیوں بیٹھی تھی ۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا ۔

دفعتاً برآمدے سے پاؤں کی چاپ سنائی دی ۔

میں نے ڈرے ہوئے کبوتر کی طرح یوسف کی طرف دیکھا ۔

یوسف اپنی زبان ہونٹوں پر پھیر رہا تھا ۔ اُس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا ۔

"نہ جانے یہ نئی آفت کون ہے ۔" خدا بخش مسکرا دیا ۔ اور پھر اس نے بھاگ کر اس گٹھڑی کو چوٹی سمیت گھسیٹ کر بڑی میز کے نیچے پھینک دیا ۔ جس کے تلے ہمارا حقہ چھپا ہوا تھا ۔

کھٹ کھٹ کھٹ ۔ دروازے پر دستک ہوئی ۔

یوسف اُٹھ بیٹھا ۔ لیکن اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے ۔

آج ساری رات پڑھتے رہو گے کیا ۔" سپرنٹنڈنٹ قلندر علی خاں نے

مسکراتے ہوئے اندر جھانک کر کہا۔ دفعتاً خدا بخش کو دیکھ کر وہ رُک گیا۔

"ہائیں۔ خدا بخش ہے۔"

"جی نہیں" وہ بولا۔ "میں خدا بخش ہوں۔"

"تم آبھی گئے ؟" اس نے خدا بخش کے مذاق پر توجہ نہ دی۔

"اور کیا کرتا جناب" وہ بولا۔

"لیکن ہم تمہیں بورڈنگ میں نہیں رکھ سکتے۔ پرنسپل صاحب کا حکم ہے۔"

"لیکن خان صاحب مجھے گاؤں والوں نے دیا ہے۔ میں کیا کروں اور یہی نہیں۔"

"نکال دیا ہے۔" اُس نے حیرانی سے پوچھ۔

"اور ساتھ ہی سر پر ایک گٹھڑی رکھ دی۔ اور پیچھے ایک دم لگا دی۔" وہ لمبی آہ بھر کر بولا۔

"گٹھڑی ! دم ! یہ سب کیا ہے۔"

"کچھ پتہ بھی چلے صاحب۔"

"آخر کیا بات ہوئی۔" قلندر علی کرسی پر بیٹھ گیا۔

مجھے خدا بخش پر بے حد غصہ آرہا تھا۔ بدتمیز خواہ مخواہ اس قلندر کو باتیں سنا سنا کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اگر اُسے میز کے نیچے پڑی گٹھڑی کا راز معلوم ہو جائے تو۔ ۔ ۔ ؟ زبردستی گٹھڑی اور دم کا قصہ لے بیٹھنا۔ نہ جانے اِس کا مطلب کیا تھا۔

"بات تو اتنی سی تھی۔" خدا بخش نے کہا۔ "لیکن اتنی سی بات کو اتنا بڑھا دینا۔ ۔ ۔ آپ جانتے ہیں۔ جوان لڑکے لڑکیوں کی طرف دیکھا ہی کرتے ہیں۔ "کیوں جی ؟"

"کیا مطلب" ؟ قلندر علی نے تلخی سے کہا۔

لیکن خدا بخش نے اس کی تلخی کی طرف توجہ نہ دی۔ "اور پھر اگر لڑکی واقعی حسین ہو۔ پھر تو اس کی طرف دیکھنا فرض ہو جاتا ہے۔ لیکن دیکھنے کا مطلب تو صرف دیکھنا ہوتا ہے نا۔ اور بس۔ کیوں جی ؟ لیکن گاؤں کی لڑکیوں کو یہ

چھوٹی سی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی وہ سمجھتی ہیں کہ دیکھا دل سے جاتا ہے آنکھوں سے نہیں"۔

وہ قلندر بھی صحیح معنوں میں قلندر ہی تھا ۔ خدا بخش کی اُلٹی سیدھی باتیں سُن کر بوکھلا گیا ۔ لیکن خدا بخش کی باتوں میں یہ عجیب خصوصیت تھی ۔ کہ ان کے اوٹ پٹانگ ہونے کے باوجود یا شاید اسی وجہ سے آپ انہیں سننے پر مجبور ہو جاتے ۔ آپ کا جی چاہتا کہ اس کی بات کاٹ دیں اور پھر اُٹھ کر چلے جائیں ۔ لیکن نہ جانے کیوں آپ کے لئے اس کی بات کاٹنا مشکل ہو جاتا ۔ اور آپ اُٹھ کر چلے جانے کا ارادہ کر لینے کے باوجود بیٹھے رہتے ۔

سپرنٹنڈنٹ نے بھی دو ایک مرتبہ کرسی میں پہلو بدلا جیسے وہ بات کاٹ کر واپس لوٹ جانے کا فیصلہ کر چکا ہو ۔ مگر اس کے باوجود وہ بیٹھا ہی رہا ۔ اور خدا بخش بلا سوچے سمجھے نہ جانے کیا کیا بکتا رہا ۔

سچی بات تو یہ ہے کہ میں دیکھتا تھا ہی نہیں ۔ میں تو کتاب پڑھتے پڑھتے تھک کر نگاہیں اُٹھاتا تھا ۔ اور وہ سمجھتی تھی میں دیکھ رہا ہوں ۔ اور پھر لچک لچک کر کنوئیں سے ڈول نکالنے لگ جاتی ۔ وہاں گاؤں کا کنواں تھا نا ۔ جہاں وہ سب پانی بھرنے آتی تھیں ۔ اب اگر پرنسپل صاحب گاؤں کے کنوئیں کے سامنے حویلی بنا لیں اور مجھے وہاں ایف اے کے امتحان کی تیاری کے لئے زبردستی بھیج دیں تو اس میں میرا کیا قصور ؟

چلو مان لیا کہ میں ان کو دیکھتا تھا ۔ پر میں تو سب ہی لڑکیوں کی طرف دیکھتا تھا ۔ لیکن ہر لڑکی یہ ہی سمجھتی کہ میں اس کو دیکھ رہا ہوں ۔ لو ۔ یہ بھی کوئی بات ہے ۔ ایسی ہوتی ہیں گاؤں والیاں ۔ اللہ بچائے ۔ شکر ہے میرا اپنا گاؤں کوئی نہیں ۔ ۔ ۔ لیکن ۔ لیکن اب کیا فائدہ ؟" اس نے آہ بھر کر کہا ۔ اور میز کی طرف دزدیدہ نگاہ ڈالی ۔

"پھر ایک روز صبح سویرے جب میں گلی سے گزر رہا تھا تو دفعتاً وہ اپنے گھر سے باہر نکلی اور مجھے دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گئی ۔ اس وقت ساری گلی میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہ تھا ۔ وہ دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو گئی ۔ اور دیوار سے مخاطب ہو کر کہنے لگی ۔ "ماں میری شادی پٹواری سے کر رہی ہے ۔

پر میں تو نہیں کروں گی یہ شادی ۔"

یہ سن کر مجھے ہنسی آ گئی ۔ بات ہی ایسی تھی ۔ میں نے دوسری دیوار کی طرف منہ کر کے کہا ۔ "کیوں نہ کرو گی تم شادی ، شادی سے بہتر چیز کیا ہو سکتی ہے ۔"

"میں پٹواری سے بیاہ نہیں کروں گی ۔"

"پٹواری سے نہ کرو گی بیاہ" ؟ میں نے کہا ۔ "اتنے بڑے عہدے دار سے نہ کرو گی ۔ پٹواری تو شہر کے ڈپٹی کمشنر سے بھی بڑا ہوتا ہے ۔"

یہ سن کر اس نے میری طرف منہ موڑ لیا اور میرے قریب آ کر غصے سے بولی ۔ "دیکھو جی ۔ میں تو زہر کھا لوں گی ۔ پر پٹواری سے بیاہ نہیں کروں گی ۔" اس وقت بڑے غصے میں تھی وہ ۔ جیسے تمامتر قصور میرا ہو ۔ بہر حال یہ کہہ کر وہ اپنے گھر میں داخل ہو گئی ۔ اور میں حیران وہاں کھڑا کا کھڑا رہ گیا ۔

دفعتاً مجھے خیال آیا کہ خدا بخش اس لڑکی کے متعلق قصہ سُنا رہا ہے ۔ جو میز کے نیچے چھپی ہوئی ہے ۔ میرا دل دھک سے رہ گیا ۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ فطری طور وہ بے حِس واقع ہوا ہے ۔ وہ جوش میں آ کر نتائج کے متعلق سوچنے کا عادی نہیں ۔ اگر اس قلندر کو معلوم ہو گیا تو بات پرنسپل تک جا پہنچے گی ۔ پھر کیا ہو گا ۔ میرا دل بیٹھنے لگا ۔ اور میں نے فیصلہ کر لیا ۔ کہ کسی طریقے سے خدا بخش کی توجہ کسی اور طرف مبذول کر دوں یا اشارہ کی مدد سے اسے سمجھا دوں ۔ کہ سپرنٹنڈنٹ سے وہ واقعہ بیان کرنا ہمارے لئے مصیبت کا باعث تھا ۔ ادھر یوسف کا رنگ بھی زرد پڑ رہا تھا ۔ شاید اُس نے بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ حالات بگڑ رہے تھے ۔ لیکن خدا بخش بات سنانے کے جنون میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ اس کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنا ناممکن دکھائی دیتا تھا ۔

مصیبت یہ تھی کہ اس کی بات اس قدر دلچسپ تھی کہ جلد ہم اُسے سننے میں اس قدر کھو گئے کہ ہمیں یاد ہی نہ رہا کہ ہمیں اُسے بات کرنے سے روکنا ہے ۔

دیکھئے نا اُس نے گال میں زبان دے کر آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا ۔ مجھے کیا معلوم کہ وہ زہر کھا لینے کی دھمکی ۔ درحقیقت دھمکی نہیں بلکہ محبت جتانے کا ایک طریقہ ہے ۔ میں کیا جانوں اس عشق و محبت کے قصے کو‘ میرے دماغ میں

عشق کا خانہ سرے سے خالی ہے ۔ بلکہ اگر وہ زہر کھانے کی بات نہ کرتی تو میں سمجھتا کہ وہ اپنی شادی کی خوشخبری ایک انوکھے انداز سے سنا رہی ہے ۔ ان لڑکیوں کے متعلق کوئی بات یقینی بھی ہو ۔ کبھی محبت جتانے کے لئے نفرت کا ڈھونگ رچالیتی ہیں اور کبھی نفرت چھپانے کے لئے محبت کا سوانگ بھر لیتی ہیں ۔ البتہ میں اس بات پر حیران ضرور تھا کہ یہ اللہ کی بندی مجھے کیوں زہر کھا کر مرنے کی دھمکی دے رہی ہے ۔ بیاہ کرنے والے ماں باپ ۔ ہونا ہے پٹواری سے میں کون ہوں ؟ جسے یہ واقعہ سنایا جا رہا ہے اور وہ بھی اِس انداز سے کہ مخاطب دیوار کو کیا جا رہا ہے ۔

اگر اسی روز میں پٹواری کو نہ دیکھتا تو شاید آج تک میں یہی سمجھتا کہ وہ لڑکی مجھ سے مذاق کر رہی تھی ۔ اور وہ زہر کھانے کا قصہ شادی کی خوشی کو چھپانے کے لئے ایک بہانہ تھا ۔

اس روز اتفاق سے پٹواری علیے سے ملنے آگیا ۔ دونوں اندر بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے کہ میرا دھیان کتاب سے ہٹ کر اُن کی باتوں کی طرف لگ گیا ۔

"اب تم سے کیا چھپانا ہے علیہ ، وہ بولا ۔ "جب تک ہماری فاطاں کا بیاہ نہ ہو جائے میں کس منہ سے اپنا بیاہ رچاؤں ۔ لڑکی کی ماں کا بھی یہی خیال ہے ۔ اور وہ لڑکی ! کیا بتاؤں علیہ لاکھوں میں ایک ہے ۔ دیکھنے میں چاند کا ٹکڑا ہے ۔ طبیعت بھی اچھی ہے ۔ اور نام چانتاں بالکل چاندنی ہے ۔ تم جانتے ہو فاطاں کی ماں کو مرے ہوئے آج پورے پندرہ سال ہو چکے ہیں ۔ اور میں نے صرف اس لئے بیاہ نہ کیا کہ لڑکی سوتیلی کے ہاتھ پڑ کر دُکھی رہے گی ۔ رشتے تو ملتے تھے ۔ لیکن اولاد پہلے ۔ ہاں اب لڑکی جوان ہوگئی ہے ۔ اپنا گھر بسا لے گی ۔ پھر میرا رشتہ ہو جائے تو اُسے تکلیف تو نہ ہوگی ۔ کیوں علیہ ؟ پھر یہ لڑکی بھی مہاجر ہے ۔ ان کا بھی بھلا ہو جائے گا ۔ بے چارے دربدر پھر رہے ہیں ۔ ویسے ہے بڑی شریف ۔ اور خاندان بھی اونچا ہے "ہاں" "پٹواری صاحب ہمیں تو یہ سن کر بے حد خوشی ہوئی ۔" علیہ کے یہ کہنے پر مجھے معلوم ہوا کہ وہ پٹواری ہے ۔ اور اُس زہر کھانے کی دھمکی دینے والی گوری کا نام چانتاں ہے ۔ "لیکن مصیبت یہ ہے علیہ ۔ اب تم سے کیا چھپا ہے ۔ اپنی فاطاں کی آنکھ کا نقص ایسا

ہے کہ اس کی بات بنتی نہیں کہیں ۔ پھر نقش بھی تو ایسے ہی ہیں ۔ مگر مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ جلد ہی انتظام ہو جائے گا ۔"

پھر جب پٹواری صاحب کمرے سے باہر نکلے تو ان کی ایک آنکھ دیکھ کر مجھ پر تمام بات واضح ہوگئی ۔

بیچاری زہر نہ کھائے گی تو کرے گی کیا ۔ پٹواری صاحب کی کمر جھکی ہوئی تھی ۔ سامنے دانت غائب اور بال سارے کھچڑی ہو رہے تھے ۔ اُنہیں دیکھ کر میرے دل میں چاتنا کیلئے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا ۔ مگر میں کر ہی کیا سکتا تھا ۔

وہ تو محض اتفاق کی وجہ سے اگلے دن مجھ سے منشی جی کی ملاقات ہوگئی ۔ ورنہ میں چاتنا کی بد قسمتی پر چار ایک ٹھنڈی آہیں بھر کر خاموش ہو رہتا ۔ اللہ اللہ خیر سلا ۔

اُس روز میں حویلی سے نکل کر تکئے والے باغ میں جا بیٹھا تاکہ پڑھنے میں توجہ نہ بٹے ۔ وہ گاؤں کا کنواں تو میرے لئے مصیبت بنا ہوا تھا ۔ خواہ مخواہ توجہ بٹی رہتی تھی ۔ تو صاحب میں کتابیں بغل میں دبائے باغ میں جا پہنچا ۔ ابھی آدھ گھنٹہ بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ منشی صاحب باغ کے کنوئیں پر پانی پینے آ پہنچے ۔ ساتھ اُن کی بیوی بھی تھی ۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو جھجکے پھر سلام علیکم کہہ کر پاس آبیٹھے ۔ اور باتوں ہی باتوں میں پٹواری کے متعلق مجھ سے پوچھنے لگے ۔

پٹواری کا نام سن کر میں ٹھٹھکا اور میں نے اُن کی باتوں میں دل چسپی لینی شروع کر دی ۔

ہر چند انہوں نے اِدھر اُدھر کے سوال کئے ۔ لیکن میں فریب میں کب آنے والا تھا ۔ میں نے صاف کہہ دیا ۔ "منشی جی پہلے یہ بتاؤ کہ بات کیا ہے ۔ تاکہ میں تمہیں اچھا مشورہ دے سکوں ۔ یوں بات چھپا کر رکھنا تو مسلمانوں کا کام نہیں ۔"

اس پر اس کی بیوی کا اسلام جوش میں آگیا ۔ بولی ۔ "لو بیٹا تم بالکل اپنے ہی ہو ۔ تم سے کیا پردہ ہے ۔ اصل میں اس گاؤں کے حجام نے ہمیں اتا پتا دیا

ہے ۔ اللہ رکھے میرا جوان بیٹا ہے ۔ اس کے رشتے کے لئے ۔ پٹواری کے گھر میں ۔ اور اب ہم دونوں پٹواری اور اس کی لڑکی کا اتا پتہ لینے کے لئے آئے ہیں ۔"

"اوہ تو یہ بات ہے ۔" میں نے کہا اور خود گہری سوچ میں پڑ گیا ۔ کوئی ایسی بات کروں کہ یہ رشتہ ٹوٹ جائے ۔ تا کہ نہ پٹواری کی لڑکی کا بیاہ ہو اور نہ ہی پٹواری کی باری آئے ۔

میں نے کہا ۔ "منشی جی ! اب تم ہوئے میرے والد کی بجائے ۔ تم سے کیا چھپانا ۔ لڑکی تو اچھی نہیں ۔"

"اچھی نہیں ۔" بڑھیا بولی ۔ "آخر کیا برائی ہے اِس میں ؟"

"شکل و صورت بس اللہ کا فضل ہے ۔"

"لو اس میں کیا ہے ۔" وہ بولی ۔ "شکل و صورت میں کیا رکھا ہے ۔ ایسی ہی ہوتی ہیں گھر کی لڑکیاں ۔ اب ہم کیا میم بیاہنے آئے ہیں ۔"

یہ دیکھ کر میں نے فوراً پینترہ بدلا ۔ "شکل تو خیر ٹھیک ہے ۔ لیکن ویسے بھی لڑکی اچھی نہیں ۔ ۔ ۔ ہاں ۔"

"ویسے کیا ۔" منشی جی نے پوچھا ۔

"میرا مطلب ہے ۔ تیز لڑکی ہے ۔ تیز ۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے ۔" بڑھیا بولی ۔ "آج کل کے لڑکے تو تیز لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں ۔ ہمارا بخشو بھی تو نئے کھیال کا ہے ۔ اب تم سے کیا پردہ ہے ۔ اپنا بخشو شکل کا سیدھا سادہ ہے ۔"

"لڑکوں کی شکل بھی دیکھی ہے کبھی کسی نے ۔" منشی جی بولے ۔

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں ۔" بڑھیا نے کہا ۔ "لڑکے کی آنکھ میں پھولا ہے اور ۔ اور اگلے دانت ذرا بڑے ہیں ۔ پر پڑھنے میں بڑا تیج ہے ۔"

بڑھیا کی یہ بات سن کر میں نے سمجھ لیا کہ وہ دونوں پٹواری کی لڑکی کو بیاہنے پر تلے ہوئے ہیں ۔ اس لئے میں نے ایک بار پھر پینترا بدلا ۔ میں نے کہا ۔ "سبحان اللہ تم دونوں بہت ہی شریف دکھتے ہو ۔ سچی بات یہ ہے کہ میں تمہاری آزمائش کر رہا تھا ۔ لیکن معلوم ہوتا ہے تم اپنی بات کے پکے ہو ۔"

"اللہ تمہارا بھلا کرے ۔" وہ بولی ۔

"لڑکی تو بڑی خوبصورت ہے ۔" میں نے کہا ۔ "اور ویسے بھی بڑی اچھی ہے ۔ لیکن پٹواری چاہتا ہے کہ اس کا داماد شکل کا اچھا ہو ۔ آج پٹواری کے ہاں ظفر وال کا زمیندار آنے والا ہے ۔ اپنے لڑکے کا پیغام لے کر آرہا ہے وہ ۔"

"ہائیں پھر کیا ہوگا ؟"

"میں بتاتا ہوں ۔" منشی بولا ۔ "ہم اس سے پہلے مل کر بات پکی کر لیتے ہیں ۔"

"ہاں" میں نے کہا ۔ " ابھی ابھی مِل لو" ۔ ۔ ۔ لیکن لڑکے کو دیکھے بنا پٹواری کِس طرح مانے گا ؟"

"لو ۔ لڑکے کو دکھا دیا تو کہیں بات ٹوٹ ہی نہ جائے ۔" منشی نے کہا ۔

"کوئی اور لڑکا لے آؤ دکھانے کو ۔ اس میں کیا ہرج ہے ۔ بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا ۔"

"ہائیں ۔" بڑھیا کلیجہ تھام کر رہ گئی ۔

"لیکن کونسا مانگے کا لڑکا لائیں ہم ۔" منشی نے کہا ۔ "سکول کھلا ہوتا تو کوئی لڑکا لے آتا میں مگر سکول میں تو چھٹیاں ہیں ۔"

"میں کہتی ہوں ۔ بیٹا تم ہی چلے چلو ہمارے ساتھ ۔" بڑھیا نے مجھ سے کہا ۔

"میں تو پہلے ہی اس دعوت کا منتظر تھا ۔ دو ایک مرتبہ ہچکچاہٹ دکھانے کے بعد ان کے ساتھ جانے کو تیار ہوگیا ۔ انہیں وہیں بٹھا کر میں گھر بھاگا بھاگا گیا ۔ اگرچہ پٹواری نے مجھے کبھی نہ دیکھا تھا ۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر میں نے کپڑے بدل لئے ۔ منہ ڈھانپنے کو رومال لیا اور واپس لوٹ آیا ۔

پٹواری کے گھر پہنچنے سے پہلے میں نے اُنہیں اس بات پر پکا کر لیا کہ جو کچھ کہوں میری ہاں میں ہاں ملاتے رہیں ۔ بڑھیا تو قدم قدم پر مجھے دعائیں دیتی تھی ۔ لیکن سکول کا منشی اکثر تیور بدلنے کی کوشش کرتا اور اسے رام کرنے کے لئے میں اس کی تعریف میں کچھ کہہ دیتا اور وہ خاموش ہو کر مسکرانے

لگتا ۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب یقین کیجئے ۔ ان کے ساتھ ان کا لڑکا بن کر جانے سے میرا کوئی ذاتی مطلب نہ تھا ۔ میں تو صرف چاتنا پر ترس کھا کر اس کی مدد کرنا چاہتا تھا ۔ میں نے سوچا کوئی ایسی تدبیر کروں کہ وہ اس بڈھے کھوسٹ کے چنگل سے بچ جائے ۔ یا کم از کم اتنا ہو کہ وہ منحوس شادی کچھ دیر کے لئے ٹل جائے ۔ میں چاہتا تھا کہ وہاں جا کر ایسا جھگڑا ڈالوں کہ معاملہ فسق ہو جائے ۔ پر مجھے کیا معلوم تھا کہ وہاں معاملہ اور بھی بگڑ جائے گا ۔ اور میں خود دھر لیا جاؤں گا ۔"

مجھے کیا معلوم تھا کہ اُسی وقت پٹواری نے کسی بہانے چاتنا اور اس کی ماں کو اپنے گھر بلایا ہوا ہے ۔ تا کہ لڑکی کو کپڑا لتا اور زیور دکھا کر شادی پر اکسائے اور اسی لئے اُس نے اپنی بیٹی فاطاں کو قریب کے گاؤں میں کسی رشتے دار سے ملنے کے بہانے بھیج رکھا ہے ۔

ہمیں دیکھ کر پہلے تو وہ گھبرا گئے ۔ چاتناں کی ماں پٹواری کو دوسری کوٹھڑی میں لے گئی ۔ اور دیر تک وہ باتیں کرتے رہے ۔ پھر وہ ہماری خاطر مدارات میں لگ گئے ۔ دودھ کے گلاس ، اتنے بڑے بڑے گلاس ، مکھن اور لڈو ۔ ہمیں دیکھتے ہی انہوں نے ہمارے آنے کا مقصد بھانپ لیا تھا ۔ ہمارا آنا ان کے نزدیک بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹنے کی مصداق تھا ۔ وہ تو چاہتے تھے کہ ایک بار کوئی آکر بیاہ کی بات کرے ۔ پوچھ گچھ یا تحقیقات کا سوال تو پیدا ہی نہ ہوتا تھا ۔ وہ بڈھا پٹواری تو اپنے بیاہ کی فکر میں تھا کہ کب بیٹی کے بیاہ کی مصیبت سر سے ٹلے اور وہ چاتناں سی نوجوان لڑکی کو قابو میں کرے ۔ بیٹی کی شادی کے متعلق سوچ بچار کرنے کی اُسے فرصت کہاں تھی ۔ لیکن منشی جی کی بیوی تو لڑکی کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہو رہی تھی ۔ باتوں ہی باتوں میں بولی ۔ "اللہ رکھے لڑکی کہاں ہے ۔ میں تو اسے ہی دیکھنے آئی تھی ۔ سنا ہے اس جیسی لڑکی تو سارے گاؤں میں نہیں ہے ۔ عقل اور شکل دونوں میں بڑھ چڑھ کر ہے ۔ ہاں بہن ۔ بڑی تعریفیں سنی ہیں ہم نے !"

اس بات پر تمام گھر کا نقشہ پھر سے بدل گیا ۔ چاتناں کی ماں جسے منشی جی ، اس کی بیوی اور میں سب فاطاں کی خالہ سمجھتے تھے ۔ لڑکی کو بلانے باہر چلی

گئی ۔ پھر جلد ہی اُس نے باہر سے پٹواری کو آواز دی ۔ پھر وہ دیر تک آپس میں کانا پھوسی کرتے رہے ۔ اس پر ہم سب حیران تھے ۔ حیران ہونے کے علاوہ میں پریشان بھی تھا ۔ مصیبت یہ تھی کہ مجھے پیشاب کی حاجت ہو رہی تھی ۔ پہلے تو میں ضبط کئے بیٹھا رہا ۔ پھر مجھ سے نہ رہا گیا ۔ بڑی مصیبت سے میں نے منشی جی کو منایا ۔ اور میں ڈیوڑھی میں جا کر پیشاب کرنے لگا ۔ فارغ ہوا تو میں حیران رہ گیا ۔ ساتھ والی کوٹھڑی کے دروازے میں چانتاں کھڑی میری طرف حیرانی سے دیکھ رہی تھی ۔ وہ مجھے پہچان چکی تھی ۔ جبھی تو بھاگ کر میرے پاس آگئی اور بولی ۔ ”تم ۔ تم یہاں کہاں ؟“

”ہم“ میں نے تن کر کہا ۔ ”ہم دولہا میاں ہیں ۔“

”ہائیں“ وہ چلائی ۔ ”تم ۔ تم فاطاں کو بیاہنے آئے ہو ۔“ ایک ساعت کے لئے اُس کے چہرے پر نفرت کی لہر دوڑ گئی اور پھر اُس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں ۔

”اونہوں“ میں نے اُسے بگڑتے دیکھ کر کہا ”میں تو تماشہ دیکھنے آیا ہوں ۔“

اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جھلکی ۔ ”اور وہ تو مجھے کہہ رہے ہیں کہ فاطاں کی جگہ دُلہن بن کر بیٹھ جاؤں ۔ صرف دکھانے کے لئے ۔ ۔ ۔ مگر میں نہ مانتی تھی اور ۔ ۔ ۔

ابھی وہ یہ کہنے ہی پائی تھی کہ اس کی ماں نے اُسے آواز دی اور میں وہاں سے دوڑ کر چلا آیا ۔ کچھ دیر کے بعد وہ عورت لپٹی لپٹائی لڑکی کو سہارا دیئے اندر داخل ہوئی ۔ اور کوٹھڑی کے پرلے کونے میں پلنگ پر اُسے بٹھا دیا۔ منشی جی کی بیوی بسم اللہ بسم اللہ کرتی ہوئی لڑکی کی طرف بڑھی ۔ اور اُس کا گھونگھٹ اٹھاتے ہوئے بولی ۔

”سبحان اللہ ۔ سبحان اللہ ۔ دھن بھاگ ہیں ہمارے“ پھر دونوں عورتیں رسمی باتوں میں کھو گئیں ۔ وہ منشی کی بیوی کو لڑکی کے کپڑے اور زیور دکھانے لگی ۔ اُنہیں مشغول دیکھ کر لڑکی نے میری طرف سے گھونگھٹ سرکایا اور مجھ سے آنکھیں ملا کر ہنس پڑی ۔

ارے میں تو اچھل پڑا ۔ وہ تو چانتاں تھی ۔ اتنی خوبصورت لگ رہی تھی ۔ بیحد خوبصورت ۔ عین اُس وقت پٹواری صاحب ایک مُلا کو ساتھ لئے اندر داخل ہوئے ۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ وہ مُلا کوئی قریبی رشتہ دار ہے ۔ لیکن جب اُس نے حلق سے "ق" کی آواز نکالنا شروع کیا تو میرا ماتھا ٹھنکا ۔

آتے ہی مُلا صاحب نے دو ایک گرما گرم مسئلے سنائے اور پھر بولے ۔ "دیکھئے صاحبان بڑی خوشی کی بات ہے کہ دونوں فریقوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا ہے ۔ اب میری رائے یہ ہے کہ اس کارخیر کو اسی وقت سرانجام دیا جائے ۔

اس پر منشی جی بد کے بولے "حضرت یہ بیاہ شادی کا معاملہ ہے ۔ گڑیوں کا کھیل نہیں"

مُلا جی کہنے لگے ۔ "یہ تو ٹھیک ہے ۔ شادی جب جی چاہے کرنا ۔ لیکن نکاح کی رسم ابھی ادا ہو جائے تو اس میں تم سب کو رسول اللہ کی خوشنودی حاصل ہوگی ۔"

"سبحان اللہ ۔" پٹواری بولا ۔

"لڑکی کو جب جی چاہے وداع کرنا ۔ کیوں جی اب یہ پاکستان ہے اللہ کے فضل سے اب تو وہی ہونا چاہیئے جو رسول اللہ کی سنت ہے ۔"

یہ کہتے ہی اُنہوں نے کسی کا مشورہ لئے بغیر کلمے پڑھنے شروع کر دیئے ۔

منشی جی تو حیرانی سے بیوی کا منہ دیکھ رہے تھے اور وہ بے چاری ناک پر انگلی رکھے خاموش بیٹھی تھی ۔ میں بھی خاموش تھا ۔ دفعتاً مُلا جی بولے ۔ "وہ زمانہ پرانا تھا ۔ جب دولہا اور دلہن کو کلمے پڑھایا کرتے تھے ۔ ہم نے تو نکاح کرنا ہے ۔ لڑکی اور لڑکے کو مسلمان نہیں کرنا ۔ کیوں جی" وہ مسکرائے ۔ "اصلی بات تو ایجاب وقبول ہے ۔ یہ کلمے میں نے صرف اس لئے پڑھے ہیں کہ پاک کلام کو پڑھنا باعثِ برکت ہوتا ہے ۔ کیوں جی چودھری جی ۔" وہ منشی صاحب سے مخاطب ہوئے ۔ "لڑکے کا کیا نام ہے ؟"

"خدا بخش" منشی نے جواب دیا ۔

"ہائیں" میں حیران رہ گیا ۔ "خدا بخش ۔"

"سبحان اللہ" مُلا نے کہا ۔
"ویسے ہم سب بخشو کہہ کر بلاتے ہیں ۔"
"وہ تو پیار کا نام ہوا نا ۔"
اس وقت مجھے یاد آیا کہ پہلے بھی تو وہ اپنے بیٹے کو بخشو کہہ کر پکار رہے تھے ۔ اس پر میں نے جانا کہ واقعی اُن کا بیٹا میرا ہم نام تھا ۔
"اور لڑکی کا کیا نام ہے ؟" مُلا نے پٹواری سے پوچھا ۔ اور پیشتر اس کے کہ وہ جواب دیتا چانتاں آپ بول پڑی ۔ "چانتاں ۔"
"نہیں نہیں جی ۔" پٹواری چلّایا ۔ "لڑکی کو تو ہم سب فاطاں کہہ کر بلاتے ہیں ۔"
"ہاں ہاں ۔ پیار سے چاہے کچھ بلاؤ ۔ مجھے کیا معلوم نہیں ۔ میں تو خود اُسے فاطاں ڈائن کہا کرتا ہوں ۔ مگر نکاح میں اصلی نام ہونا چاہئے ۔" پیشتر اس کے کہ وہ اُسے روکتے ۔ اس نے مجھ سے تین مرتبہ قبول کرا لیا تھا ۔ پٹواری نے پہلے تو اس کے خلاف آواز اٹھانے کی کوشش کی ۔ پھر وہ خاموش ہوگیا ۔ آخر ملّا سب کچھ زبانی ہی کر رہا تھا نا ۔ گاؤں میں تحریری نکاح کہاں ہوتے ہیں ۔
نکاح ہو جانے پر مجھے صرف اِس لئے خوشی محسوس ہوئی کہ چانتاں کی جان اُس بڈھے سے تو چھوٹی ، چاہے منشی کا لڑکا بدصورت تھا ۔ لیکن تھا تو جوان ۔ مجھے یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ درحقیقت میرا اپنا نکاح ہو رہا ہے ۔ اور چانتاں میری ہوگئی ہے ۔ مجھے کیسے معلوم ہو سکتی تھی یہ بات ۔ اور اگر چانتاں شرارت نہ کرتی تو معاملہ بالکل ٹھیک رہتا ۔ وہ تو اس بڈھے پٹواری کی حماقت سمجھئے کہ وہ غلطی سے چانتا کو مخاطب کر کے بولا ۔ "بیٹی اب تو اندر جا اپنی خالہ کے ساتھ ۔"
اس پر وہ شیرنی کی طرح بپھر گئی ۔ سر کا دوپٹہ ادھر پھینک دیا اور سب کے سامنے کھڑی ہو کر بولی ۔ "سُن لو لوگو اس نے مجھے بیٹی کہا ہے ۔ آج سے میں اس کی بیٹی ہوں اور یہ میرا باپ ۔"
اس کی اس بے حجابی پر سب حیران ہوگئے ۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھی بات ۔

"اب میں اس کی بیوی ہوں ۔" اُس نے میری طرف اشارہ کیا ۔ "پٹواری نے اپنے ہاتھوں سے مجھے اس کو سونپا ہے ۔" اور دیکھو مُلاجی" وہ چلائی ۔ آپ نے میرا نکاح پڑھا ہے ۔"

"ہاں ۔ ہاں ۔" مُلا گھبرا گیا ۔

"تو میں اپنے خاوند کے ساتھ جاؤں گی ۔ ابھی ۔"

"ہائیں ۔" وہ سب حیران رہ گئے ۔

"اُٹھو ۔" اُس نے مجھ سے کہا ۔ "اب میری عزت تمہاری عزت ہے ۔ تمہارا فرض ہے کہ مجھے اس بڈھے پٹواری سے بچاؤ جو مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے ۔"

حیرانی سے منشی جی کے منہ سے چیخ نکل گئی ۔ "اپنی بیٹی سے ۔"

"مجھے لے چلو ۔ خدا کے لئے ۔" اُس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے ۔

اگر اس وقت وہ بڈھا جلال میں نہ آجاتا تو بھی شاید حالات ٹھیک ہو جاتے ۔

"خبردار" پٹواری چلّایا ۔ "چل اندر ۔ اصل میں اسے پاگل پنے کا دورہ پڑتا ہے جی ۔" یہ کہہ کر پٹواری اور چاتاں کی ماں نے اُسے پکڑ لیا ۔ جانے اُس وقت مجھے کیا ہوا ۔ ایک طوفان سا کہیں سے اُٹھا اور میرے بدن کا بند بند غصے سے کانپنے لگا ۔

"خبردار جو میری بیوی کو ہاتھ لگایا" میں نے کہا ۔ اور کونے میں پڑا لٹھ اُٹھا لیا ۔

یہ دیکھ کر پٹواری بھاگ گیا اور منشی اور اس کی بیوی چلّانے لگے ۔ "ہم سے دھوکا ہوا ۔ ہم سے دھوکا ہوا ۔"

میں تو شاید چاتاں کو ہی لیکر گھر سے نکل آتا ۔ لیکن آخر وہ عورت تھی ۔ بولی ۔ "یہ زیور اور کپڑے ۔" میں نے بڑھ کر صندوق اٹھایا اور ہم دونوں باہر نکل آئے ۔

اگر گاؤں والوں کو پٹواری سے ہمدردی ہوتی تو اس روز میری جگہ وہاں سے

میری لاش نکلتی ۔ لیکن وہ تو پہلے ہی اس بات پر جلے ہوئے تھے کہ پچاس سال کا بڈھا ہو کر وہ سولہ سال کی لڑکی پر ڈورے ڈال رہا تھا ۔ انہوں نے جب قصہ سُنا تو ہنستے ہنستے لوٹ ہوگئے اور میری پیٹھ ٹھونکنے لگے ۔ لیکن سب نے مجھ سے یہی کہا ۔ گاؤں سے چلے جاؤ ۔ ورنہ اگر پٹواری حوالدار کو لے آیا تو مشکل پڑ جائیگی ۔ اُنہوں نے زبردستی ہم دونوں کو موٹر لاری میں ٹھونس دیا اور ، اور...

دفعتاً وہ رُک گیا اور اُس نے محسوس کیا کہ وہ اپنے عجیب و غریب بیاہ کا تمام قصہ سنا چکا ہے ۔ اب اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس قصے کو کیسے ختم کرے ۔

"اور پھر" ۔ ۔ ؟ سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا ۔

"جی پھر میری آنکھ کھل گئی ۔" خدا بخش نے مسکرا کر جواب دیا ۔

عین اُس وقت گڑ ۔ گڑام کی آواز آئی ۔ سب کی نگاہیں دیوار کی طرف اُٹھ گئیں ۔

میز نیچے گری ہوئی تھی ۔ اور وہ رنگین گٹھڑی نیند سے چونکی ہوئی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی ۔

○

گھور اندھیرا

امر سنگھ نے آنکھیں کھول دیں ۔ چاروں طرف گاڑھا اندھیرا چھا رہا تھا ۔ اندھیرے کے تہ در تہ انباروں تلے اسے سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا ۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ وہ اپنے جسم کو اٹھا نہیں سکتا جیسے اسے اپنے جسم پر قدرت نہ رہی ہو ۔ اس نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں ۔

نہ دیکھنے کے باوجود وہ محسوس کرنے لگا کہ بوجھل اندھیرے کے بادل اس کے ارد گرد جمع ہو رہے تھے ۔ اندھیرے کے بڑے بڑے بھیانک ٹکڑے چمگادڑوں کی طرح پر پھڑپھڑاتے ہوئے نیچے اتر رہے تھے ۔ اور گدھوں کی طرح اس کے ارد گرد اکٹھے ہوتے جا رہے تھے ۔ گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں ۔

تاریک اندھیرے کا ایک کلہاڑا سا اُس کی طرف بڑھا ۔ پیٹ کے دائیں پہلو میں ایک ٹھیس لگی ۔ درد سے وہ بلبلایا اور گھبرا کر اٹھ بیٹھا ۔

بائیں وہ حیران رہ گیا ۔ بوجھ کے اس بے نام سے احساس کے باوجود وہ یوں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا ۔ جیسے اسے سپرنگ لگے ہوں ۔ اس نے اپنے جسم کا جائزہ لیا ۔ اس پھیلے ہوئے اندھیرے میں وہ خود بھی سیاہ بادل کے ٹکڑے کی طرح پھیلا ہوا تھا ۔ سیال متحرک ٹکڑا ۔ یہ بات اس کے لئے حیران کن تھی ۔ اس کا نچلا دھڑ یوں لہرا رہا تھا جیسے الگنی پر لٹکا ہوا کپڑا ہوا میں پھڑپھڑاتا ہے ۔ امر سنگھ نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا ۔ اندھیرا دھندلا ہوا جا رہا تھا ۔ اس دھندلکے میں سیاہ فرش کی ایک لکیر دور تک جا رہی تھی جس پر یہاں وہاں سیاہ ستون سے کھڑے تھے ۔ جن کے سرے پر زرد سے گولے ٹنگے ہوئے تھے ۔ جن سے زرد زرد سا دھوآں نکل رہا تھا ۔ ستونوں کے پیچھے دھندلے دھندلے پردے لٹک رہے تھے ۔ جن پر مکانات کے مبہم نقوش دکھائی دے رہے تھے ۔

اُسے محسوس ہوا کہ وہ جگہ مانوس تھی ۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ

کونسی جگہ ہے ۔ اور وہ اس جگہ کیوں پڑا ہے ۔ دفعتاً اس کی توجہ اپنی طرف مبذول ہو گئی لیکن میں ؟ میں کون ہوں ؟ وہ سوچنے لگا ۔ اسے خیال نہیں پڑتا تھا کہ وہ کون ہے ۔ عجیب بات تھی کہ اسے اپنی ذات کے متعلق واضح طور پر کچھ معلوم نہ تھا ۔

پاوم ۔ پاوم ۔ دور موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دی ۔

پاوم ۔ وہ پھر اٹھ بیٹھا ۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ آواز مانوس سی تھی ۔ دفعتاً اس کے ذہن میں حرکت ہوئی ۔ ریڈیو ۔ ہاں ۔ ہاں وہ خوشی سے چلّایا ۔ وہ ریڈیو کا سیٹ ٹھیک کر رہا تھا اور اس روز جلد ہی گھر سے آگیا تھا ۔ ٹفن کیریر میں اُس کا کھانا تھا ۔ ہائیں وہ دایاں ہاتھ دیکھ کر بولا ۔ روٹی کا ڈبہ کہاں گیا ، وہ لپک کر اٹھ بیٹھا ۔ اور آپ ہی آپ بغیر کوشش کئے یوں تیرنے لگا ۔ جیسے اندھیرے کے سمندر میں وہ ایک ناؤ ہو ۔

دور تک ٹفن کیریر کا نشان نہ تھا ۔

گھوں ۔ گھوں ۔۔۔۔ دور سے کوئی چیز چیختی ہوئی آرہی تھی ۔ سیاہ ڈراؤنی چیز ۔ "اُوہ ملٹری کی لاری" ۔ اور سمجھے بغیر وہ ڈر کر درخت کے پیچھے چھپ گیا ۔

موٹر میں بندوقیں تانے ہوئے سپاہی دیکھ کر اسے یاد آیا کہ وہ فسادات کے دن تھے اور اسے محتاط رہنا چاہئے ۔ اس احساس پر چاروں طرف سے سیاہ سائے اس کی طرف لپکنے لگے ۔ اس نے بایاں پہلو ٹٹولا ۔ کرپان ؟ اس کی کرپان کہاں تھی ۔ روٹی کا ڈبہ اور کرپان ۔ اب وہ کرپان کو دیکھنے کے لئے آگے بڑھا ۔

دفعتاً وہ رکا ۔ سامنے سرخ توپ زمین میں گڑی تھی ۔ اس کی پیشانی پر پسینہ آگیا ۔ "اوہ یہ تو پٹرول پمپ ہے"۔ وہ اس کی طرف غور سے دیکھ کر گنگنایا ۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا ۔ کچھ بھی یاد نہ پڑتا تھا ۔ چیزیں نئی نئی دکھ رہی تھیں ۔ اور وہ محسوس کر رہا تھا جیسے اسے ان چیزوں سے دور کا تعلق نہ ہو ۔

اس پٹرول پمپ سے تو میں روز گزرا کرتا تھا ۔ روز ۔ کھانے کا ڈبہ اور کرپان اٹھائے ۔ لیکن پھر کیا ہوا ؟ کیا ہوا تھا ۔۔۔ ؟ ہاں وہ سب دکانیں بند کر رہے تھے ۔ بھاگ رہے تھے اور چھاپے خانے کا وہ مزدور کھڑا تھا ۔ کھڑا گھور

رہا تھا ۔ میرا جی چاہتا تھا ۔ میں مزدور سے پوچھوں ۔ اس کی طبیعت کیسی ہے ! لیکن اس کے ماتھے پر تیوری کیوں تھی ؟ دفعتاً وہ سب مجھے گھورنے لگے ۔ اور پھر ایک سیاہ ڈراؤنی شکل لپکی اور ۔۔۔ میرے پہلو میں بجلی سی چمکی ۔ معاً اس نے پہلو میں دردناک ٹیس محسوس کی ۔

"پھر کیا ہوا" ۔ اس نے بصد مشکل سوچنے کی کوشش کی ۔ دھندلکا دھندلکا ۔ اندھیرا وہ سب دور بھاگ رہے تھے ۔ جیسے میں بھوت بن گیا تھا ۔ بھوت ۔ اور میں انہیں پاس بلانا چاہتا تھا ۔ مجھے اکیلے میں ڈر لگ رہا تھا ۔ اور چاروں طرف سے بوجھل اندھیرا میرے گرد جمع ہوا جارہا تھا ۔

وہ چھاپے خانے کا مزدور مجھ سے دور کیوں بھاگ رہا تھا ۔ حالانکہ اس روز جب چھاپے خانے پر بم پڑا تھا تو میں نے مزدوروں سے کس طرح ہمدردی محسوس کی تھی ۔ میرا جی چاہتا تھا کہ جا کر ان سے خیریت پوچھوں ۔ پھر پھر میں ڈر کیوں گیا تھا ، کیوں ؟ شاید وہ بھی مجھ سے ڈر گیا ہو ۔ میری کرپان سے ڈر گیا ہو ۔ لیکن وہ تو میرے مزدور بھائی تھے ۔ پھر ڈر کیسا ۔ کیوں ۔ اور کرپان وہ تو میں نے اپنے بچاؤ کے لئے پکڑ رکھی تھی ۔ کرتار سنگھ کی بات میرے جی لگی تھی ۔ جب میں نے پوچھا کرتار تم کرپان کیوں نہیں رکھتے تو وہ بولا تھا مجھے شرم آتی ہے ۔ نہتے لوگوں میں کرپان لئے پھرتے شرم آتی ہے ۔ ایسے محسوس ہوتا جیسے ڈر مجھ پر حاوی ہو ۔ اس کے بعد مجھے شرم آنے لگی تھی ۔ لیکن میں کرپان اٹھا لیا کرتا تھا ۔ محض عادت کے طور پر ۔

نہیں نہیں وہ میری کرپان سے نہیں ڈرا تھا ۔ پھر اس نے وہ بجلی سی کیوں گرائی تھی ۔ اور وہ ٹیس ۔ اور پھر سارے جسم میں بند بند میں درد ہو رہا تھا ۔

ایک بار پھر امر سنگھ نے پہلو میں ٹیس محسوس کی اور درد کی شدت سے وہ ایک تاریک ستون تلے گر کر ڈھیر ہوگیا ۔ چاروں طرف سے بوجھل اندھیرے کے انبار تہ در تہ اس کے ارد گرد اکٹھے ہونے شروع ہو گئے ۔ بڑی بڑی چمگادڑیں پر پھڑپھڑاتی ہوئی اترنے لگیں ۔ گدھ ۔۔۔

اس کا جسم منوں بوجھل ہوگیا اور اس نے محسوس کیا کہ اسے اپنے جسم پر

قدرت نہیں رہی ۔

نہ جانے کب تک وہ یونہی پڑا رہا ۔

گھنگھرو کی آواز سن کر وہ چونکا ۔ سامنے سے ایک تانگا آرہا تھا ۔ تانگہ ؟ اس وقت ؟ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا ۔ اور پھر نہ جانے کس خیال پر اس نے جست بھری اور پھسل کر تانگے کی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا ۔

"نہیں نہیں" کوچوان نے لپکتا ہوا سایہ دیکھ کر چلانا شروع کر دیا ۔ "نہیں نہیں میں مسلمان نہیں ہوں میں تو کوچوان ہوں ۔ کوچوان ۔"

"کوچوان؟" امر سنگھ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا ۔ "پھر" ؟

"پھر" کوچوان بولا ۔ "پھر کیا ۔ میں تو کہہ رہا ہوں ۔ میں میں تو کچھ بھی نہیں ۔ کچھ بھی نہیں ۔"

"کچھ بھی نہیں ۔ اوہ" امر سنگھ کھو سا گیا ۔ "اور میں ۔میں ۔۔"

"تم ۔ تم" ۔ اُس نے اُس کے کیسوں کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر دفعتاً گھبرا کر چلانے لگا "نہیں نہیں میں کرشن نگر نہیں جاؤں گا ۔ اس دن بھی میں وہاں جانے کے لئے تیار نہ تھا" کوچوان نے یوں بیان کرنا شروع کیا جیسے وہ دبی دبی ہچکیاں لے رہا ہو" تیار نہیں تھا ۔ حالانکہ وہ دس دس روپے دینے کو تیار تھے ۔ لیکن روپے کا کیا ہے جی ۔ چلتی پھرتی چھاؤں ۔ میں وہاں کبھی نہ جاتا ۔ مگر وہ بڑھیا اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مجھے ماں یاد آگئی ۔ ماں" امر سنگھ کے ہاتھ پر نہ جانے کہاں سے پانی کے قطرے گرے "انہوں نے اسے امر تسر میں ۔"

"پھر" امر سنگھ نے اپنے گیلے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے کہا ۔

"پھر ؟" کوچوان چونکا "پھر کچھ بھی نہیں ۔ کچھ بھی نہیں ۔ یہ بڑی بڑی دکانیں ۔ اونچے محل ، کچھ بھی نہیں ۔"

"لیکن ماں" امر سنگھ گنگنایا ۔

"ماں ۔ وہ بڑھیا ۔ آنسوؤں والی بڑھیا ۔ میں نے کہا میں لئے چلتا ہوں تمہیں ماں ۔ اور وہ مجھے دعائیں دینے لگی جس طرح میری ماں دعائیں دیا کرتی تھی"

"پھر" امر سنگھ نے آہ بھری ۔

"پھر پھر وہ بہت سے تھے ۔ بہت سے ۔ انہوں نے مجھے گھیر لیا ۔ وہ بڑھیا انہیں کوس رہی تھی ۔ پھر وہ ان کی منتیں کرنے لگی ، اور آخر رونے لگی ۔ لیکن ان پر اثر نہ ہوا ۔ ان پر اثر کیوں نہ ہوا ؟ لیکن مجھ پر اس کے آنسوؤں کا اثر کیوں ہوا تھا ؟ کیوں ؟ کیا وہ ان کی ماں نہ تھی ۔ بولو ۔ تم کرشن نگر کے ہو ۔ بولو"

"میں" امر سنگھ چونکا "میں" اس کے گلے میں گویا آنسو ٹپک رہے تھے ۔

"انہوں نے گھسیٹ کر بڑھیا کو اتار لیا اور وہ میرے ارد گرد جمع ہو گئے" کوچوان نے آہ بھری اور گھوڑا رک گیا ۔ اس نے مظلوم نگاہوں سے کوچوان کی طرف دیکھا اور پھر ایک لمبی چیخ ماری "مجھے مار دیتے تو کوئی حرج نہ تھا" کوچوان بڑبڑایا "لیکن موتی بے زبان موتی پر ہاتھ اٹھانا"۔ اُس نے گھوڑے کی طرف پُرنم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا ۔ "موتی تو مسلمان نہ تھا ۔"

موتی نے ایک اور چیخ ماری ۔ ڈراؤنی لمبی چیخ ۔ اور پھر بدک کر چل پڑا ۔

"وہ سب" کوچوان اپنی ہی دھن میں بولتا گیا ۔ "وہ سب جیو ہتیہ کے نام پر کانوں پر ہاتھ رکھا کرتے تھے ۔ میں جانتا ہوں ۔ عمر بھر کرشن نگر کے اڈے پر رہا ہوں ۔ پھر انہوں نے موتی پر بھالے کرپان ۔۔ دفعتاً وہ چپ ہو گیا۔

چاروں طرف فضا سے سسکیوں کی آوازیں آنے لگیں ۔ موتی کراہتا ہوا دوڑ رہا تھا ۔ امر سنگھ آہیں بھر رہا تھا ۔ اور کوچوان دور افق کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ جیسے افق میں کھو گیا ہو ۔ دفعتاً اس نے اپنے ہی آپ گنگنانا شروع کر دیا "پھر ۔ اندھیرا ۔ چاروں طرف سے اندھیرا گھپ اندھیرا ۔"

"ٹھہرو" سڑک پر کھڑا ہوا سپاہی چلایا ۔ "ٹھہرو"

کوچوان نے چونک کر لگام ڈھونڈنی شروع کر دی ۔ لیکن ٹانگہ رکنے سے پہلے ہی سپاہی اوپر چڑھ آیا ۔

"تم کہاں جا رہے ہو" سپاہی نے تحکمانہ انداز میں پوچھا ۔

"میں" کوچوان بولا "میں کہاں جا رہا ہوں ۔ کیوں بابو جی" اس نے امر سنگھ سے پوچھا۔

امر سنگھ کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے ۔ "میں میں یعنی ہم" ۔ وہ خاموش ہو گیا ۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا ۔"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا ۔" سپاہی آپ ہی آپ گنگنانے لگا "لیکن مجھے ضرور وہاں پہنچنا چاہئے ۔ ورنہ وہ سب بھوک سے مر جائیں گے ۔ اوہ" وہ اُٹھ کھڑا ہوا "مجھے جانا ہے مجھے انہیں بچانا ہے ۔ مگر ۔ مگر کہاں جانا ہے ۔ کہاں جانا ہے مجھے" ۔ "تھانے جانا ہو گا۔" کوچوان بولا۔

"نہیں نہیں" وہ بولا "وہاں سے تو میں آرہا ہوں۔"

"ہاں ہاں ۔" امر سنگھ خواہ مخواہ بول پڑا۔

"مجھے کہاں جانا ہے" سنتری نے امر سنگھ سے مخاطب ہو کر کہا ۔ "بولو ورنہ وہ سب بھوکے مر جائیں گے"

"کیا فرق پڑتا ہے" کوچوان نے آہ بھری "کیا فرق پڑتا ہے"

"نہیں نہیں" سنتری چلایا "بکو نہیں ۔ وہاں گیہوں نہیں ہے ۔ لوگ بھوکے مر رہے ہیں"۔

میں تھانے میں رپورٹ کرنے آرہا تھا ۔ ادھر سے نہ جاؤ وہ بولے ۔ وہ تمہیں مار دیں گے ۔ بے وقوف مجھے رپورٹ کرنی تھی ۔ ورنہ وہ سب بھوکے مر جاتے ۔"

"پھر" امر سنگھ بولا ۔

"پھر چھتوں سے پتھروں کی بارش ہونے لگی ۔ اور پھر اندھیرا ۔ گھپ اندھیرا ۔ اور وہ ہنس رہے تھے ۔ بے وقوف انہیں معلوم نہ تھا کہ مجھے ضروری طور پر جانا ہے ۔ مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے ۔ میں اُن کو سمجھوں گا ۔ مل لیں ۔ بغیر وارنٹ کے ہتھکڑی نہ لگائی تو میرا نام ۔ میرا نام ــــــ۔ لیکن میرا نام کیا ہے میرا نام ۔ بتاؤ ۔ بولو ۔ کہاں جانا ہے مجھے ۔ اور میرا نام ۔ کیا نام ہے میرا ۔ کون ہوں میں بولو ۔ نہیں بتاتے ۔ اچھا میں تمہارا چالان کروں گا ۔ یہ کہتے ہوئے وہ تانگے سے اتر گیا اور چلانے لگا "ٹھہرو ۔ ٹھہرو۔"

موتی نے ایک چیخ ماری اور بدک کر بھاگا ۔

"نہیں نہیں" کوچوان چلایا "ہم کرشن نگر نہیں جائیں گے بیٹے ۔ ہم تو شاہ عالمی جارہے ہیں شاہ عالمی"۔

"شاہ عالمی نہ جانا ۔ شاہ عالمی نہ جانا ۔ کسی نے بڑھ کر گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔

"شاہ عالمی" نوجوان پر ایک کیفیت طاری ہو گئی "اف آگ ۔ آگ"

" آگ" امر سنگھ چلایا۔

" بھگوان" نوجوان غصے سے بولا "نہیں نہیں بھگوان تو ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ۔ اب تو یہاں شیطان بستے ہیں ۔ شیطان۔بھگوان کی دنیا میں اینٹوں سے شعلے نہیں نکلتے" ۔

"ہاں" امر سنگھ گنگنایا "یہ شیطان کی دنیا ہے بھاگ چلو ۔ بھاگ چلو ۔"

نوجوان قہقہہ مار کر ہنس پڑا ۔ حتٰے کہ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے ۔ رام لال بھاگا تھا ۔ وہ بھاگ کر کھڑکی سے اترنے لگا ۔ اف گولیوں کی بوچھاڑ ۔ پٹاخ پٹاخ اور ننھا مادھو ۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ کیا ہو رہا ہے ۔ وہ سمجھتا تھا کہ آتش بازی چل رہی ہے ۔ اور پھر وہ خود انار کی طرح چلنے لگا ۔ دھڑا دھڑ ۔ بھگوان"

"پھر" کوچوان نے کہا ۔

"پھر" وہ چونکا ۔ "پھر دیواریں مل گئیں ۔ آسمان گر گیا ۔ زمین ۔ زمین ۔ اندھیرا ۔ گھپ اندھیرا ۔ ٹھہرو ۔ ٹھہرو دفعتاً وہ چلایا "دینا مجھے دینے کو بچانا ہے ۔ دینا ۔ دینا"۔ وہ چلاتا ہوا چلا گیا ۔ دور سے اُس کی آواز سنائی دے رہی تھی ۔ "دینا ۔ دینا۔"

کوچوان ہاتھ میں باگ پکڑے بالکل چپ چاپ بیٹھا تھا ۔ امر سنگھ ہونٹوں میں کچھ گنگنا رہا تھا موتی منہ اٹھائے افق کی طرف گھور رہا تھا ۔ وہ سب یوں ساکت تھے ۔ جیسے کپڑے پر تصویر کھینچی ہو ۔

"ونو! ۔۔۔" کس نے ونو کو پکارا ۔ ایک بڑھیا نہ جانے کہاں سے آگئی "کہاں ہے میرا ونو" ۔ وہ ٹانگے کے پاس آکر رک گئی ۔ اور پھر امر سنگھ سے مخاطب ہو کر بولی "تمہیں نے ونو کو مارا ہے ، تم اس کے قاتل ہو تم ۔ مارو ۔

مجھے بھی مارو ۔ وہ تن کر کھڑی ہو گئی ۔"

"نہیں نہیں" امر سنگھ گنگنانے لگا۔

"پکڑلو" وہ کوچوان کی طرف لپکی "پکڑ لو یہ قاتل ہے" ۔

کوچوان چپ چاپ بیٹھا اس کا منہ تکتا رہا ۔

"کوئی نہیں سنتا کوئی نہیں" وہ چلانے لگی "انہوں نے بھی کچھ نہیں سنا تھا ۔۔۔ ان کی لمبی لمبی داڑھیاں تھیں ۔ خاکی وردیاں ۔ انہوں نے پولیس کے بھیس میں ہمیں گھیر لیا ۔ اور وہ سب اللہ دتہ ۔ غفورا ۔ رحیم ۔ سبھی گئے ۔ کہ اُن کے پاس شکایت کریں ۔ میرے اللہ اور ۔ اور وہ سب بھون دئے گئے ۔ جیسے مکی کے دانے ہوں ۔ پھر وہ سب ہمارے پاس آگئے ۔ اور ہمیں گھیر لیا ۔"

"۔۔۔۔ اور دینا مجھے بھی مارو وہ پھر چلائی ۔ دینے کے بغیر میں جی کر کیا کروں گی مجھے بھی مارو" دفعتاً اس نے اپنا سر اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا ۔ ہائے وہ چلائی میرا سر ہائے میرا سر ۔ اُف ، وہ بیٹھ گئی "میرا سر ۔ میرا سر ۔"

موتی نے مڑ کر کوچوان کی طرف دیکھا ۔ اس کے گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے ۔ کوچوان نے آسمان کی طرف دیکھ کر لمبی آہ بھری ۔ امر سنگھ مدہم آواز میں کراہنے لگا ۔ فضا میں اس کی کراہ گونجی گردو پیش سے آہوں اور کراہوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں ۔

"دینا ۔ دینا" ۔ دور بہت دور سے آواز آئی ۔

"دینا" بڑھیا چونکی ۔ کہاں ہے میرا دینا ۔ کس نے پکارا میرے دینے کو وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی ۔

"دینا" ۔ بہت دور سے پھر آواز آئی ۔

"آئی" بڑھیا چلائی ۔ میں آرہی ہوں آرہی ہوں ۔ اور وہ دیوانہ وار اندھیرے میں کود کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ۔

دفعتاً موتی نے چیخ ماری اور اٹھ بھاگا ۔

اردگرد امڈتا ہوا ۔ بل کھاتا ہؤا بوجھل اندھیرا گویا کراہ رہا تھا ۔ ستونوں کے

اوپر ٹنگی ہوئی بتیاں دم توڑ رہی تھیں نیچے سیاہ سڑک سسکیاں بھر رہی تھی ۔
"اسے رکھ لو" بڈھا گڑگڑا رہا تھا ۔ "اسے رکھ لو بھگوان کے لئے لیکن مجھے چھوڑ دو ۔ میری جان بخش دو ۔ میں تو بوڑھا ہوں ۔ مجھے مار کر کیا لو گے ۔"
اس کی حسین پتری حیرانی سے بوڑھے باپ کی باتیں سن رہی تھی ۔
"نہیں نہیں ۔ یہ میرا بچہ نہیں" بڑھیا چلائی "نہیں بہن میں سچ کہتی ہوں یہ بچہ میرا نہیں"
"میں میں اسے کہاں تک اٹھائے پھروں ۔ میں تو اس کی دیکھ بھال کرتے ہار گئی ۔"
بچہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ ماں ! اس کے ہونٹ یوں کھلے تھے جیسے "ماں" کہنے کی کوشش کر رہا ہو ۔
"سردار جی یہ کیا کر رہے ہیں آپ ۔ نہیں نہیں میرا نام تو کوشلیا ہے ۔ یہ دیکھ لو ۔ یہ کلائی پر ہندی میں نام ۔ کوشلیا ۔"
"ہا ہا ہا ہا ہا ہا ۔۔۔" مرد ہنسا "اس سے کیا فرق پڑتا ہے" سردار جی کا منہ ہوس سے سوجا ہوا تھا ۔ اس کے جونک سے ہونٹ خون چوسنے کے لئے کوشلیا کی طرف بڑھے ۔
"یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ نہیں نہیں" کوشلیا نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی ۔
"میں سکھ نہیں" وہ ہنسا "مسلمان ہوں ۔ یہ کیس تو دھوکا ہیں ۔"
میں انہیں بتاؤں گی ۔ مجھے اپنوں نے ۔۔۔" اس کی آواز مدہم ہو گئی ۔ دب گئی جیسے کسی نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو ۔ اور ایک سیاہ فام برہنہ جسم نے اُسے اپنے چنگل میں لے لیا ۔
تانگہ رک گیا ۔
سامنے مٹیالے اندھیرے میں ایک بہت بڑا پنجرہ رکھا ہوا تھا ۔ جس میں سائے متحرک تھے پاس ہی چند قلی بیٹھے تھے ۔ دفعتاً ایک ریڑھی والا آنکلا ۔ اور بے تکلف قلیوں کی طرف بڑھا ۔ ہائیں ۔ امر سنگھ نے کلیجہ تھام لیا ۔ "وہ سب کچلے جائیں گے" لیکن ریڑھی گزر گئی ۔ اور وہ قلی جوں کے توں بیٹھے تھے ۔ امر

سنگھ حیران رہ گیا ۔ نہ جانے کیا بات تھی ۔ کتے بلا تکلف دیوار میں سے پھاند کر ادھر سے ادھر نکل آتے ۔ کوے اڑتے اڑتے موتی کے پیٹ میں سے نکل جاتے جیسے وہاں کوئی کھڑکی کھلتی ہو ۔ عجیب بات تھی ۔ وہ سوچنے لگا ۔

سوچتا سوچتا وہ قلیوں کے پاس جا کھڑا ہوا ۔

اُسے دیکھ کر بڈھا قلی چلایا "نہیں بھئی تم جانو تمہارا کام ہم سامان نہیں اُٹھائیں گے ۔

وہ بھی میری منتیں کرتی تھی ۔ منتیں اور مجھے اس پر ترس آگیا ۔ اور وہ صندوق کتنا بھاری تھا وہ صندوق ۔وہ میرے کندھے سے پھسل گیا ۔ پھر ۔۔۔۔۔۔۔ نہ جانے ہؤا کیا ۔ بادل کڑکا اور بجلی پھر " قلی کا چہرہ بھیانک ہوگیا اور پھر ہوا میں ٹکڑے سے اڑے اور جیسے سب ہوائی جہاز بن گئے ہوں ۔ سبھی ۔۔۔ چاروں طرف ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور مدہم آوازیں ۔ نہیں نہیں ۔ نہیں نہیں ۔ اور پھر ۔ پھر اندھیرا اندھیرا ۔"

کو ۔۔۔ کو کو ۔ گاڑی کے وسل کی آواز سنائی دی ۔

"میں جاؤں گا میں جاؤں گا" امرسنگھ چلایا میں یہاں نہیں رہوں گا" وہ ہوا میں تیرنے لگا اور آہنی پل کے درمیان سے گزرتا ہوا گاڑی کے پاس جا پہنچا "امرتسر امرتسر" وہ خوشی سے چلایا۔

"امرتسر" ایک بھاری اور بھیانک آواز آئی "امرتسر ۔۔۔۔۔۔"

امرسنگھ نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا ۔ گاڑی کے پائیدان کے پاس پڑا کٹا ہؤا سر دانت نکال رہا تھا ۔

امرسنگھ گھبرا گیا ۔

گاڑی سے ایک عورت نے سر نکالا ۔اس کی چھاتیاں کٹی ہوئی تھیں ۔ جس سے ایک بچہ لٹکا ہوا تھا ۔ عورت نے اپنی چھاتیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا "امرتسر ۔۔۔۔۔۔۔"

امرسنگھ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر گھبرا کر بولا "امرتسر" اور پھر ڈر کر ایک ڈبے میں گھس گیا ۔

ڈبے کی دیواریں سرخ چھینٹوں سے بھری ہوئی تھیں ۔ نیچے لہو کی چھپڑیوں

میں گوشت کی گٹھڑیاں رکھی تھیں ۔۔ امر سنگھ سہم کر ایک طرف ہو گیا ۔
سیٹ پر پڑے کٹے ہوئے سر نے آنکھیں کھول دیں ۔ امر سنگھ کو کھڑے دیکھ کر اس کی آنکھیں اور بھی اُبل آئیں ۔ "نہیں نہیں میں مسلمان نہیں ہوں ۔ رسول اللہ کی قسم"
سیٹ پر لڑھکتا ہوا وہ نیچے گرا اور پائدان سے پلیٹ فارم پر جا پڑا ۔
"الحمد للہ" بائیں طرف کے ڈھیر سے ایک بزرگانہ آواز آئی "الحمد للہ ۔ اَشہَدُ اَن لَا ۔ ۔۔ ۔"
دفعتاً ایک شور بلند ہوا ۔ گوشت کی گٹھڑیاں حرکت کرنے لگیں ۔ اعضاء میں جنبش ہوئی ۔
"میری ٹانگ ۔ میری ٹانگ"
"خدا کے لئے مجھے مار دو ، مجھے مار دو!!"
"پاکستان!!"
"پاکستان" باہر پلیٹ فارم سے آواز گونجی ۔ امر سنگھ سہم کر باہر کی طرف بھاگا ۔
پلیٹ فارم پر انسانی اعضاء رینگ رہے تھے ۔ کٹے ہوئے سر ربڑ کے گیندوں کی طرح لڑھک رہے تھے ۔
"پاکستان" کٹا ہوا سر گردن کے بل کھڑا ہو کر چلایا "ہا ہا ہا" یہ بھیانک قہقہہ چاروں طرف گونجنے لگا ۔ کٹے ہوئے سر کی آنکھوں سے موتی ڈھلک آئے ۔
کٹے ہوئے بازوؤں والا بڈھا مسکرادیا ۔ "پاکستان" اس کی مسکراہٹ حسرت آلود تھی ۔
"الحمد للہ" قریب ہی کوئی زیر لب بولا "الحمد للہ ہم پہنچ گئے"
"پہنچ گئے؟" جوان عورت ہنسی "پہنچ گئے" اس کے قہقہے میں طنز گونج رہی تھی ۔
شکر ہے بڑھیا بولی جو کہنیوں کے بل رینگ رہی تھی ۔ اور پھر تھک کر منہ کے بل گر پڑی ۔
امر سنگھ نے منہ موڑ لیا ۔ ارے اس کے ساتھ کوچوان کھڑا تھا ۔ "کوچوان"

وہ بولا ۔ لیکن کوچوان بڑھیا کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا ۔

کوچوان بڑھیا کی طرف بڑھا ۔ اور اسے سہارا دیتے ہوئے بولا "اُٹھو ۔ اُٹھو"

اسے اُٹھاؤ اس نے ساتھ والی جوان عورت کی طرف اشارہ کیا ۔ جس کا نچلا دھڑ لٹک رہا تھا ۔ کوچوان نے محسوس کیا کہ وہ اکیلا اُسے اُٹھانے کے لئے کافی نہیں ۔ "تمہارے ساتھی"

اُس نے عورت سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ساتھی" جوان عورت نے نفرت سے کہا "ساتھی وہیں تھے وہیں ۔۔۔۔۔۔"

"وہیں" کوچوان نے حیرانی سے دہرایا۔

"وہ سامنے کھڑے تھے میرے سامنے" اس کی آواز میں نفرت کی شدت تھی ۔ "وہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہے تھے ۔ اُن کی آنکھیں پھٹ نہ گئیں ۔ ایمان ! جرأت !! جھوٹ سب جھوٹ۔ اپنی جان بچانے کے لئے جھوٹ اور عزت" وہ قہقہہ مار کر ہنسی اور پھر دھڑام سے منہ کے بل گر پڑی ۔

"پانی پانی" وہ اپنا آپ گھسیٹتے ہوئے بولی ۔

امر سنگھ نے چاروں طرف دیکھا ۔ سامنے کمرے پر پانی والا لکھا دیکھ کر وہ لپک کر ڈبے میں داخل ہو گیا ۔ کمرا خالی پڑا تھا۔

نہیں نہیں کونے میں دبکا ہوا بچہ چلایا ۔ مجھے پیاس نہیں لگی ۔ میں نے تو پانی نہیں مانگا ۔ وہ رونے لگا "مجھے نہ مارو ۔ مجھے نہ مارو ۔ میں پانی نہیں مانگوں گا ۔ نہیں مانگوں گا ۔ مجھے پیاس نہیں لگی ۔"

"پانی نہیں مانگوں گا" امر سنگھ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں نہیں" وہ چلایا اس کے سوکھے ہونٹوں پر پیپڑیاں جم گئیں ۔ لکڑی سی زبان باہر آئی "۔ پا ۔ پا ۔ پا" اُس کی آنکھیں پتھرانے لگیں ۔

"پا۔پا۔پا۔پا۔پا۔" سیٹوں تلے سے آوازیں آنے لگیں ۔ امر سنگھ نے جھک کر سیٹوں تلے نگاہ دوڑائی "پا۔پا۔پا۔" بیسیوں سوکھے ہوئے ہونٹ حرکت کر رہے تھے ، زبانیں لٹک رہی تھیں ۔ "پا۔پا"

"نہیں نہیں میں مسلمان نہیں ہوں" پلیٹ فارم پر کوئی چیخنے لگا۔
"ساتھی ۔۔ہاہاہا۔" عورت نے قہقہہ لگایا۔
"الحمد للہ ہم پہنچ گئے ۔"
اَشْہَدُ اَن لَا اِلٰہَ ۔۔۔۔۔"

امرسنگھ نے ایک جست بھری اور فضا میں تیرنے لگا ۔ وہ بھاگ جانا چاہتا تھا ۔ دور دور جہاں شاہ عالمی نہ ہو ۔ امرت سر نہ ہو ۔ کچھ بھی نہ ہو ۔ دور ۔ دور ۔ جہاں وہ آوازیں نہ پہنچ سکیں ۔ وہ آوازیں مدہم پڑتی گئیں ۔ مدھم پڑتی گئیں اور پھر خاموشی چھا گئی ۔

آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے تھے ۔ ہوا کسی نامعلوم اثر سے بھیگی ہوئی تھی ۔ چھوٹی چھوٹی بوندیں پڑ رہی تھیں ۔ دور افق کے قریب بجلی چمکتی ۔ اور پھر گہرا اندھیرا چھا جاتا ۔ نیچے زمین گویا سنسان پڑی تھی ۔ کبھی کبھی مدہم سی آوازیں سنائی دیتیں ۔ جو کبھی تیز ہوتی جاتیں ۔ پھر ایک چیخ پھر خاموشی چھا جاتی ۔ اور خاموشی کے پس منظر پر کراہیں اور سسکیاں ۔ اور پھر وہی چیخ ۔ اور پھر آوازیں اور سرگوشیاں ۔

"دینا ۔ دینا"
"آگ ۔ آگ"
"میں مسلمان ہوں ۔ دھرم کی قسم میں مسلمان ہوں ۔
"پاکستان !! ہاہاہاہا"
"راولپنڈی ! امرت سر !! شاہ عالمی !!!"

"مجھے پیاس نہیں لگی ۔ نہیں نہیں ۔ بیسیوں سوکھے ہوئے ہونٹوں سے لکڑی سی زبانیں لٹک پڑیں "پاپا ۔ پاپا۔"

بھاگتے بھاگتے وہ تھک چکا تھا ۔ لیکن وہ آوازیں ختم نہ ہوتی تھیں ۔ جیسے اتفاقاً اس کا پیچھا کر رہی ہوں ۔ ہار کر امرسنگھ نے آنکھیں بند کر لیں اور دھڑام سے نیچے آگرا۔

چاروں طرف کھیت لہرا رہے تھے ۔ جن میں مویشی کھڑے چر رہے تھے ۔ جن کے پاس ہی بیسیوں مویشی زمین پر پڑے ہوئے تھے ۔ ان کے پیٹ

پھولے ہوئے تھے ۔ جیسے کھا کھا کر گر پڑے ہوں ۔ ادہر دھند لکے میں گاؤں دکھائی دے رہا تھا ۔ بائیں طرف ایک ٹوٹا ہوا شیڈ تھا ۔ جس میں دیا ٹمٹما رہا تھا ۔ دور کہیں کتے رو رہے تھے ۔ ادھر سڑک کے کنارے گدھ اور چیلیں پر پھڑپھڑا رہے تھے ۔ اتنے گدھ !!! اتنے گدھ اس نے عمر بھر ایک جگہ نہ دیکھے تھے ۔ سڑک پر ٹوٹے ہوئے ٹرک کھڑے تھے ۔

وہ پھسل کر سڑک کی طرف چل دیا اور گدھوں کے پاس جا کھڑا ہوا ۔ لیکن گدھ جوں کے توں بیٹھے رہے ۔ کبھی کبھار کوئی سرکتا تو یوں محسوس ہوتا کہ اس میں جنبش کی ہمت نہیں ۔ وہ پر پھڑپھڑاتا مگر اس کا جسم حرکت نہ کرتا ۔ ان کے پاؤں میں گلابی گٹھڑیاں سی پڑی تھیں ۔ ان کی چونچیں رنگی ہوئی تھیں ۔ چاروں طرف عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی ، یہ منظر دیکھ کر اس کی طبیعت متلانے لگی ۔ اور وہ شیڈ کی طرف چل دیا ۔

اس نے شیڈ کا دروازہ کھولا ۔ تاک پر دیا ٹمٹما رہا تھا ۔ دیئے کی مدہم روشنی چاروں طرف پڑ رہی تھی ۔ چاروں طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی ۔ ایسی ویرانی جو ہنگامے کے عقب میں آتی ہے ۔ اور ہیبت ناک خاموشی کو جنم دیتی ہے ۔ ایسی خاموشی جس میں سے چیخوں اور سسکیوں کی بو آتی ہے ۔

امر سنگھ گھبرا کر باہر نکل رہا تھا کہ دروازے کی اوٹ سے بچہ نکل آیا ۔ "وہ چھو رہی ہے" بچے نے تتلا کر کہا ۔ "چھو رہی ہے ۔ جاگی نہیں ۔ جاگتی نہیں ۔"

"سو رہی ہے" امر سنگھ نے حیرانی سے دہرایا۔

"ہاں" وہ بولی "وہ" اس نے فرش کے درمیان انگلی سے اشارہ کیا۔

فرش پر وہ پڑی تھی بازو اور ٹانگیں پھیلائے "لیکن کپڑے" امر سنگھ نے آنکھیں ملیں ۔ سفید جسم سنہرے بال ۔ سرخ رنگ جیسے ہولی کھیل کر سو گئی ہے ۔ اس کی نیلی سوجی ہوئی چھاتیاں لٹک رہی تھیں ۔

چھو رہی ہے بچی چلائی "دیکھا" پھر وہ بھاگی بھاگی اس کی طرف گئی "امی امی دیکھا وہ چھو رہی ہے ۔ بیمال ہے امی ۔ ہاں"

"بیمار" امر سنگھ نے آہ بھری۔

ہاں وہ بولی "ڈاکو آئے تھے ۔ لیکن انہوں نے امی کو ڈاکوؤں سے بچا لیا ۔ ہاں وہ بڑے اچھے تھے وہ کہتے تھے امی ٹھیک ہو جائے گی ۔ پھر انہوں نے امی کو مالس کی ۔"

"مالش؟" اس نے ایک بار پھر غور سے عورت کی طرف دیکھا ۔

"وہ سب امی کے پنڈے پر مالس کرتے رہے" وہ بولی "وہ کہتے تھے امی اچھی ہو کر سو گئی ہے ۔ وہ بہت اچھے تھے۔"

امر سنگھ نے محسوس کیا گویا عورت کے ہونٹوں پر تبسم آرہا ہے ۔ طنز بھرا تبسم ۔ "وہ داکتل کو لینے گئے ہیں ۔" بچی نے کہا۔

"اوہ" امر سنگھ کا سر چکرانے لگا ۔ اس اجالے سے تو باہر کا اندھیرا ہی اچھا تھا ۔ اور اس معصوم بچی کی بھولی بھالی باتوں سے تو سڑک کے گِدھوں کی خاموش حقیقت بیانی کہیں قابل برداشت تھی ۔ امر سنگھ گھبرا کر باہر نکل آیا ۔

"امی ۔ امی" اندر سے بچی کی آواز آرہی تھی ۔ لیکن وہ دور بھاگا جارہا تھا ۔ دور ۔ دور۔

ہائیں وہ حیران رہ گیا سامنے سڑک پر موتی دوڑا جارہا تھا ۔ تانگے میں کوچوان سر تھامے بیٹھا ہوا تھا۔

"موتی ۔ موتی" وہ چلایا ۔ اور پھر تانگے کے پیچھے بھاگا ۔ اور لپک کر سیٹ پر جا بیٹھا ۔ کوچوان اپنی ہی دھن میں بیٹھا رہا ۔ اُسے امر سنگھ کی آمد کا احساس ہی نہ ہوا ۔ البتہ موتی مسرت سے ہنہنایا اور پھر نہ جانے کیوں سڑک چھوڑ کر کھیتوں میں ہو لیا ۔

کھیت ویران پڑے تھے ۔ یہاں وہاں مویشی پکی ہوئی گیہوں کے خوشوں پر منہ مار رہے تھے ۔ اس کے باوجود گویا وہ کھانے سے گریز کر رہے تھے ۔ جیسے کھا کھا کر اکتا گئے ہوں ۔ میدانوں میں کتے موتی کو دیکھ کر بھو نکنے کی کوشش کرتے لیکن ان کی آواز گلے میں پھنس کر رہ جاتی اور جسم میں حرکت نہ ہوتی ۔ مرغیاں زمین پر بچھی ہوئی آنتوں کو پاؤں سے رول رہی تھیں ۔ بستیوں پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔

دفعتاً موتی رک گیا ۔ اس کے رکنے سے امر سنگھ تانگے کے نیچے پھسل گیا ۔

کوچوان نے چونک کر سر اٹھایا "نہیں نہیں بیٹے ہم کرشن نگر نہیں جائیں گے ۔ نہیں جائینگے" لیکن موتی کھڑا رہا ۔ دو ایک ساعت کے بعد کوچوان پھر سر کو ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گیا ۔

امر سنگھ تیرتا ہوا گاؤں میں جا پہنچا۔

حویلی کے صدر دروازے پر دراز قد آدمی کھڑا تھا ۔ اس نے مونچھوں اور داڑھی کے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر اپنا منہ نکالا ۔ اور امر سنگھ سے کہنے لگا "تمہیں شک ہے کیا ؟ شک ہے تو آکر دیکھ لو آؤ" اُس نے حویلی کی طرف اشارہ کیا "میرے گھر میں کوئی مسلمان نہیں' میں نے کسی مسلمان کو پناہ نہیں دی' سنا تم نے ۔ جاؤ دوڑ جاؤ یہاں سے ۔ بدمعاش ۔ کمینے ۔ دراز قد آدمی دوڑ کر حویلی میں گھس گیا اور پھٹ سے دروازہ بند کر لیا ۔

"آہ ۔ آہ" اندر سے آواز آئی "میرا سر ۔ میرا سر ۔ مجھ کو پکڑو ۔ نہیں نہیں ۔ میرے گھر میں کوئی مسلمان نہیں ۔"

"کوئی مچھلمان نہیں" بچے کی آواز آئی ۔ وہ چھیدہ کے ابا ہیں ۔ مچھلمان تو نہیں ۔ وہ بڑے اچھے ہیں ۔ چھیدہ میری چھہیلی کے ابا" پھر بچے کی ایک لمبی چیخ سنائی دی ۔ اور پھر مکان پر سناٹا چھا گیا ۔

دفعتاً امر سنگھ کو خیال سا آیا اور وہ تانگے کی طرف بھاگا۔

اس نے کوچوان کو جھنجھوڑا۔ "بھاگ جاؤ" وہ بولا "تم کرشن نگر آگئے ہو۔"

موتی نے چیخ ماری اور تڑپ کر ساز توڑ کر بھاگ نکلا۔

"موتی موتی" کوچوان چلایا مگر موتی جا چکا تھا ۔ کوچوان نے قمیض کے پلو سے آنکھیں پونچھیں ۔

"میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو" امر سنگھ چلایا "چلے جاؤ ۔ بھاگ جاؤ ۔ یہاں سے بھاگ جاؤ"۔

"کہاں" کوچوان نے ٹوٹے ہوئے تانگے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"پاکستان۔"

"پاکستان ! ہا!ہا!ہا!ہاہا۔" فضا سے قہقہے کی آواز سنائی دی۔

کوچوان نے ٹوٹے ہوئے تانگے کی طرف دیکھا "موتی" وہ زیر لب گنگنایا "میرا ساتھی"۔

"ساتھی!" اندھیرے سے آواز آئی ۔ اور سوجے ہوئے جسم والی عورت رینگتی ہوئی سامنے آگئی ۔ "ساتھی" وہ ہنسی "جھوٹ جھوٹ !! ۔۔ وہ کھڑے تماشہ دیکھتے رہے جیسے جیسے وہ تماشا ہو ساتھی"۔ وہ منہ کے بل گر پڑی ۔ اُس کے بازو اکڑ گئے گردن مڑ گئی ۔

"چھیدہ چھیدہ" ۔ حویلی سے معصوم بچہ نکل آیا "تمہارے ابا یہاں ہیں یہاں ۔۔۔" دفعتاً اس کی نگاہ امر سنگھ پر پڑی"

"نہیں نہیں وہ مُسلمان نہیں وہ تو چھیدہ کے ابا ہیں"۔

"چپ" ۔۔ وہ بولی "چپ ۔ امی چھو رہی ہے ۔ چھو رہی ہے ۔ وہ بڑے اچھے تھے ۔ انہوں نے امی کو مالس کی اور امی اچھی ہو کر چھو گئی"

"کوچوان کوچوان !" امر سنگھ نے اسے گھسیٹا "آؤ آؤ بھاگ چلیں" ۔ اور وہ دونوں بھاگنے لگے۔

"لیکن کہاں ؟ کہاں" کوچوان نے بھاگتے ہوئے امر سنگھ کی طرف دیکھا ۔

"کہاں" امر سنگھ نے دہرایا اور دفعتاً رک گیا ۔

اس کے سامنے وہ کھڑی تھی ۔ راستہ روکے کھڑی تھی وہ ۔

"مجھے ماردو" وہ چلائی "ماردو مجھے" ۔ اس نے امر سنگھ سے کہا ۔ "میں مسلمان ہوں ، مجھے مار دو"

اس کا حسن اور جوانی دیکھ کر وہ دونوں ٹھٹھک گئے ۔

"تم پاکستان کیوں نہیں چلی جاتی" امر سنگھ چلایا۔

"نہیں ،نہیں ، وہ بولی میں پاکستان نہیں جاؤں گی ۔ مجھے قتل کردو لیکن میں پاکستان نہ جاؤں گی ۔ نہیں جاؤں گی ۔ تمہیں اپنے گرو کی قسم ۔ مجھے قتل کردو ۔ مار دو ۔ میرا جینا بیکار ہے ۔ بیکار ۔"

"وہ کہاں ہیں، وہ دونوں ؟" وہ بکنے لگی "میں انہیں یہیں چھوڑ کر گئی

تھی ۔ اس کھیت میں وہ دونوں کرپانوں سے لڑ رہے تھے ۔ بھائی بھائی لڑ رہے تھے ۔ میرے لئے ۔" وہ خاموش ہو گئی اور ایک فخر سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی ۔

"وہ کون ؟" امر سنگھ نے پوچھا ۔

"وہی جو ہمارے گھر آئے تھے" جوان عورت نے ملامت سے اس کی طرف دیکھا جیسے اس کے نہ جانتے پر شکایت کر رہی ہو ۔

"انہوں نے میرے پانچوں بھائی شہید کر دیئے ، اور پھر اماں کی طرف بڑھے ، نہ جانے مجھے کیا ہوا ۔ میں نے دوپٹہ اتار پھینکا ۔ اور اماں کے سامنے جا کھڑی ہوئی ۔ مجھے مارو ، مجھے ، میں مسلمان ہوں ۔ میں کافروں کے منہ پر تھوکتی ہوں ۔ میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا ۔ وہ رک گئے ۔ اس نے اپنے بھائی سے کہا ۔ یہ سب مال تمہارا ہے ۔ سب ۔ اور ۔ یہ ، اس نے میری کلائی پکڑ لی ۔ یہ میرا حصہ ہے ۔ یہ کہہ کر وہ گھسیٹتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا ۔ اور مجھے اس کھیت تک لے آیا ۔ یہاں اس نے مڑ کر دیکھا تو چھوٹا پیچھے آ رہا تھا ۔

"ٹھیرو" سجن سنگھ بولا۔

"اسے مجھے دے دو"

بے وقوف ، بڑا چلایا۔

"جوڑ میرا ہے" وہ بولا۔

"لیکن وہ مال" بڑے نے کہا ۔

"تھو" چھوٹے نے تھوک دیا "میں اس پر تھوکتا ہوں"۔

بڑے نے گھونسہ مارا چھوٹے نے کرپان نکال لیا ۔ اور وہ دونوں کرپانوں سے لڑنے لگے ۔ اور میں یہاں بیٹھی دیکھتی رہی ۔ اور وہ لڑتے رہے میری خاطر۔"

"پھر" امر سنگھ بولا۔

"پھر سڑک پر موٹر رکی اور میں اٹھ بھاگی ۔ اور وہ لڑتے رہے میرے لئے لڑتے رہے ۔ انہوں نے میرے بہن بھائی قتل کر دیئے ۔ گھر تباہ کر دیا ۔ لیکن انہوں نے مجھے دھوکا نہیں دیا ۔ اور ۔اور ، وہ اف وہ پاکستان کا فریبی اس

نے کہا تھا آؤ میں تمھیں کیمپ پہنچا دوں ۔ اور ۔ اور ، میں پاکستان میں پہنچ کر لٹ گئی ۔ پاکستان پہنچ کر لٹ گئی ۔ نہیں نہیں ، میں پاکستان نہیں جاؤں گی نہیں جاؤں گی مار دو مجھے ۔"

کھیت میں دو کٹی ہوئی سریاں لڑھکنے لگیں ۔

وہ میری ہے ۔ چھوٹا سر بڑے سے ٹکرایا ۔

میری ، بڑا چلایا ۔ اور وہ ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے ۔

"بھاگو ، بھاگو" امر سنگھ چلایا۔

"کہاں ؟" کوچوان نے اپنے ارد گرد حسرت بھری نگاہ سے دیکھا۔

"نہیں میں نہیں جاؤں گی" حسین عورت چلائی "پاکستان میں جا کر لٹنے سے یہاں مر جانا بہتر ہے"

"نہیں ۔ نہیں ، جھوٹ ہے ۔ یہاں نہ ٹھہرو یہاں نہ رکو" نہ جانے مٹیار عورت کہاں سے آکر شور مچانے لگی "یہ دیکھو ، میری کلائی پر ، ہندی ، شگفتلا میرا نام ، یہ دیکھو۔ اُس نے امر سنگھ کی طرف کلائی بڑھا دی ۔ اس نے اس کی بھی پرواہ نہ کی ۔ وہ مجھے جانتا تھا ۔ وہ میرا پڑوسی تھا ۔ لیکن وہ کہنے لگا میں مسلمان ہوں ۔ کیسوں والا مسلمان۔ ہاہاہا مسلمان ! ہاہاہا"۔

وہ ہنسی ، زہر خند ہنسی ۔۔۔۔ "سب جھوٹ کوئی مسلمان نہیں ، کوئی ہندو نہیں ، سکھ نہیں ، یہاں درندے بستے ہیں ۔ درندے"

"پاگل نہ بنو" امر سنگھ چلایا "بھاگ چلو ، بھاگ چلو"

"کہاں" کوچوان نے سر اٹھایا۔

"جہاں انسان بستے ہوں" وہ بولا ۔

"انسان" دوسری عورت ہنسی "انسان یہاں ہیں ؟ کہاں ۔ کہیں بھی نہیں"۔

"اوہ" کوچوان نے پھر سر تھام لیا۔

"میں بھاگوں گی نہیں، مٹیار عورت چلائی "نہیں! مجھے جنم دینا ہے ۔ انسان کو جنم دینا ہے ۔ میں جنم دوں گی" اس نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"جنم دینا ہے" دوسری عورت نے حیرانی سے دیکھا۔

"ہاں ! میں نے ، تم نے ، ہم نے"

"خدا کرے" کوچوان بولا۔

"خدا" دوسری عورت کھلکھلا کر ہنسی "کاش کہ وہ کچھ کر سکتا۔ کاش"

"میں کروں گی۔ میں" مٹیار چلائی "انسان۔ انسان"

"کس نے پکارا، کون ہے اس گھور اندھیرے میں؟ لنگوٹی والا لاٹھی پکڑے نہ جانے کہاں سے آگیا۔ "کون؟"

"انسان!" لنگوٹی والے نے آہ بھری۔

"تم کون ہو؟" مٹیار نے پوچھا۔

"میں کوئی بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" وہ بولا

"کوئی بھی نہیں؟" کوچوان نے حیرانی سے دیکھا۔

"شانتی شانتی" بڈھے نے مدھم آواز میں کہا "بھگوان۔۔۔۔۔"

"بھگوان" عورت نے اس کی طرف دیکھا "نہیں نہیں بھگوان نہیں۔ انسان" وہ چلائی "میں جنم دے رہی ہوں۔"

"تم! دھن ہو ماتا" بڈھا بولا اور اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے پرنام کیا۔

"میں تمہاری مدد کروں گی" دوسری عورت بولی اور وہ دونوں کھیت میں گھس گئیں۔

انسان۔ انسان۔ دور سے آوازیں بلند ہوئیں۔

"انسان، انسان" گدھ ڈر کر چیخنے لگے۔

"انسان" گویا لاکھوں بھنورے بھنبھنانے لگے۔ اور وہ آواز تیز ہوتی گئی۔ تیز ہوتی گئی۔

"انسان، انسان، انسان، انسان"

○

ریت کی لہریں

باقر کی آنکھ کھل گئی ۔ صبح کی ہلکی ہلکی سفیدی روشندانوں اور کھڑکیوں کی درزوں سے کمرے میں آرہی تھی ۔ "ہوں تو صبح ہو گئی" اُس نے ٹٹول کر سرہانے تلے سے بیڈ سوئچ دبایا ۔ کمرے میں روشنی ہو گئی ۔ اس نے لحاف کو ازسرنو اپنے گرد لپیٹا اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

انگڑائی لیتے ہوئے باقر نے محسوس کیا ۔ جیسے وہ تھکا ہوا ہو ۔ صبح سویرے تو تازہ دم ہونا چاہئے ۔ صبح سویرے تھکاوٹ۔اس نے اپنے جسم کو جھنجھوڑا ۔ اس کی پیٹھ پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں ۔ کمر میں ہلکا سا درد تھا ۔ اور شانے بوجھل محسوس ہو رہے تھے ۔ اتفاقاً اس کی نگاہ کلنڈر پر جا پڑی ۔ "٦ جنوری ۔ آج وہ اپنی زندگی کے پینتالیس سال ختم کر چکا تھا ۔ پینتالیس سال ۔ کتنی جلدی ختم ہو گئے تھے ۔ پینتالیس سال ایک دھندلا خواب چند مبہم یادیں ، چند موہوم تصاویر پینتالیس سال ۔ اس کے شانے اور بھی بوجھل ہو گئے ۔ کمر اور بھی دکھنے لگی ۔ اور تھکاوٹ بند بند میں رینگنے لگی ۔

گھبرا کر اس نے کلنڈر سے نظر ہٹالی ۔ اور آنکھیں بند کر کے تکئے کی نرمی اور لحاف کی گرمی کو محسوس کرنے لگا ۔ کتنی آسودگی ہے ۔ اطمینان آسودگی اور ایک شانِ استغنٰے ۔ اس نے آنکھیں کھول دیں ۔

ملحقہ کمرے میں چیزیں بے ترتیبی سے پڑی تھیں ۔ تمام کرسیاں آتش دان کے گرد جمع ہو رہی تھیں ۔ بائیں ہاتھ کھانے کی میز پر برتن گڈ مڈ پڑے تھے ۔ رات کی پارٹی کا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا ۔ رات اس نے اپنی سالگرہ کی پارٹی کا اہتمام کیا تھا ۔ جس میں ان گزرے ہوئے پینتالیس برس کی ستائش میں ایک لمبا چوڑا قصیدہ پڑھا تھا ۔ اور جمیل نے اس کے چھیالیسویں سال کی ابتدا کی خوشی کا اظہار کرنے کے لئے پلاؤ کی دو بڑی رکابیاں اپنے پیٹ

میں ٹھونس لی تھیں ۔ اور مسٹر ڈیوڈ نے چار گلاس بیر کے اپنے حلق میں انڈیلے تھے اور عظمت نے سکھوں کے بیسیوں لطیفے سنائے تھے ۔ اور مسٹر احمد نے فرنی کے بر چمچے کے ساتھ اسے ہیپی ریٹرن آف دی ڈے ہوش کیا تھا ۔ اور ان تمام تفاصیل پر وہ بے حد خوش ہوا ۔ کس قدر حماقت ہے ۔ وہ سوچنے لگا ۔ پینتالیس سال گزرنے پر تو اظہارِ افسوس کرنا چاہیئے ۔ سالگرہ کی بجائے سال گیا منانا زیادہ موزوں ہوتا ۔ پینتالیس سال گئے ۔ چلے گئے ۔ نہیں نہیں اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اس نے زندگی کے پینتالیس برس گزار دیئے تھے ۔ نہیں میں بوڑھا تو نہیں اس نے جھک کر آئینے میں جھانکتے ہوئے کہا ۔ بوڑھا تو نہیں ہوا ۔ نہیں تو ۔ بال تو زکام کی وجہ سے بھی سفید ہو جاتے ہیں ۔ اور یہ جھریاں تو نہیں ۔ میرے چہرے پر تو شروع ہی سے لکیریں پڑتی تھیں ۔ اور یہ سنجیدگی ۔۔۔ نہیں سنجیدگی اور بڑھاپا تو مختلف چیزیں ہیں ۔ سنجیدگی تو ہر باوقار شخص میں ہوتی ہے ۔ اُس نے بشاشت پیدا کرتے ہوئے سوچا ۔ معلوم نہیں ہوتا کہ میں پینتالیس برس کا ہو چکا ہوں ۔ بتی آپ ہی آپ بجھ گئی ۔ اور آہستہ آہستہ کھڑکی کی درز سے سورج کی ایک کرن اس کے چہرے پر پڑی ۔ زندگی میں کس قدر اطمینان حاصل ہے ۔ کتنی آسودگی ہے ۔

وہ ویسے ہی آئینے کے سامنے جھکا جھکا سوچنے لگا ۔ اتفاقاً اُس نے نظر اُٹھائی ۔ آئینے میں ایک پژمردہ چہرہ دکھائی دے رہا تھا ۔ جس پر سنجیدگی کی مردنی چھائی ہوئی تھی ۔ گال اندر کی طرف دھنسے ہوئے تھے ۔ اور گالوں تلے دو موٹی موٹی دراڑیں پڑی تھیں ۔ کلوں کی ہڈیوں تلے آنکھیں ڈوبتی جا رہی تھیں اور بال کھچڑی ہو رہے تھے ۔ گھبرا کر وہ چونک پڑا ۔ بڈھا ۔ بڈھا ۔ اس نے محسوس کیا ۔ جیسے کوئی اس کا منہ چڑا رہا ہو ۔ اس نے ایک ٹھیس سی محسوس کی ۔ کوئی تیز چیز چیرتی ہوئی اس کے دل کی گہرائیوں میں اترتی جا رہی تھی ۔ باقر نے مسکرانے کی کوشش کی اور یوں شانے جھنجھوڑے جیسے ان پر پڑے ہوئے بوجھ کو گرانا چاہتا ہو ۔ لپک کر اس نے ریڈیو کا بٹن کھول دیا ۔ اور پھر سے تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا ۔

بھیرویں کے الاپ سے کمرہ بھر گیا ۔ کوئی شخص مزے میں گا رہا تھا ۔ باقر

نے اپنی تمام تر توجہ راگ کی طرف مبذول کر دی اور اسی میں کھو گیا ۔
آہستہ آہستہ اس نے محسوس کیا جیسے بھیروں نے اس کے گرد ایک وسیع ویرانہ پھیلا دیا ہو ۔ ایک اطمینان اس کی رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا ۔ ایک پژمردگی چھائے جا رہی تھی ۔ ایک لامتناہی سکوت ۔ ایک مردنی ۔ جیسے آہستہ آہستہ زندگی اُس کے رگ و پے سے خارج ہوئی جا رہی ہو ۔ زندگی کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹا جا رہا تھا ۔ زندگی کی لہریں ۔ دور ہٹی جا رہی تھیں ۔ اور ریتلے کنارے پر صرف ریت کی لہریں اس کے گرد و پیش پھیلی جا رہی تھیں ۔ ریت کی لہریں باقر نے چاہا کہ اٹھ کر ریڈیو بند کر دے ۔ اور اس بڑھتی ہوئی بے حسی اور پژ مردی سے اپنے آپ کو محفوظ کر لے ۔ لیکن اُس میں اتنی ہمت باقی نہ رہی تھی ۔ جیسے اس کا جسم جنبش کا اہل نہ رہا ہو ۔ جیسے اس کا عزم قوت کھو چکا ہو ۔ "ہائے کیا کرتی ہے تو رفیہ" پڑوس سے بشرہ کی آواز آئی ۔
باقر چونکا ۔ آج پہلی مرتبہ اُس نے بشرہ کی آواز کو وضاحت سے سنا تھا ۔ اُسے ایسے محسوس ہوا ۔ جیسے اس پھیلے ہوئے دشت میں کارواں کی گھنٹیاں بج رہی ہوں ۔ جیسے گھور اندھیرے میں سورج کی کرن آنکلی ہو ۔ پھر وہ آواز دور ہوتی گئی ۔ دور ہوتی گئی ۔ کارواں دور جارہا تھا ۔ دور۔ زندگی سے اس کا تعلق ٹوٹتا جا رہا تھا ۔ وہی بے حسی اور پژمردنی چاروں طرف سے محیط و مسلط ہوئی جارہی تھی ۔ گھبرا کر وہ اٹھ بیٹھا ۔ "نذیر ۔ نذیر ۔ وہ چلایا ۔ چائے لاؤ چائے" اور یوں چیخ کر ایک ہنگامہ پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا ۔

سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

ریڈیو پر بھیروں کی جگہ غالب کی غزل کا شعر سن کر وہ از سر نو چونکا ۔ اُس کی نگاہوں تلے اسد منزل کا بالائی حصہ ابھرنے لگا ۔ جہاں عالم جوانی میں کھڑے ہو کر وہ ریحانہ کو دیکھتا کرتا تھا ۔ جو دور اپنے کوٹھے پر یوں خراماں خراماں ٹہلا کرتی تھی ۔ جیسے وہ تفریح گاہ ہو ۔ اور پھر تھک جاتی تو آرام کرسی پر بیٹھ کر یوں کتاب سامنے رکھ لیتی ۔ جیسے اسے ایک ہی نشست میں پڑھ کر رکھ دے گی ۔ اور پھر بات بات پر سر اٹھاتی اور اپنی چھوٹی بہن جمیلہ پر برس پڑتی ۔ جیسے وہ اس کا وقت ضائع کر رہی ہو ۔ اس کی توجہ کو بھٹکا رہی ہو ۔ اور پھر کنکھیوں سے

باقر کی طرف دیکھ کر مسکراتی ، کس قدر شوخ تھی ریحانہ ، ایک ساعت کے لئے بھی نچلی نہ بیٹھتی تھی ۔ اب لبِ بام ٹہل رہی ہے ۔ ابھی باورچی خانے کی کھڑکی سے جھانکنے لگی ۔ اور پھر ایک ساعت کے بعد اُس کا سفید سفید بازو برآمدے کی چق سے باہر نکل کر بجلی کی طرح لہرا گیا ۔ اور باقر بھی گھر میں بیتاب گھوما کرتا ۔ اب چوبارے میں کھڑا ہے ۔ ہائیں کہاں چلی گئی ریحانہ اور وہ شڑاپ شڑاپ نیچے اُترا اور غسلخانے کی کھڑکی سے جھانکنے لگا شاید یہاں سے دکھائی دے ۔ پھر ملاقاتی کمرے کی طرف بھاگا ۔ اور پردوں پر ریحانہ کی چوٹی لہراتے دیکھ کر ازسرنو اوپر بھاگا ۔ اور سیڑھیوں میں روشندانوں سے دیکھنے لگا ۔ اُن دنوں باقر سیماب کی طرح مضطرب رہتا تھا ۔ کتنی زندگی تھی اُس میں ۔ "رضیہ رضیہ" پڑوس سے وہ بشرہ کی آواز سن کر چونکا ۔ کتنا لوچ تھا اس کی آواز میں کتنی زندگی تھی ۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بشرہ کو دیکھے ۔ کیا اس کی آنکھیں بھی ریحانہ کی طرح کونوں میں آ آکر مسکراتی ہیں ۔ کیا اس کی لٹ بھی بار بار اُلجھتی ہے ۔ کیا اس کا ریشمی پلو بھی ہر آن اُڑتا رہتا ہے ۔ رضیہ رضیہ آواز دور جارہی تھی دور ۔ اس نے محسوس کیا ۔ جیسے زندگی اس سے دور جارہی ہو ۔ جیسے زندگی اس کی رگ؛ پے سے خارج ہوئی جارہی ہو ۔ پاؤں کی آہٹ سن کر وہ چونکا ثریا چائے کا ٹرے لئے کھڑی تھی ۔ ثریا کو دیکھکر وہ بھونچکارہ گیا ۔ کتنی جوان ہوگئی ہے ۔ اس نے گویا پہلی مرتبہ اپنی بیٹی کو غور سے دیکھا ۔ خم و پیچ کتنے نمایاں ہوگئے تھے ۔ کتنی لمبی پلکیں تھیں ۔ اور ہونٹ جیسے مسکراہٹ دبائے ہوئے ہوں ۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا جیسے وہ گناہ کا مرتکب ہو رہا ہو جیسے وہ مجرم ہو ۔ اسے غصہ آگیا ۔ تم مردانے میں کیوں آئی ہو بیٹی اس نے تنک کر کہا ۔ نوکر کہاں ہے "باہر گیا ہے ای نے کہا تھا تم لے جاؤ چائے ۔" ثریا نے جھکی جھکی آنکھوں سے جواب دیا ۔ اُس کی آواز سن کر باقر ریڈیو کی طرف گھورنے لگا جیسے وہ ریڈیو کا نغمہ سننے میں منہمک ہو ۔ دیر تک وہ ریڈیو سننے میں منہمک رہا ۔ جیسے وہ اس سریلی آواز سے ڈرتا ہو جو ثریا کے چلے جانے کے باوجود کمرے میں ابھی تک گونج رہی تھی ۔ پھر وہ تھک کر لیٹ گیا ۔ اس کے شانوں پر وہی بوجھ محسوس ہونے لگا ۔ جسم میں پژمردگی کی چیونٹیاں رینگنے لگیں۔

باہر گلی میں زرّی کی آواز سنائی دی ۔ جو کسی سے کچھ کہہ رہی تھی ۔ "لو بہن یہ بھی کوئی بات ہے ۔" وہ بولی ۔ "بی بی تو خواہ مخواہ آنکھیں دکھاتی ہے ۔ بڑی آئی امیر جادی کہیں کی ۔" باقر کو زرّی سے نفرت تھی ۔ اُسے ایسے محسوس ہوتا تھا ۔ جیسے زرّی ایک عام قسم کی چالاک عورت ہو ۔ جیسے اس کی ہر جنبش ایک عریاں اشارہ ہو ۔ لیکن اس وقت اُس کی آواز سن کر باقر چونکا ۔ عجیب سی آواز تھی ۔ جیسے حلق کی بجائے اُس کی چھاتی سے نکل رہی ہو ۔ کتنی گول تھی وہ آواز ۔ گولائیوں بھری جس میں سے تیکھے پنڈے کی بو آرہی تھی ۔

"میں کسی سے دبنے والی نہیں" ۔ بہن زرّی نے کہا ۔ نواب جادی ہوگی تو گھر بیٹھے ، میں کیا جانتی ہوں نواب جادیوں کو ۔

باقر کا جی چاہتا تھا ۔ کہ چپکے سے کھڑکی کی درز سے باہر جھانک کر دیکھے کہ زرّی کیسے آنکھیں مٹکاتی ہے ۔ اسے احساس ہو رہا تھا ۔ کہ اگرچہ اس کے انداز میں عریانی تھی ۔ مگر عریانی کے باوجود اس میں زندگی تھی ۔ بھرپور زندگی ۔ نہ جانے آج اسے زندگی میں اتنی جاذبیت کیوں محسوس ہو رہی تھی ۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ایک بار پھر زندگی کے منجدھار میں چھلانگ لگا دے اور ڈبکیاں لگائے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیسے چھلانگ لگائے ۔ اور وہ منجدھار کہاں تھی ۔ زندگی کی منجدھار اس سے دور کیوں ہٹتے جارہی تھی ۔ اور اس کے اپنے گرد ریتلا ساحل کیوں تھا ۔ ریت ۔ ریت ۔ ریت سے بنی ہوئی لہریں جن میں حرکت تو دکھائی دیتی تھی لیکن زندگی نہ تھی ۔

"بشرہ کی ماں بشرہ کی ماں" گلی سے سعیدہ کی آواز سنائی دی ۔ یہ وہی سعیدہ تھی جس سے ملنے سے باقر نے ثریا کی ماں کو منع کر رکھا تھا ۔ ان دنوں جب وہ ان کے گھر آیا کرتی تھی اُسے وہ دن یاد آگئے ۔ اس روز جب وہ کھڑکی میں کھڑی باقر کی طرف دیکھ کر مسکراتی رہی تھی ۔ اور پھر کچھ دیر کے بعد برقعہ اوڑھے باقر کے گھر آگئی تھی ۔ اور آتے ہی ثریا کی ماں سے کہنے لگی ۔ "لو اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ثریا کے ابا آج گھر ہی ہیں تو میں کیوں آتی" ۔ اور باقر نے یہ سن کر گھن سی محسوس کی تھی ۔ اور اسی شام ثریا کی ماں کو سعیدہ سے ملنے سے منع کر دیا تھا ۔ اور اس کے بعد اس نے ہمیشہ محسوس کیا تھا ۔ گویا سعیدہ کی ہر

مسکراہٹ میں اثبات کی جھلک ہو ۔التفات کا اشارہ ہو ۔ کھڑکی میں وہ اسے مسکراتا دیکھ کر منہ موڑ لیا کرتا تھا ۔

"بشرہ کی ماں" سعیدہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھی ۔ ہائے میں تو کبھی نہ رکھوں جوان نوکر گھر میں ۔ جب وہ گھر سے چلے جاتے ہیں تو کیا میں اس جوان نوکر کے ساتھ اکیلی رہوں ۔ نہ بھئی میری تو ہمت نہیں پڑتی ۔ نہ جانے لوگ کیسے گھر میں جوان نوکر رکھ لیتے ہیں"

باقر نے کھڑکی سے دیکھا سعیدہ کے چٹے سفید منہ پر لکیریں سی پڑی ہوئی تھیں ۔ عجیب سی لکیریں ۔ جیسے وہ کسی مخصوص بات کی طرف اشارہ کر رہی ہوں ۔ لیکن بھرپور ہونے کے باوجود اس کا جسم لٹا ہوا دکھائی دے رہا تھا معاً اس نے محسوس کیا جیسے وہ بھی ریت کی لہروں سے بنی ہو ۔ جیسے وہ بھی زندگی کی منجدھار کی تلاش میں سرگرداں ہو ۔ اسے سعیدہ پر ترس آنے لگا ۔ پہلی مرتبہ اس نے محسوس کیا کہ وہ اپاہج تھی ۔ ریت کے کنارے پر بیٹھی ہوئی ایک بھکارن ۔ دفعتاً وہ اٹھ بیٹھا ۔ کوٹ پہنا ۔ اور باہر مردانے کے صحن میں جا کر ٹہلنے لگا وہ زندگی کی منجدھار کا متلاشی تھا ۔

چاروں طرف سے آوازیں آرہی تھیں ۔ گلی سے برتن بجنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں ۔ اُس نے محسوس کیا جیسے ان آوازوں میں جوانی کی کھنک ہو ۔ اس کی نگاہوں تلے سڈول مخروطی بازو جنبش کرنے لگے ۔ چقوں کی تیلیوں کی سرسراہٹ کے ساتھ حنائی انگلیوں کی جھلکیاں دکھائی دینے لگیں ۔ پازیب کی مدہم جھنکاروں میں چھوٹے چھوٹے پاؤں رقص کرنے لگے ۔ آج ان مبہم آوازوں کے ساتھ نئے مفہوم ابھر رہے تھے ۔ زندگی سمٹ کر آواز بن چکی تھی ۔ اور اس کے کان پھیلتے جا رہے تھے ۔ ان میں انوکھی حس پیدا ہو رہی تھی ۔

جیسے تمام کائنات پر چھائے جا رہے ہوں ۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے قریب ہی کہیں زندگی کا دھارا رواں دواں ہو ۔ وہ دیر تک بیٹھا اس دھارے کی آوازیں سنتا رہا ۔ پھر وہ مضطربانہ انداز سے اٹھ بیٹھا ۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی ۔ مگر مردانے کے بند صحن سے اسے کچھ دکھائی نہ دیا ۔ صرف آوازیں خالی آوازیں ۔ پھر وہ بے تابانہ کوٹھے پر چڑھ گیا ۔ کوٹھے پر روپہلی دھوپ پھیلی

ہوئی تھی ۔ اور ارد گرد چاروں طرف جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی ۔ مکانات دکھائی دے رہے تھے ۔ جیسے دیواروں ۔ چھتوں ۔ چقوں اور پردوں سے ڈھکے چھپے مکانات دفعتاً ننگے ہو گئے ہوں ۔

اُس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور ان جانے میں خوشی کی ایک لہر ، دبی دبی لہر محسوس کی جیسے وہ زندگی کے دھارے کے عین درمیان میں آن پہنچا ہے ۔ اطمینان سے وہ کرسی پر بیٹھ گیا ۔

سامنے مکان کے صحن میں بچے کھیل رہے تھے ۔ قریب ہی ایک بڑھیا چارپائی پر بیٹھی تھی ۔ دفعتاً سیڑھیوں کے دروازے سے ایک لڑکی بال کھولے بھاگی بھاگی داخل ہوئی ۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک اور تھی ۔ وہ بھاگ رہی تھیں ۔ ہنستے ہنستے دوہری ہوئی جارہی تھیں ۔ بڑھیا نے غضبناک نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا اور چلانے لگی ۔ لیکن وہ اوپر کی سیڑھیاں چڑھنے میں مشغول ہو چکی تھیں ۔ بڑھیا نہ جانے کیا کہہ رہی تھی ۔ انہیں بڑھیا کی بات سننے سے کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ بلکہ انہیں احساس ہی نہیں تھا کہ بڑھیا کچھ کہہ رہی ہے ۔

پہلی لڑکی نے ہنستے ہنستے باقر کی طرف دیکھا اور مسکرائی جیسے اس کی موجودگی کا اعتراف کر رہی ہو ۔ "ہمیں معلوم ہے تم دیکھ رہے ہو" کی سی نگاہیں ۔ دوسری نے دیکھے بغیر اس کی موجودگی کے احساس کو جتایا ۔ اور چھت پر پہنچ کر دونوں ٹہلنے لگیں ۔ کوٹھے پر دوڑتیں اور پھر باقر کی طرف نگاہ غلط انداز ڈال کر مسکراتیں اور باقر کے دل میں خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی اور اسے محسوس ہوتا جیسے ریت کی لہریں پانی کی لہروں میں تبدیل ہوئی جا رہی ہوں ۔

عین اس وقت سورج بادل تلے آگیا ۔ اور دوسری لڑکی نے باقر کی طرف منہ کر کے بال لٹکا دیئے اور جب سورج بدلی سے باہر نکلا تو اس نے بال منہ سے سرکا دیئے اور ساتھ ہی ایک بھرپور مسکراہٹ سے باقر کی طرف دیکھا ۔ باقر کا دل اچھل کر گلے میں آ اٹکا ۔ جوش میں وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا ۔

ہائیں ۔۔۔ اسے دیکھ کر وہ دونوں چھت کے پردوں تلے چھپ گئیں ۔

باقر کو سمجھ میں نہیں آتا تھا ۔ کہ یوں دفعتاً چھپنے سے ان کا مطلب کیا تھا ۔ اس نے مڑ کر پیچھے کی طرف نگاہ دوڑائی پچھلے کوٹھے پر ایک نوجوان کتاب

ہاتھ میں لئے ٹہل رہا تھا اور ان دونوں کی طرف دیکھ دیکھ کر اشارے کر رہا تھا۔ اوہ تو وہ تمام شوخیاں ان صاحب کے لئے تھیں۔ اس کے دل پر ٹھیس لگی۔ اور ریت کی لہریں بالکل ہی ریت کی ہو کر رہ گئیں۔ وہ بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ آخر اسے دیکھ کر یوں چھپنے کی کیا وجہ تھی۔ کیوں۔ کیا وہ احساسِ حسن سے کورا تھا۔ کیا وہ حسین اشارات کا معترف نہ تھا۔ وہ سوچتا رہا۔ دیر تک انہیں خیالات میں کھویا رہا۔ آن جانے میں اس نے کرسی کا رخ بدل دیا۔ اور پھر سر اٹھا کر دیکھنے لگا۔ سامنے سبز جنگلے میں ایک نوجوان لڑکی کرسی پر بیٹھی کچھ بننے میں مصروف تھی۔ گندمی رنگ۔ کتابی چہرہ اور لانبی پلکیں۔ اس کے چہرے میں ایک تازگی تھی۔ ایک بشاشت اگرچہ خدوخال اس قدر حسین نہ تھے مگر بلا کی جاذبیت تھی۔ وہ غور سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ایک مرتبہ وہ سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھے اور مسکرا دے۔ بس صرف ایک مسکراہٹ۔ جیسے اس کی مسکراہٹ اس یخ کو پگھلا دینے کے لئے کافی تھی۔ جو اس کے گرد جما ہوا تھا۔ صرف ایک نگاہ ایک مسکراہٹ۔ اہم۔ اہم۔ ان جانے میں وہ کھانسنے لگا۔ بجلی کی طرح وہ لٹکی ہوئی مژگان اٹھیں اور پیشتر اس کے کہ وہ اسے دیکھ سکتا۔ کھڑکی کا ایک پٹ بند ہو گیا۔ اور وہ نظر سے اوجھل ہو گئی۔

اس کی کنپٹیاں تھرکنے لگیں۔ اس نے غصے سے دوسری طرف منہ موڑ لیا۔ ادھر کوٹھے پر زری سعیدہ سے سر جوڑے سرگوشیاں کر رہی تھی۔ دفعتاً اسے خیال آیا سعیدہ، لیکن یاد آیا کہ وہ تو آپ ریت میں پھنسی ہوئی ایک ٹوٹی ہوئی ناؤ تھی۔ عین اس وقت زری کی نگاہ باقر پر پڑی سرگوشیاں ختم ہو گئیں۔ "چپ وہ" وہ بولی اور پھر دوپٹہ سر پر سنبھال کر منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔

باقر نے پہلو بدل لیا۔ اور بشرہ کے مکان کی چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ بشرہ کی آواز میں کس قدر معصومیت تھی اور بات کرتے ہوئے جب وہ آخری لفظ کو جھلاتی تھی تو ایسے محسوس ہوتا جیسے آبِ زمزم لہریں لے رہا ہو۔ پاکیزگی میں سے شرماتی ہوئی زندگی جھانکتی تھی۔۔۔ ہائیں وہ بھونچکا رہ گیا۔ بشرہ پردے کے اوپر کھڑی حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں جیسے ان میں بند ہونے کی طاقت نہ رہی ہو۔ اس کی مژگان پھول کی پتیوں کی

طرح پھیلی ہوئی تھیں ۔ اس کے ہاتھ سینے سے یوں چمٹے تھے جیسے اپنا آپ تھام رہی ہو ۔

ایک ساعت کے لئے وہ کھڑی رہی جیسے اسے سمجھ میں نہ آتا ہو کہ وہ کیا کرے ۔ پھر ہلکی سی آواز آئی اور بجلی سی گری اور بشرہ نگاہ سے اوجھل ہو گئی ۔

باقر کچھ دیر تو پھٹی پھٹی نگاہوں سے ادھر دیکھتا رہا پھر وہ اُٹھ کر زخمی شیر کی طرح دیوانہ وار کوٹھے پر ادھر اُدھر گھومنے لگا۔

ایک نگاہ ، محبت بھری نگاہ ! اس نے سامنے کوٹھے کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھا دونوں بہنیں پردوں کے پیچھے بیٹھ کر حنائی انگلیوں سے نہ جانے کس طرف اشارے کر رہی تھیں ۔ سبز جنگلے کی کھڑکی کا وہ پٹ اسی طرح بند تھا ۔ ریشمیں کپڑے پر صرف دو چوٹیاں جھولتی دکھائی دے رہی تھیں ۔

ایک نگاہ صرف ایک نگاہ ، محبت بھری نہ سہی دلچسپی کی نگاہ ۔ جو اسے یقین دلا سکے کہ وہ ابھی زندہ ہے ۔ جو اس میں زندگی کی لہر دوڑا دے ۔ کسی پردے سے ایک سر جھانکے ۔ ایک نگاہ جو اس کے لئے مخصوص ہو یا کوئی اس کے سامنے سے یوں گزر جائے جیسے اسے اپنا آپ دکھا رہی ہو ۔ ایک بار پاؤں اس کی خاطر ٹھمکیں ۔ پلو سر کے اور سنبھال لیا جائے ، ایک بار کھڑکی کا پٹ کھلے اور اوئی اللہ کہہ کر کوئی مسکرا کر پٹ بند کر دے ۔ لیکن چاروں طرف گویا ایک ویرانہ پھیلا ہوا تھا ہر کوئی اپنی دھن میں لگا تھا گویا باقر کی موجودگی کا کسی کو احساس تک نہ تھا۔

کیا وہ واقعی بوڑھا ہو چکا تھا ۔ کیا بڑھاپے کی وجہ سے اب اس کی حیثیت سرخ جھنڈی کی سی ہو چکی تھی ۔ نہیں نہیں ابھی تو اس کا دل حسیات کی دولت سے مالا مال تھا اس میں جذبات کی فراوانی تھی ۔ پھر لوگ اسے دیکھ کر یخ بستہ کیوں ہو جاتے تھے ۔ اس کی وجہ اس کی سنجیدگی تھی ۔ سنجیدگی بڑھاپا نہیں ۔ اس خیال پر اس کے چہرے پر امید کی ایک کرن جھلکنے لگی ۔ اس کے شانوں سے وہ بوجھ اتر گیا ۔ انداز میں لطافت پیدا ہو گئی ۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ دوڑے ، بھاگے ، ہنسے کھیلے اور آنکھیں مٹکا مٹکا کر دیکھے ، اشارے کرے آخر انہیں بھی تو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ جوانی کا کھیل کھیلنے کا متمنی ہے ۔

اِن دنوں بھی تو وہ ریحانہ کو اشارے کیا کرتا تھا ۔ ان دنوں اس کے ہاتھ میں ہمیشہ ریشمی رومال پکڑا ہوتا تھا ۔ اور پھر ماتھا کھجانے کے بہانے جب اس نے پہلی مرتبہ ریحانہ کو سلام کیا تھا۔

دفعتاً سامنے کوٹھے پر دونوں بہنیں پردے کی اوٹ سے نکل کر سامنے آ گئیں ۔ سلام کرو سلام ۔ اس کے ذہن سے آواز آئی ۔ کوئی دیکھتا نہ ہو ۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے چاروں طرف دیکھا ۔ لیکن ان دونوں نے منہ موڑ لیا تھا ۔ اس کی پیشانی پر پسینہ آگیا ۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے سبھی اس کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ جیسے ان سب کو معلوم تھا کہ وہ ماتھا کھجانے کے بہانے سلام کرنے والا ہے ۔

سعیدہ کے کوٹھے پر زری مسکرا رہی تھی جیسے وہ باقر کی چالاکی سے واقف ہو ۔ بائیں ہاتھ دو عورتیں اسے کنکھیوں سے دیکھ رہی تھیں ۔ سامنے گھر میں چارپائی پر بیٹھی ہوئی بڑھیا اسے گھور رہی تھی۔

نہیں نہیں باقر نے شانے جھنجھوڑ کر کہا میں کسی سے نہیں ڈرتا ۔ کسی سے نہیں ، دیکھتے ہیں تو پڑے دیکھیں ، اس نے بے باکانہ سامنے گھر کی طرف دیکھنا شروع کر دیا ۔ وہ ادھر دیکھ رہی ہیں ۔ باقر یہ محسوس کر کے گھبرا گیا ۔ ماتھا کھجاؤ ماتھا ۔ اس نے اپنا ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ منوں بوجھل ہو چکا تھا ۔ جیسے اس کے شانوں کا بوجھ اتر کر اس کے بازوؤں پر گر چکا ہو ۔

شرم سے اس کی نگاہیں دھندلا گئیں ۔ اس نے محسوس کیا جیسے گردوپیش کی گہما گہمی کے درمیان وہ ایک گڑا ہوا کھمبا ہو ۔ جیسے زندگی کے سمندر میں وہ ایک ڈوبا ہوا جہاز ہو ۔

غصے سے اس کی کنپٹیاں تھرکنے لگیں ۔ وہ نیچے اترنے لگا ۔ زندگی کے سمندر میں ڈبکیاں لینے سے تنہائی کی پژمردنی کہیں بہتر تھی ۔ اگرچہ زندگی کی لہر کی تمنا ابھی تک اس کے دل میں لہریں لے رہی تھی ۔

سیڑھیاں اترتے وقت وہ چونکا ۔ سیڑھیوں میں زری تھی ۔ وہ اوپر آرہی تھی ۔ باقر کو دیکھ کر وہ رک گئی ۔ اس کے رکنے میں بھی زندگی کی تڑپ تھی ۔ اتنی جو اس کی تڑپ میں بھی نہ تھی ۔

زری کو دیکھ کر اس نے محسوس کیا جیسے جیون ساگر اس کے قریب ہی بہہ رہا ہو ۔ اس قدر قریب ۔ صرف ایک جست ، ایک لڑکھڑاہٹ ، ایک لغزش ۔

اِن گھومتی سیڑھیوں کی تنہائی میں کوئی دیکھنے والا نہ تھا ، کوئی طنز سے مسکرانے والا نہ تھا ۔ زری قریب آتی جا رہی تھی اور قریب ۔ صرف ایک بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زری تم ـــــ !

دفعتاً گرم پنڈے کی بو نے اس کی طرف یورش کی ۔ اہم ، اہم خواہ مخواہ اس کے منہ سے کھانسنے کی آواز نکلی "زری" اس نے ہمت کر کے کہا ۔ لیکن نگاہوں نے ساتھ نہ دیا ۔ زری نے ڈر کر سر کا دوپٹہ سنبھال لیا اور آنکھیں جھکا کر کھڑی ہو گئی ۔

دفعتاً وہ لہر ریت میں تبدیل ہو گئی ۔ ریت ریت ریت اور وہ اس میں دھنسا جا رہا تھا ۔ دھنسا جا رہا تھا۔

کمرے میں پہنچ کر وہ دھڑام سے چار پائی پر گر پڑا۔

آہستہ آہستہ اس پر پژمردگی چھاتی گئی ۔ جسم میں ازسرِنو چیونٹیاں چلنے لگیں ۔ جیسے زندگی آہستہ آہستہ اس کے بند بند سے خارج ہوتی جا رہی ہو ۔ زندگی کا دامن اس کے ہاتھوں سے چھوٹتا جا رہا تھا۔

باہر سے آوازوں کی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی جو اس کمرے کے سکوت کو اور بھی بھیانک بنا رہی تھی ۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا جیسے وہ قبر کی لحد میں پڑا ہو ۔ جیسے وہ سب اسے دفنا کر چلے گئے ہوں ۔ اور اب دُور اپنے اپنے کام کاج میں لگ گئے ہوں ۔

دوسرے کمرے میں گھڑی کی ٹک ٹک کس قدر سست اور دھیمی سنائی دے رہی تھی ۔ ٹِک ٹِک پینتالیس سال ، ٹک ٹک پینتالیس سال وہ چونک پڑا ۔ اوہ ۔ آج اس کی سالگرہ تھی ۔ پینتالیس سال بیت گئے ۔ وہ مسکرا دیا ۔ بے بسی بھری مسکراہٹ پھر وہ بے بسی غصے میں تبدیل ہوتی گئی ۔ احساس کمتری ابھرنے لگا اور اس نے احساسِ عظمت کا روپ دھار لیا ۔ آئینے میں دیکھ کر اس نے محسوس کیا جیسے وہ ایک بزرگ ہو ۔ بوڑھا بزرگ ۔ وہ مسکرا پڑا "اہم ۔ اہم ۔ اس کی آواز میں عظمت کی گونج تھی ۔ کون ہے اس نے باہر آہٹ سن کر

کہا۔

"بیگم ہے" اس کی آواز میں رعونت پیدا ہو گئی ۔ جیسے دفعتاً اسے سہارا مل گیا ہو "کیا ہے"

"کچھ نہیں" بیگم گھبرا کر بولی "اس وقت آپ آرام کر رہے ہیں تو پھر سہی کبھی ۔"

"کیا بات ہے" اس نے بے پرواہی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں" وہ گھبرا کر بولی "وہی بات تھی پرانی" اس نے مسکرانے کی کوشش کی ۔

"کونسی"

"سعیدہ کی والدہ آئی ہوئی ہیں۔"

"تو پھر"

"اپنے بابر کے لئے رشتے کے پیغام کا جواب مانگ رہی ہیں ۔ آپ تو جانتے ہی ہیں۔"

"ہوں"

"تو کیا میں اسے ٹال دوں"۔

"کیوں ؟"

"تو کیا ہاں کہدوں" وہ مسکرا کر بولی۔

"بابر کے لئے سعیدہ اچھی بیوی رہے گی ۔"

"لو سعیدہ کی کیا بات ہے اس میں ہر خوبی ہے ۔"

"تمہیں پسند ہے یہ رشتہ۔"

"میری پسند کا کیا ہے" البتہ وہ اور قریب ہو گئی اور رازدارانہ انداز سے کہنے لگی "خود بابر کو یہ رشتہ پسند ہے ۔ وہ تو سعیدہ کو دل سے چاہتا ہے۔"

"کیا کہا" ۔ باقر کے چہرے کی لکیریں اور بھی گہری ہو گئیں ۔

"اپنے بابر کو سعیدہ سے محبت ہے ۔" وہ بولی

"محبت" وہ رک گیا اور محسوس کرنے لگا جیسے زندگی کے سمندر میں وہ کھمبے کی طرح گڑا ہوا ہو "محبت" اس نے دہرایا۔

"تو پھر آپ کا کیا فیصلہ ہے؟" وہ بولی

دفعتاً اس نے محسوس کیا جیسے وہ بڑا ہوتا جا رہا ہو ۔ پھولتا جا رہا ہو۔ عظیم تر ہوتا جا رہا ہو ۔ جیسے اس کے پاؤں میں زندگی کا دھارا بہہ رہا ہو ۔ اس نے پاؤں کی ٹھوکر مار کر ریت کا ایک تودا اس دھارے میں گرا دیا ۔

"نہیں بیگم یہ رشتہ نہیں ہو گا۔"

○

سمنہ

سمنہ ایک عام سی بچی تھی ۔ اس میں کوئی ایسی خصوصیت نہ تھی جو اسے دوسرے بچوں سے ممتاز کرتی ۔ البتہ ایک بات پر گھر کے سبھی لوگ حیران تھے ۔ ہر کوئی سمنہ کی طرف دیکھ کر محسوس کرتا جیسے وہ بچہ نہ ہو ۔ اس کی زیادہ تر وجہ سمنہ کے خدوخال تھے ۔ لیکن نہیں ۔۔۔ اس کے خدوخال میں اگر جاذبیت نہ تھی ۔ تو ان میں کوئی ایسی بات بھی نہ تھی جسے دیکھ کر منفی جذبہ پیدا ہوتا ۔ اس کے خدوخال عام سے تھے ۔ جیسے عام بچوں کے ہوتے ہیں ؟ لیکن اس کے چہرے پر معصومیت نہ تھی ۔ اسے بیٹھے دیکھ کر ایسے محسوس ہوتا جیسے کسی بچے کے جسم پر ایک بالغ سر لگا دیا گیا ہو ۔

کئی مرتبہ ہم اسے دیکھ کر چونک پڑتے اور محسوس کرتے جیسے وہ خاموشی سے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی ہو یا حالات کا مطالعہ کر رہی ہو یا کسی مسئلے پر بڑی سنجیدگی سے سوچ رہی ہو ۔ اس کی ماں چونک کر میری طرف دیکھتی ۔ اور مجھے محسوس ہوتا کہ ہم دونوں کے احساسات ایک سے ہیں ۔ اگرچہ ہم نے اس موضوع پر آپس میں کبھی بات نہ کی تھی ۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ کئی ایک احساسات بتائے بغیر خاموشی سے دوسرے تک پہنچا دیئے جاتے ہیں اور اس طرح وضاحت سے ان کا اظہار کر دیا جاتا ہے کہ پھر زبان سے کہنے کی ضرورت نہیں رہتی ۔

کئی مرتبہ جب ہم دونوں گھر کے متعلقہ کسی مسئلے پر بحث کر رہے ہوتے اور دفعتاً ہماری توجہ سمنہ کی طرف منعطف ہو جاتی جو کونے میں بیٹھی بڑی سنجیدگی سے ہماری باتیں سن رہی ہوتی تو معاً مجھے احساس ہوتا کہ ابھی وہ اٹھ کھڑی ہو گی اور کہے گی تم دونوں ہی بے وقوف ہو جو بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہو ۔

میرے اس ان کہے خیال کو محسوس کر کے سمنہ کی ماں بھی خاموش ہو جاتی

اور ہم دونوں بحث کو ادھورا چھوڑنے پر اظہار خیال کئے بغیر خاموش ہو جاتے ۔ اور پھر ہمارے دلوں میں سمنہ کی موجودگی کا احساس بڑھتا ۔ بڑھے جاتا ۔ حتٰی کہ تمام کمرا سمنہ سے بھر جاتا ۔ پھر نہ جانے کیوں سمنہ ہماری خاموشی پر مضطرب ہو جاتی تھی ۔ شاید وہ یہ محسوس کرتی ہو کہ ہماری خاموشی اس کی وجہ سے ہے ۔ بہر حال وہ رونے لگتی ؟ اور اس کی آواز سن کر ہمیں تسلی ہو جاتی کہ وہ محض بچی ہے ۔ پھر ہمیں اطمینان ہو جاتا ۔

دو سال کے عرصہ میں سمنہ نے صرف چار ایک باتیں سیکھی تھیں ۔ ممکن ہے وہ اس کے علاوہ اور باتیں بھی کرنا جانتی ہو ۔ مگر چونکہ فطری طور پر وہ تنہائی پسند اور کم گو واقع ہوئی تھی ۔ اس لئے شاید اس کی اور باتیں ہم نے سنی ہی نہ ہوں ؟

جب میں دفتر سے آتا تو دروازے میں داخل ہوتے ہی سمنہ کی آواز سنائی دیتی ابا کہتے وقت اس کا روئے سخن میری طرف نہیں بلکہ ماں بہن یا بھائی کی طرف ہوتا تھا ۔ جیسے وہ انہیں میری آمد کی اطلاع دے رہی ہو ۔ ابا کہنے کے بعد وہ دیوار کی طرف منہ موڑ کر مسکراتی اور مسکرائے جاتی ۔

یا جب کبھی میں گھر پر کام میں اس قدر مصروف ہوتا کہ سمنہ کی موجودگی کے احساس سے قطعی بیگانہ ہو جاتا تو آہستہ آہستہ اُس کی آواز ابھرتی "ابا، ابا، ابا، ابا" اور وہ مسلسل طور پر ابا ابا کہے جاتی ۔ تا وقتیکہ میں اس کی طرف نہ دیکھتا یا اسے جواب نہ دیتا ۔ لیکن جونہی میں اس کی طرف دیکھتا وہ شرما جاتی اور منہ موڑ لیتی ۔ اگر اس کی ماں یا ہمیں سمنہ کی طرف غور سے یا ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے تو وہ چڑ جاتی اور غصے میں چلّاتی ۔ "نہ کر"۔

ثریا اور جاجی کی نگاہوں سے وہ قطعی طور پر نہ گھبراتی تھی ۔ اس لئے انہیں دیکھنے سے منع کرنے کی اسے ضرورت نہ پڑتی تھی ۔ لیکن اپنی امی اور میری نگاہوں کو گویا وہ برداشت نہ کر سکتی تھی ۔ اور اس بات پر اکثر چڑ کر روٹھ جاتی تھی ۔ بہر حال اس کے سوا اس نے کبھی کوئی اور بات نہ کی تھی ۔

ہاں ! ان باتوں کے علاوہ وہ اکثر بسکٹ مانگا کرتی تھی ۔ اور اگر اسے کسی وقت بسکٹ کا خیال آ جاتا تو وہ حسب عادت "بچّھی ، بچّھی ، بچّھی" کہے جاتی اور

اس وقت تک پچھی کی رٹ بند نہ کرتی جب تک اسے بسکٹ نہ مل جاتا ۔ لیکن جب تک وہ ایک بسکٹ اپنے بھائی اور بہن کو نہ دے لیتی خود نہ کھاتی ۔

سمنہ کی پرورش پر ہم نے خصوصی توجہ نہ دی تھی ۔ خصوصی توجہ کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا تھا ۔ کیونکہ ہمارا گھر عام سے اوسط درجے کا گھرانہ ہے ۔ جہاں بچوں کی پرورش نہیں کی جاتی ؟ بلکہ جہاں بچے پل جاتے ہیں ۔ جہاں بچوں کو کپڑے نہیں پہنائے جاتے ؟ بلکہ ان کا تن ڈھانپا جاتا ہے ۔

سمنہ بھی ہمارے گھر میں پل رہی تھی ۔ اور اسی طرح دو سال کی ہو چکی تھی ۔ اس کی ماں کسی وقت حیرانی سے اس کی طرف دیکھتی اور مجھے کہتی "دیکھو تو ذرا سمنہ کی طرف ، یہ تو پل گئی ہے" اور پھر ہم دونوں اس کی طرف دیکھتے اور وہ چلانے لگتی ۔ "نہ کر ۔ نہ کر"۔

ہمارے ہاں چار ایک بچے ہوئے تھے اور وہ سب یونہی گھر میں پل گئے تھے ۔ ایک دو فوت بھی ہو چکے تھے ۔ چار ایک دن ان کی ماں نے آنسو بھی بہائے ، ان کے کپڑے جوتے اور کھلونے سامنے رکھ کر وہ روتی بھی رہی تھی ۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ خاموش ہو گئی تھی ۔ اور پھر نئے بچوں کو کلوٹ باندھنے اور اُن کے لئے دودھ کی بوتل تیار کرنے میں مصروف ہو گئی تھی ۔

گھر میں سمنہ کی کوئی خصوصی حیثیت نہ تھی ۔ اس کے منہ پر بھی باقی بچوں کی طرح مَیل لگا رہتا تھا ۔اس کے گرد بھی موٹے اور بھدے کپڑے لپٹے رہتے تھے ۔ اور وہ بھی کونے میں بیٹھ کر روتی رہتی اور یا توجہ اپنی طرف مبذول کروانے کے لئے ای ای ای ای ۔۔۔۔ کی مسلسل رٹ لگائے رہتی اور یونہی وہ پلتی گئی ۔۔۔ اور پھر وہ ایک دن دفعتاً مر گئی ۔

اس کی موت کی تفصیلات معمولی اور مختصر تھیں ۔

موسم سرما میں وہ ایک رات دفعتاً رونے لگی "پچھی پچھی پچھی" ۔ اتفاق سے اس وقت گھر میں کوئی بسکٹ نہ تھا ۔ پہلے تو ہم نے بات ٹالنے کی کوشش کی لیکن جلد ہی مجھے احساس ہوا کہ بسکٹ لائے بغیر چارہ نہیں ۔ کافی رات جا چکی تھی پھر بھی مجھے امید تھی کہ بسکٹ کہیں نہ کہیں سے مل جائیں گے ۔ میں اُٹھ بیٹھا ۔"میں جاؤں گا"۔

جب میں باہر جانے لگا سمنہ چلائی "ابا" میں رک گیا ۔ میں نے کہا بیٹی میں بسکٹ لانے جا رہا ہوں ۔ دوبارہ میں دروازے کی طرف بڑھا تو وہ پھر چلائی ۔۔۔ "ابا" نہ جانے کیوں ۔ میں پھر رک گیا میں سمجھا وہ میرے ساتھ جانا چاہتی ہے ۔ حالانکہ میں عام طور پر چھوٹے بچے کو بازار نہیں لے کر جاتا ۔ میں نے اسے اٹھا لیا ۔ وہ خاموش ہو گئی ۔ اور ہم دونوں بسکٹ لینے کے لئے چلے گئے ، ٹرنکوں والا بازار بند تھا ۔ اردو بازار بند تھا ؟ بوہڑ بازار بند تھا ؟ راجہ بازار میں دو دو کانیں کھلی تھیں اور وہاں سے بسکٹ مل گئے ۔ سمنہ اور میں واپس آ گئے ۔

اگلے روز وہ بیمار پڑ گئی ۔ ڈاکٹر نے کہا نمونیہ ہے ۔ اس کی ہدایات کے مطابق دوائی دی گئی ۔ رات کو برانڈی کی خاطر ہم نہ جانے کہاں کہاں گھومتے پھرے ۔ ایک شیشی مل گئی ۔ رات کو سمنہ کی سانس اکھڑ گئی ۔ اس کی ماں اور میں دونوں رات بھر اس کے سرہانے بیٹھے رہے اور صبح چار بجے اس نے آخری ہچکی لی ۔ اور وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی ۔ اس کی ماں نے میری طرف دیکھا ۔ میں نے سر جھکا لیا ۔ اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نکل کر بہہ گئے اگلے روز دس بجے تک ہم اسے دفنا آئے ۔

واپس آئے تو اس کی ماں رو رہی تھی ۔ میں نے کہا سعیدہ روؤ نہیں ۔ اس نے سر اٹھایا "تو کیا کروں" میں نے جواب دینا چاہا مگر کیا جواب دیتا ۔

اگلے روز وہ پھر رو رہی تھی میں نے کہا کب تک روؤ گی ؟

اُس نے آہ بھری اور کہا جب تک ، جب تک ۔۔۔ اور خاموش ہو گئی جیسے اسے معلوم نہ ہو کہ کب تک ۔ دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی ۔ بوجھل خاموشی ۔

پھر وہ کہنے لگی "مجھے یقین نہیں پڑتا ہے کہ وہ مر گئی ہے ۔"

اس سے کیا فرق پڑتا ہے ؟ میں نے کہا اور خود دفتر کام کرنے کے لئے چلا گیا ۔ اور دفتر سے واپس آیا تو دروازے میں داخل ہوتے ہی میں رک گیا ۔ گویا اپنی آمد کا اعلان سننا چاہتا تھا ۔ لا حول ولا قوۃ ۔ میں نے چپکے سے اپنی جذبات پرستی کو کوسا ۔

رات کو پھر سے ہماری بحث شروع ہو گئی ۔ میں نے سعیدہ سے کہا بے وقوف نہ بنو یہ صبح و شام کا رونا اچھا نہیں ۔"بے وقوف نہ بنو" مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ مشورہ میں اپنے آپ کو دے رہا تھا ۔ اس کے باوجود میں اسے مشورے دیئے جا رہا تھا ۔ اسے سمجھا رہا تھا ۔ بحث کے دوران ہم دونوں نے بیک وقت اس کونے کی طرف غور سے دیکھا جہاں سمنہ بیٹھی ہوتی تھی اور دونوں چپ ہو گئے ۔

دو ایک ساعت کے لئے میں خاموش رہا پھر میں نے شدت سے اپنی حماقت کو محسوس کیا اور لا حول پڑھ کر پھر سے بحث چھیڑنے کی کوشش کی ۔ لیکن میرے دل میں خواہ مخواہ یہ احساس بڑھتا جا رہا تھا کہ وہ کونہ خالی ہے ۔ وہاں ایک خلا ہے ۔ وہ خلا بڑھنے لگا ۔ وہ خلا چھائے جا رہا تھا ۔ ہم سب کو اپنی آغوش میں لئے جا رہا تھا اور میں محسوس کر رہا تھا جیسے ہمیں یہ احساس دلانے والا کوئی نہیں کہ ہم دونوں بے وقوف ہیں جو بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں ۔ میں لکچر دیئے جا رہا تھا ؟ وہ میرے منہ کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ جیسے میرے زبانی جمع خرچ کے باوجود سمجھ رہی ہو ۔ یک لخت مجھے احساس ہوا کہ وہ میری بات نہیں سن رہی بلکہ مجھے عجیب نگاہوں سے گھور رہی ہے ۔ میرا جی چاہا کہ میں چلا کر کہوں ۔ نہ کر ۔ اچھا۔ میں نے کھسیانے ہو کر کہا "نہیں مانتی تو نہ سہی ۔ رو ۔ رو ۔ روتی رہ ۔ ہم جا رہے ہیں ۔ گھومنے پھرنے کے لئے ۔ اور میں باہر چلا گیا اور سڑکوں پر گھومتے ہوئے سوچنے لگا ۔ اب میں کیا کروں ۔ کہاں جاؤں ۔

سمنہ کے مرنے کے بعد جلد ہی ہم نے وہ مکان بدل لیا تاکہ اس کونے سے مخلصی ملے اور نئے مکان میں جا کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اس لئے کہ وہاں وہ کونہ نہ تھا ۔

سمنہ کو مرے ہوئے پندرہ دن گذر گئے ۔ ایک مہینہ گذر گیا اور گھر کے کونوں کے خلا آہستہ آہستہ پر ہوتے گئے ۔ دفتر سے واپسی پر میں اپنی آمد کے اعلان کی ضرورت سے بے نیاز ہوتا گیا ۔ اور آپس میں بحث کرتے ہوئے دفعتاً چپ ہونے کی عادت سے ہم مخلصی پاتے گئے ۔ یوں آہستہ آہستہ سمنہ ہمارے گھر سے خارج ہوتی گئی ۔ خارج ہو گئی ۔ اب سمنہ کی صرف ایک یادگار باقی رہ گئی

تھی ۔ ہر جمعرات کے دن ثریا اور جاجی بسکٹوں کا ایک پیکٹ بغل میں دبا لیتے ۔ ہاتھ میں دودھ کی گڑوی اٹھا لیتے اور باہر نکل جاتے ان کی ماں صحن میں چوکی پر بیٹھ کر ان کی واپسی کا انتظار کرتی اور وہ واپس آکر غصے میں چلاتے "امی کوئی بچہ بھی تو دودھ نہیں پیتا ۔ بسکٹ وہ کھا لیتے ہیں مگر دودھ نہیں پیتے ۔ امی وہ سمنہ کا دودھ کیوں نہیں پیتے ۔ امی وہ بسکٹ لیتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں ؟ جیسے جیسے اِن بسکٹوں میں کچھ پڑا ہو ۔ اور امی کی آنکھیں بھیگ جاتیں ۔ اور وہ انہیں گڑوی دے کر پھر سے باہر بھیج دیتیں "تم جاؤ تو شاید کوئی بچہ پی لے" اور خود رونے لگتی ۔

سمنہ کا چالیسواں بھی ہو گیا اور وہ بسکٹ اور دودھ کی بات بھی ختم ہو گئی ۔

دو ماہ گزر گئے اور ہمارے ذہن سے سمنہ کا خیال قطعی طور پر نکل گیا۔

ایک روز میں کسی معمولی شکایت کی وجہ سے ڈاکٹر سے مشورہ کرنے چلا گیا ۔

ڈاکٹر حسب معمول بڑی بشاشت سے مریضوں کی دکھ بھری آپ بیتیاں سن رہا تھا ۔ جیسے وہ کہانیاں بے پناہ دلچسپی کا باعث ہوں ۔ میں نے اخبار اٹھا لیا ۔ اور پڑھی ہوئی خبروں کو از سرِ نو دیکھنے لگا ۔

نمونیہ ہے تو کیا ہوا ۔ گھبراؤ نہیں ابھی پنسلین کا ٹیکہ لگا دیتا ہوں ۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گا نمونیہ کا کیا ہے"۔

ڈاکٹر کی بات سنتے ہی میری نگاہوں تلے اخبار کے الفاظ گڈ مڈ ہو گئے ۔ میں نے سر اٹھایا کمرے میں سب اشکال دھندلی پڑتی جا رہی تھیں ۔ میں اٹھ بیٹھا ۔ ہسپتال سے باہر نکل گیا ۔ بازار اندھیرے میں لپٹا ہوا تھا ۔ سیاہ پانی پر بھدی اشکال تیر رہی تھیں ۔

کوئی بھیانک ہنسی ہنسا "نمونیہ کا کیا ہے" میری آنکھوں میں گویا خون اتر آیا ۔ اور میں بھاگا سامنے سے تانگا چلا آتا تھا ۔ گھوڑا یوں مجھے دیکھ رہا تھا ۔ جیسے مَیں ہی اس کا مطمحِ نظر تھا ۔ میں لپک کر ایک طرف ہو گیا ۔ اور لیٹر بکس کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا ۔ دیوار پر سینما کا پوسٹر لگا تھا ۔ خونی کپتان ۔ خونی ۔ خونی ۔ سُرخ حروف پھیلتے جا رہے تھے ۔ میں نے گھبرا کر نیچے دیکھا ۔ تصویر میں کپتان تلوار سنبھالے کھڑا تھا ۔ میں نے محسوس کیا گویا تلوار سے خون کے

قطرے گر رہے ہوں ۔ ٹپ ٹپ ٹپ میں نے گھبرا کر نیچے دیکھا لیٹر بکس خون آلود ہو رہا تھا ۔ میں بھاگا۔

"ابا ۔۔۔" بچے کی آواز سن کر میں رک گیا "آؤ آؤ میں نے دونوں ہاتھ بچے کی طرف پھیلا دیئے "کہاں ہے تمہارا ابا" بچہ رونے لگا ۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ سب میری طرف گھور رہے تھے ۔ سبھی بوڑھے جوان جیسے میں مجرم تھا ۔ میں اٹھ کر بھاگا ۔۔ "خونی خونی" وہ لاؤڈ سپیکر لئے ڈھونڈ رہے تھے اور میں بھاگا جا رہا تھا۔

گھر میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن میرے کپڑے لت پت ہو رہے تھے عجیب سی بو آ رہی تھی ۔۔۔ خون کی بو۔

سعیدہ صحن میں چوکی پر بیٹھی ہاتھ مل رہی تھی ۔ اماں کھڑکی کے پاس دیوار سے سہارا لگائے کھڑی تھی ۔ جاجی اور ثریا چپ چاپ سن رہے تھے ۔ "آگئے" سعیدہ نے میری طرف دیکھ کر کہا ۔ "مجھے سب پتہ چل گیا ہے" یہ سن کر میرے کپڑے اور بھی گیلے ہو گئے ۔ بو اور بھی تیز ہو گئی۔

"پتہ چل گیا ہے؟" میں نے دہرایا ۔ میری نگاہوں میں وہ سب دھندلے پڑنے لگے "ہاں" وہ بولی ۔۔ وہ مری نہیں ۔ بھلا یوں بھی مرتا ہے کوئی ، رات کی رات میں مر جانا ۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ وہ مری نہیں ۔ اور پھر بچوں نے سمنہ کے بسکٹوں کو منہ نہیں لگایا ۔ اور دودھ تو کوئی پیتا ہی نہ تھا ۔ صاف تو ہے لوگ اس کی چیز کیسے لیں جو مری نہ ہو ۔۔۔ دیکھتے کیا ہو ۔۔" وہ مجھے کھوئے ہوئے دیکھ کر بولی ۔۔۔ "وہ مجھ سے آپ کہہ کر گئی ہے آپ سمنہ"۔

میں نے گھبرا کر اماں کی طرف دیکھا ۔ اماں سہمی ہوئی کھڑی تھی ۔ بولی "ذرا آنکھ لگ گئی تھی سعیدہ کی ۔ ابھی آدھ گھنٹے کی بات ہے پھر یہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی"۔

"میں نے خود دیکھا ہے ان آنکھوں سے ۔ سوئی ہوئی تو نہ تھی میں ۔ اُس کونے میں بیٹھی تھی وہ ۔ وہاں" سعیدہ رونے لگی ۔

"ابا ۔۔۔" جاجی کی آواز سن کر میں چونکا "امی کہتی ہیں ہم سمنہ کی قبر پر

جائیں گے ۔

"ہاں میں تو جاؤں گی ابھی" وہ اٹھ بیٹھی ۔ چاہے میرے ساتھ کوئی چلے نہ چلے ۔ اماں چپ چاپ اس کے پیچھے ہو لی ۔ جاجی اور ثریا خاموشی سے چل پڑے ۔ میرا جی چاہتا تھا ۔ میں چلا کر کہوں تم پاگل ہو ۔ لیکن میرے منہ سے کچھ بھی نہ نکل سکا اور وہ قافلہ چپ چاپ باہر نکل گیا ۔

پاگل ۔ میرے منہ سے چیخ سی نکلی ۔ پڑوسی کا کتا قہقہہ مار کر ہنسنے لگا ۔

'پاگل پاگل'

دیوار‌یں میری طرف دیکھ رہی تھیں ۔ کھڑکیاں منہ چڑا رہی تھیں ۔ گھر بھر کے کونے کمروں سے نکل کر باہر آ گئے تھے ۔ خالی کونے ؟ خلا ؟ دروازے نے اپنے جبڑے کھول دیئے ۔ پانی کی مٹکی پھولنے لگی "پاگل پاگل" ۔میں نے اپنے آپ سے کہا ۔ اب کی بار کتے نے قہقہہ لگایا۔

"ابا ابا ابا ابا ۔۔۔۔" چاروں طرف سے آواز‌یں سنائی دینے لگیں اور میں گھبرا کر قبرستان کی طرف بھاگا۔

سعیدہ سمنہ کی قبر کے سرہانے بیٹھی تھی ۔ جاجی جھک کر آواز‌یں دے رہا تھا "سمنہ سمنہ" اماں بڑی سنجیدگی سے کھڑی سمنہ کا جواب سننے کی کوشش کر رہی تھی ۔ ثریا چپ چاپ کھڑی تھی ۔

"وہ ضرور جواب دے گی" سعیدہ نے کہا ۔ "اماں تم آواز دو جاجی کی آواز سمنہ تک نہیں پہنچتی ۔" اماں جھکی "سمنہ" اس نے پکارا۔

غصے سے میں بھوت بن گیا۔آگے بڑھ کر میں نے اُن کی طرف دیکھا "تم سب پاگل ہو" ۔ میں ان سے کہنا چاہتا تھا ۔ لیکن غصے میں دیکھنے کے علاوہ اور میں کچھ نہ کر سکا ۔ پھر میں نے خاموشی سے بازو اٹھایا اور ان کے روبرو جا کھڑا ہوا اور پھر غصے میں میری آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے ۔ اور گھر کی طرف انگلی کر کے میں نے انہیں واپس جانے کے لئے اشارہ کیا۔

وہ سب مجھے دیکھ کر ڈر گئے اور چپ چاپ گھر کی طرف چل پڑے ۔ اماں نے سعیدہ کو سہارا دے رکھا تھا ۔ جاجی اور ثریا ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے چپ چپ جا رہے تھے ۔

دفعتاً میں بیٹھ گیا ۔ سمنہ کی قبر کے سرہانے بیٹھ گیا ۔ جھکا اور میں نے
بے ساختہ آواز دی ۔ سمنہ ۔ سمنہ ۔ اور پھر خاموش ہو کر اس کا جواب سننے لگا۔

.... ○....

گوبر کے ڈھیر

اسے دیکھ کر سڑک کے موڑ پر سائیکل سوار نوجوان رک گیا ۔ اس نے دونوں پاؤں زمین پر ٹیک دیئے اور پھر اتر کر یوں سائیکل کی طرف دیکھنے لگے جیسے چلتی چلتی بگڑ گئی ہو ۔ ۔ وہ نوجوان کی طرف دیکھ کر مسکرا دی ۔ اور پھر حسب معمول گہناں سے بات کر کے ہنسنے لگی ۔ یہ کوئی پہلا موقعہ نہ تھا ۔ اکثر نوجوانوں کی سائیکلیں چلتے چلتے بگڑ جایا کرتی تھیں ۔ پیدل چلنے والے یا تو دفعتاً وہاں رک جاتے یا ان کی چال مدہم پڑ جاتی ۔ وہاں پہنچ کر کوئی مونچھ مروڑنے لگتا کوئی آنکھیں چمکاتا ۔ کوئی گھبرا کر اپنے ساتھی کو کہنی مارتا ۔ کوئی باآواز بلند گانے لگتا ۔

"ہمیں چھوڑ کے چلے تو نہیں جاؤ گے ؟ دل توڑ کے" اور سروری ایک انداز بے نیازی سے گہناں سے باتیں کرتے ہوئے ہنسے جاتی ۔

اس وقت سروری کے احساسات عجیب سے ہوتے تھے ۔ جیسے وہ قوس وقزح کے رنگین جھولے پر بیٹھی ہو ۔ جیسے وہ کسی پہاڑی ندی کی طرح رقص کئے جا رہی ہو اور ڈھلان پر اگے ہوئے درخت جھک جھک کر اس کی طرف دیکھ رہے ہوں ۔

پھول مسکرا رہے ہوں ۔ ٹہنیاں اشارے کر رہی ہوں ۔ جھاڑیاں سر جوڑ کر اس کے متعلق باتیں کر رہی ہوں ۔ اور کائنات اس کے مبہم اشارے کی منتظر ہو ۔

ان مبہم احساسات پر اس کی آنکھیں مستی سے ڈولتیں ۔ ہونٹوں کے خم میں سے تبسم جھانکنے لگتا ۔ اور باہیں پھولدار شاخوں کی طرح جھولتیں ۔

"سروری ۔ سروری ۔"

ماں کی آواز سن کر وہ چونکی ۔

"بیٹی کپڑے پہن لو"۔ نیچے صحن سے آواز آئی ۔ "سنا تم نے"
اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ کافور ہو گئی ۔ اور اس نے گوبر کی بو کا ایک ریلا محسوس کیا ۔ سڑک اس کی نظر میں دھندلی پڑ گئی۔
رنگوں کا وہ جھولا ٹوٹ کر لٹکنے لگا ۔
اس نے ہاتھ سے اپنا سینہ تھام لیا ۔
"جواب نہیں دیتی" ماں کی آواز ملائمت سے خالی ہو چکی تھی ۔
"سن لیا ہے"۔ گہناں نے سروری کو خاموش دیکھ کر جواب دیا۔
"کہاں گئی ہے" اماں غرائی ۔
"اوپر گئی ہے" گہناں بولی ""جواب تو دے دیا کر" سروری سے مخاطب ہو کر اس نے مدہم آواز میں کہا ۔
"سن تو لیا ہے" ۔ وہ چڑ کر چلائی ۔ اور پھر ماتھے پر ہاتھ مار کر گہناں کے پاس بیٹھ گئی ۔
گہناں تیوری چڑھا کر بولی "کیا ہو جاتا ہے تجھے ؟ مری کیوں جاتی ہے ؟"
"روز کی مصیبت" سروری نے منہ بنایا۔
گہناں بولی ۔ "یہیں تو جانا ہے محلے میں۔"
سروری نے یوں ہونٹ بسورے جیسے کوئی جونک منہ پھاڑ رہی ہو ۔
"ہونہہ نخرو ۔" گہناں نے ناک چڑھائی ۔
نہ جانے اماں کے منہ سے "کپڑے پہن" سن کر سروری کو کیا ہو جاتا تھا ۔ دفعتاً اس کی تمام رنگینی اور لطافت ختم ہو جاتی ۔ اس کے دل پر کسی بے نام خوف کا بوجھ پڑ جاتا ۔ اور اس کا جی چاہتا کہ کپڑے پہننے کی بجائے کسی کونے میں چھپ کر رو دے ۔ اس وقت اس کے دل میں ماں کے خلاف شدید جذبہ بیدار ہو جاتا ۔ اماں ! نفرت سے اس کا دل کھولنے لگتا ۔ اور اس کی نظر میں ماں یوں دکھائی دیتی جیسے کوئی ڈائن ہو ۔ اس وقت اس میں شدید آرزو پیدا ہوتی کہ وہ اس گھر سے بھاگ جائے ۔ اماں سے دور ۔ جہاں کوئی ٹانگے والا آ کر دروازہ نہ کھٹکھٹا سکے ۔ اور جہاں اماں کی وہ جونک سی ملائم آواز "کپڑے پہن لے" سنائی نہ دے ۔ اس وقت اس کی نگاہ سامنے مکان کی ڈیوڑھی پر مرکوز ہو جاتی ۔ جہاں

وہ داڑھی والا معزز آدمی رہتا تھا۔ جو روز رات گئے سر جھکائے ہوئے گلی میں سے گزرتا تھا۔ اور پھر اپنے دروازے پر پہنچکر گہری آواز میں پکارتا۔ سرور۔ اس کی آواز سن کر سروری کا دل ڈوب جاتا۔ لیکن جلد ہی وہ اس "ابھرتی لہر" سے چمٹ کر تیرنے لگتی۔ اور محسوس کرتی جیسے وہ کنارے سے جا لگی ہے محفوظ ہو گئی ہے۔ اماں کا وہ مکان اس کی نگاہ میں ایک طوفانی بھنور نظر آنے لگتا۔ جس کے سامنے اس پڑوسی کی ڈیوڑھی ساحل کی طرح پھیل جاتی اور وہ ساحل اس کی طرف رینگنے لگتا۔ قریب اور قریب اور قریب۔ سروری کا جی چاہتا کہ وہ اس رینگتے ہوئے ساحل سے چمٹ جائے۔ اور اس "کپڑے پہن لو" کے طوفان سے محفوظ ہو جائے۔ اس معزز پڑوسی کو دیکھ کر سروری کے دل میں گذشتہ واقعات کی یاد تازہ ہو جاتی۔

مادھو پور کے قریب پہاڑی کی سرسبز ڈھلوان پر وہ چھوٹا سا گاؤں اور گارے سے لپا ہوا وہ وسیع مکان۔ جس میں ایک طرف بیل بندھے ہوتے اور صحن میں اس کی اپنی بکری، جس کے ارد گرد مرغیاں دانے دُنکے کریدنے میں لگی رہتیں۔ ادھر دو کوٹھڑیوں میں وہ خود رہتے تھے۔ ابا، اماں، بھائی اور وہ خود۔ باہر دور تک سرسبز کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ جن میں دھارا بہتا ہوا چلا جاتا تھا۔ اُدھر ٹیلے پر پکی سڑک سفید فیتے کی طرح دور تک بل کھاتی ہوئی چلی جاتی تھی۔ جس پر سائیکل سوار آتے جاتے رہتے تھے لیکن اس موڑ پر ان کی سائیکل ذرا نہ بگڑتی تھی۔ نہ وہ پاؤں زمین پر ٹیکتے اور نہ اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے۔ راہگیر رکے بغیر اپنی راہ چلتے رہتے اور وہ دور تک انہیں جاتے دیکھتی رہتی اور پھر اکتا کر صحن میں اپنی بکری کے پاس جا کھڑی ہوتی اور مرغیوں کو بکری سے دور ہٹانے میں مشغول ہو جاتی۔

"سروراں" اس کے باپ کی گہری بھرپور آواز سنائی دیتی۔ اس کا دل کسی نامعلوم ڈر سے ڈوب جاتا۔ ایک ساعت کے لئے وہ بے حس و حرکت کھڑی رہتی اور پھر سر جھکائے چپ چاپ باپ کے پاس جا کھڑی ہوتی۔ اور پھر باپ کی بات سننے کے بعد واپس اسی جگہ آ کر سڑک پر چلتے ہوئے راہ گیروں کو دیکھنے میں کھ جاتی۔

"سروراں" ماں کی آواز سن کر یوں بے پروائی سے کھڑی رہتی جیسے کسی نے بلایا ہی نہیں ۔ "سروراں ۔ اب تو تنور میں اپلے ڈالے گی یا نہیں" ماں دور بیٹھی چیختی رہتی ۔ لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوتا ۔ حتیٰ کہ وہ آکر اسے بازو سے پکڑ لیتی ۔ "کام بھی کرے گی یا سارا دن یہیں کھڑی رہے گی ۔"

"ماں میں کپڑے پہنوں گی" ۔ وہ بسورنے لگتی ۔

"کپڑے پہنے گی ۔ ذرا شکل تو دیکھ اپنی ۔ چل" ماں اس کی کمر میں ایک لات دیتی اور وہ بسورتی ہوئی چلی جاتی ۔

"کیوں روتی ہے" اندر سے ابا کی آواز آتی ۔

"کہتی ہے نیا کرتہ پہنوں گی ۔ صورت تو دیکھ ذرا ۔ کام نہ کاج ۔۔۔ کپڑے پہنوں گی" ماں چلانا شروع کر دیتی ۔

ابا داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آجاتے ۔ "اب تو چھوڑ بھی اسے" اور سروری بھاگ کر ابا کے مضبوط بازوؤں میں لٹک کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیتی ۔ اس زمانے میں اسے کپڑے پہننے کا کس قدر شوق تھا ۔ جی چاہتا تھا روز نئے کپڑے پہنے لیکن اس کی اپنی ماں اس بات پر اسے پیٹتی رہتی تھی ۔ اس زمانے میں اسے معلوم نہ تھا کہ کپڑے پہننے کا کیا مطلب ہوتا ہے ۔ لیکن اب وہ جانتی تھی ۔ وہ ماں کتنی اچھی تھی ۔ اسے اب معلوم ہوا تھا ۔ اس وقت تو وہ اسے کوستی رہا کرتی ۔ اب یہ اماں ۔ یہ ڈائن "کپڑے پہن لے بیٹی" ۔ غصے سے اس کی کنپٹیاں بجنے لگتیں ۔ دور گلی میں وہ داڑھی والا معزز آدمی ۔ چوڑے سینے پر سیاہ نوک دار داڑھی تھامے آہستہ آہستہ چلا آتا ۔ کس قدر آہستہ رفتار سے آتا تھا ۔ سروری کا جی چاہتا تھا کہ بھاگ کر اس کی باہوں میں لٹک جائے ۔ اور اپنے آپ کو کپڑے پہننے سے محفوظ کر لے ۔

پھر ماں نے کہنا شروع کیا تھا کہ لڑکی جوان ہو گئی ہے ۔

"جوان ہو گئی ہے اپنی سروری" ۔

"اے ہے تمہیں اپنی سروری کا بھی فکر ہے کچھ"

"لو گھر میں بیٹی جوان ہو رہی ہے اور تمہیں کچھ پتہ ہی نہیں"

"میں کہتی ہوں کہ لڑکی کے کپڑے لتے کی فکر کرو کچھ" ۔

پہلے تو ابا کھنکار کر چپ ہو جاتے ۔ پھر وہ "اہم" کہہ کر داڑھی کو ہاتھ میں لے کر سوچنے لگتے اور بالآخر مدہم آواز میں ماں سے باتیں کرنے لگتے ۔ سروری حیران تھی کہ آخر اسے کیا ہوا تھا ۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا ۔ وہ پہلے کی طرح اب بھی تنور میں اپلے ڈالتی تھی ۔ مرغیوں کو روٹی کھلاتی تھی ۔ اور منڈیر پر کھڑی ہو کر سڑک پر چلتے راہ گیروں کو تکتی رہتی تھی ۔ جوان کہاں ہوئی تھی ۔ خواہ مخواہ ماں نے پاکھنڈ مچا رکھا تھا ۔ لیکن اس کے باوجود ماں سے یہ بات سن کر اس کے دل میں ہلچل سی پیدا ہو جاتی ۔ ابا کے سامنے جاتی تو بے سوچے سمجھے ایڑیاں اٹھا کر چلتی ۔ اور ماں کے سامنے اس کا سینہ آپ ہی آپ ابھر جاتا ۔ نہ جانے کیوں ۔

اُسے معلوم نہ تھا کہ جوان ہونے سے کیا ہوتا ہے ۔ لیکن اسے جوان ہونے کی بڑی خواہش تھی ۔ جوان ہو کر سبھی لڑکیاں ایسے اچھے اچھے کپڑے پہنا کرتی تھیں ۔ ہاتھوں پر مہندی لگایا کرتی تھیں ۔ گاؤں کے لڑکے ان کی طرف مسکرا کر دیکھا کرتے اور وہ شرما کر چھپ جایا کرتیں ۔

سروری کا بھی جی چاہتا تھا کہ کوئی اس کی طرف یوں مسکرا کر دیکھے اور وہ شرما کر چھپ جائے لیکن اس کی طرف کوئی نہ دیکھتا تھا ۔ حالانکہ وہ بار بار شرما کر چھپ جاتی تھی ۔ لیکن ایسے شرمانے سے فائدہ جب کوئی دیکھنے والا ہی نہ ہو ؟ ماں نے تو خواہ مخواہ شور مچا رکھا تھا "جوان ہو رہی ہے ہونہہ!" اپنی کنیزاں کتنی جوان تھی ۔ سبھی اس کی گلی سے گزر کر کھیتوں کو جاتے تھے ۔ اور کنیزاں کے پاس پہنچکر رک جاتے ۔ بالکل ویسے ہی جیسے اس زمانے میں ان کے اپنے مکان کے ساتھ چلتی سڑک کے موڑ پر ہر کوئی رک جاتا تھا ۔

اس زمانے میں اسے کس قدر شوق تھا کہ چلتے پھرتے لوگ اس کی طرف دیکھ کر رک جائیں ۔ اب بھی اسے اس بات پر کس قدر مسرت ہوتی تھی ۔ اگرچہ وہ اب شرمانے کی بجائے مسکرایا کرتی تھی ہنس ہنس کی باتیں کیا کرتی تھی ۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ اسی طرح کھڑکی میں کھڑی رہے اور راہ چلتے لوگ اس کی طرف دیکھ کر ٹھوکریں کھاتے رہیں ۔ ان کا منہ حیرانی سے کھل جائے ۔ آنکھوں سے مسکراہٹ ٹپکے ۔ ہونٹ ہلیں ۔ سائیکل رک جائے ۔ اور پھر یہاں

تو شہر کے لوگ ٹھوکریں کھاتے تھے ۔ سوٹ اور ٹائی پہنے ہوئے کالج کے لڑکے ۔ سفید پتلون پہنے بابو ۔ اچکن میں ملبوس پھرتیلے نوجوان ، جانے یہ لوگ ٹھوکریں کھانے کے سوا اور کچھ کر بھی سکتے تھے یا نہیں ۔ ہر مرتبہ جب وہ کپڑے پہن کر تانگے میں سوار ہو کر جاتی تو اس کو ایسا لگتا کہ ٹھوکریں کھانے والوں میں سے کسی ایک کو ملنے جا رہی ہے ۔ اس کا دل شوق سے دھڑکتا ۔ مگر یہ اس زمانے کی بات تھی جب وہ نئی نئی اماں کے گھر آئی تھی ۔ اب تو وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ منزل پر پہنچ کر اس سے کون ملے گا ۔ جونک کی طرح لٹکے ہوئے ہونٹ ، سرخ آنکھیں اور پھیلا ہوا گوبر کا ڈھیر اور بو. اف اس خیال کے آتے ہی اسے وہ دن یاد آجاتا جب بیٹھے بیٹھے گاؤں میں دفعتاً شور مچ گیا تھا ۔ وہ آگئے وہ آگئے ۔ اور فضا میں پٹاخے پھٹنے کے ساتھ چیخ و پکار کی ایک قیامت بپا ہو گئی ۔ اور وہ اٹھ بھاگی تھی ۔ ننگے پاؤں کھیتوں میں ۔ اس پکی سڑک سے دور ۔ بہت دور ۔ پھر وہ اس گوبر بھرے گڑھے میں چھپی رہی تھی ۔ جس پر پھوس کی چھت پڑی تھی ۔

پہلے چار ایک گھنٹے تو وہ گوبر کے ڈھیر کے پیچھے چھپی رہی اور فضا میں چیخوں اور پٹاخوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں ۔ پھر بھاری قدموں کی آواز سے ڈر کر وہ ایک ڈھیر میں گھس گئی ۔ پاؤں کی چاپ اس کے قریب آ پہنچی ۔ اور پھر آہستہ آہستہ مدہم ہو گئی ۔ لیکن وہ گوبر میں گھسی رہی ۔ صرف منہ کا ایک حصہ باہر تھا ۔ اس کے گرد چاروں طرف گوبر کا آسمان پھیلا ہوا تھا اور بُو بھری کائنات جس پر موت کا سا سکوت طاری تھا ۔ اگرچہ کبھی کبھار پٹاخوں کی آوازیں آتیں اور پھر ایک چیخ ۔ اور پھر وہی سکوت ۔ گوبر کا آسمان ، گوبر کی دیواریں ، گوبر کا دریا ، اور بُو میٹھی مدہم بو ۔

پھر وہ اس گوبر کے ڈھیر سے نکل آئی تھی ۔ اور گوبر کے ڈھیر کی دوسری جانب سے ایک ٹانگ نکل آئی تھی ۔ اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا تھا ۔ لیکن اس میں بھاگنے کی سکت بھی تو نہ تھی وہ دیوار سے چمٹ گئی ۔ گوبر کا وہ تودہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک واضح صورت اختیار کر گیا۔

"کالا" وہ چلائی ۔

کالا اسے دیکھے بغیر دھڑام سے زمین پر گر پڑا اور کراہنے لگا ۔ اس کی ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا

"پانی ۔ پانی۔" اس نے چلانا شروع کیا۔

سروری نے گاؤں کے بھنگی کالے کی طرف دیکھا ۔ اور پھر بے بسی میں ادھر ادھر پانی تلاش کرنے لگی ۔ اس کی بے تاب آنکھیں ۔ آہستہ آہستہ مایوس ہو کر بے حس ہو گئیں ۔ اور کالے کی اضطراب بھری کراہ ۔ مدہم گنگناہٹ میں بدل کر معدوم ہو گئی ۔ سکوت ۔ موت ۔ اندھیرا۔

چیخوں کی آواز سن کر وہ جاگ پڑی ۔ پاس ہی کوئی چیخ رہا تھا ۔ لوہے کے ٹکڑے ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے ۔ ڈر کے مارے اس نے آنکھیں بند کر لیں ۔ "آگئے ۔ آگئے" کالے کی بھیانک آواز سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں ۔ وہ گھسٹ کر اس کے قریب آگیا تھا ۔اور قریب اور بالآخر اس سے چمٹ گیا تھا ۔ پہلے تو اس نے کالے سے پرے سرکنے کی کوشش کی ۔ لیکن آخر وہ پتھر بن کر بیٹھ گئی ۔ آوازیں مدہم ہوتے ہوتے پھر بند ہو گئیں ۔

وہ جاگ پڑی ۔ دو کالے ہاتھ اس سے چمٹے ہوئے تھے ۔ جیسے دو سنپولیاں ۔ جسم کو جونک سی لگی ہوئی تھی ۔ دور بہت دور موت کراہ رہی تھی ۔ زندگی چلّا رہی تھی ۔

سروری نے ایک خفیف سی جھرجھری لی ۔ اس کے علاوہ اس میں حرکت کرنے کی ہمت ہی نہ تھی ۔ کالا قریب تر ہوا جا رہا تھا ۔ نہ جانے ان ڈراؤنی آوازوں کو بھولنے کے لئے یا ٹانگ کے زخم کی شدید تکلیف سے بچنے کے لئے اور پھر دفعتاً اس کے اوپر ایک سیاہ سائبان سا تن گیا اور ایک آبنوسی کلہاڑا سا لپکا ۔ سروری کا دل خوف سے ساکت سا ہو گیا۔

پھر کیمپ میں وہ بوڑھا فوجی جس نے اسے اپنی حفاظت میں لے لیا تھا ۔ جو کیمپ سے اس کے لئے راشن لاتا ۔ وہی بڈھا رات کے سناٹے میں خاموش زبان سے سروری سے تسلّی اور ہمدردی کی بھیک مانگ رہا تھا ۔ حقارت سے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی ۔ ایک اور کالا اپنے کسی چھپے ہوئے زخم کی تکلیف کو فراموش کرنے کے لئے ضد کر رہا تھا ۔ ایڑیاں رگڑ رہا تھا ۔ ایک

ساعت کے لئے گزشتہ یاد اس کے دل میں تازہ ہو گئی ۔ وہ کالا سیاہ تنا ہوا سائبان اور اس میں وہ آبنوسی ۔۔۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں ۔ اس کا جسم یخ بستہ ہو گیا۔

پھر دو ایک بار وہی سائبان اور وہی جونک ، سنپولیاں اور گوبر کی بُو ۔ لیکن اب وہ اس بات سے قطعی بے نیاز ہو چکی تھی ۔ اب وہ اپنے پاکستان میں تھی ۔ جہاں پٹاخوں کی آواز آتی تھی نہ زندگی اور موت کی چیخ و پکار ۔ ہر کوئی اس سے ہمدردی جتاتا تھا ۔ ہر کوئی اس کی مدد کرنے کا خواہاں تھا ۔ اور پھر رات کے دھندلکے میں تاروں کی چھاؤں تلے کسی گوبر کے ڈھیر کے پاس اس سے ہمدردی کی بھیک مانگا کرتا تھا ۔ اور اپنے کسی دکھ کو مٹانے کی کوشش میں کسی جونک کا مُنہ اسے تلاش کرتا تھا ۔ اس وقت وہ گویا لکڑی کا ایک تختہ بن جاتی تھی ۔

کمپ کی نفسا نفسی میں صرف ایک بڑھیا تھی جو اس سے پیار کرتی تھی اور شہر سے اس کے کھانے کی چیزیں لایا کرتی تھی ۔ وہ بڑھیا اس سے کبھی ہمدردی کی طالب نہ ہوئی تھی ۔ اور سروری سمجھنے لگی تھی ۔ جیسے اس کی ماں پھر سے جی اٹھی ہے ۔ اسی لئے وہ اسے اماں کہا کرتی تھی ۔۔۔۔ جبھی تو ایک دن اماں کے اصرار پر وہ ہمیشہ سے اس کی بیٹی بن کر اس کے ساتھ رہنے پر رضامند ہو گئی تھی ۔ جب وہ نئی نئی اماں کے پاس آئی تو اماں کی محبت دیکھ کر حیران رہ گئی تھی ۔ اماں نے اس کے لئے کیسے اچھے اچھے کپڑے سلوائے تھے ۔ اس کی حیرانی پر گھناں مسکراتی "واہ جیسے جانتی ہی نہیں" اور سروری کی سمجھ میں نہ آتا کہ گھناں کا مطلب کیا ہے ۔

پھر ایک روز ماں نے اسے نئے کپڑے پہنائے ، عطر لگایا ، بال بنائے اور پاؤڈر سرخی لگا کر تانگے میں بٹھا کر لے گئی ۔ وہی گوبر کا ڈھیر ۔ میٹھی مدہم بُو ۔ اس روز اسے معلوم ہوا تھا کہ ماں بھی درحقیقت ایک جونک تھی ۔ ایک بوڑھی خرانٹ جونک ۔

اس روز جب وہ ڈری ہوئی لوٹی ۔ تو گھناں نے کہا بس اب چھوڑو بھی نخرے ۔ جیسے جانتی ہی نہ تھی ۔ بھولی بنتی ہے"۔

اس واقعہ کے بعد اس کا خواب ٹوٹ گیا ۔ اور وہ سوچنے لگی ۔ چاروں طرف کوئی بھی ایسا نہیں جو اسے گوبر کی بو سے بچا سکے ۔ ایسا کوئی بھی نہ تھا ۔ اسے ہر جگہ گوبر کا ڈھیر دکھائی دیتا ۔ جس میں سے کوئی نہ کوئی سیاہ جونک منہ نکالے اس کی طرف لپک رہی تھی۔

وہ اٹھی ۔ آسمان پر چاند ڈول رہا تھا ۔ یہاں وہاں افق کے قریب کالے بادلوں کے ٹکڑے عجیب لپکتی ہوئی شکلوں میں لٹک رہے تھے ۔ اس نے محسوس کیا جیسے تمام عمر اسے یہیں رہنا ہے ۔ اسی مکان میں اماں کے پاس ۔ گوبر کے اس ڈھیر تلے ۔ وہ منڈیر کے قریب جا کھڑی ہوئی ۔ اس نے گلی میں دیکھا ۔ ”کوئی ہے جو مجھے اس گوبر کے ڈھیر سے بچا سکے“۔

سامنے کوئی آرہا تھا ۔ مضبوط کشادہ جسم ۔ تراشی ہوئی داڑھی اور جھکا ہوا سر ۔ جیسے مسجد سے آرہا ہے ۔ اس کے دل میں امید کی کرن چمکی ”سرور“ معزز پڑوسی نے اپنے دروازے پر دستک دی ۔

اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا جیسے اس نے آواز پہچان لی ہو لیکن چند ہی دنوں میں اس نے محسوس کیا کہ اس کا پڑوسی تک پہنچنا بے حد مشکل ہے ۔

ان کا مکان محلے کے کونے پر بالکل تنہا تھا ۔ جس کے قرب و جوار میں کوئی مکان نہ تھا ۔ نزدیک ترین مکان اسی شخص کا تھا ۔ جو اس کے مکان کے متصل چار مکانوں کی جگہ چھوڑ کر مغرب کی طرف تھا ۔ ڈیوڑھی سے نکل کر وہاں تک پہنچنا تو ممکن ہی نہ تھا ۔ کیونکہ بڑی اماں یا تو ڈیوڑھی کو مقفل رکھتی ۔ اور یا خود وہاں چارپائی ڈال کر پڑ رہتی۔

پھر آہستہ آہستہ ریشمی کپڑوں ۔ پھولوں کے ہاروں ، عطر ، سفیدے اور سرخی نے اسے بھرما لیا اور راہ گیروں نے سڑک کے موڑ پر اسے دیکھتے ہوئے ٹھوکر کھا کر یا ساتھی کو کہنی مار کر یا سائیکل کو جھوٹ موٹ بگاڑ کر اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا ۔ اور اس کے دل میں نئی خواہشیں بیدار ہو گئیں ۔ اس کی مسکراہٹ رسیلی ہو گئی ۔ آنکھوں سے کنکھیوں سے باتیں کرنا سیکھ لیا ۔ اور چتونوں کے فن سے آشنا ہو گئی ۔ لیکن اس کے باوجود جب کبھی اماں کے حکم

سے وہ ٹانگے پر جاتی تو دفعتاً وہ تمام خوشبوئیں تمام کی تمام گوبر کا ڈھیر بن کر رہ جاتیں اور وہ جونک نما سائبان اور وہ بھیانک لپکتی ہوئی سنپولیاں ۔ اس کے بند بند میں کراہت اور درد کی لہریں اٹھنے لگتیں ۔

اس روز کپڑے پہنتے ہوئے اس کی آنکھوں سے ایک خوفناک عزم جھلک رہا تھا ۔ اس کا سینہ دھڑک رہا تھا۔

اماں چلّائی ''تو اب جلدی بھی کرے گی یا نہیں ۔ دیکھو تو کافی رات جا چکی ہے''۔

''ہو تو رہی ہوں تیار'' ۔ وہ دانت پیس کر بولی ۔

''کب سے ہو رہی ہے تیار تو؟'' پھر وہ گہناں سے بولی ۔ ''گہناں ، پھولوں کے گجرے دیدیئے ہیں نا اسے ۔ وہ بابو پھول بہت پسند کرتے ہیں ۔ تو پہنا دے اسے ۔ اور دیکھ میں جاتے ہوئے باہر تالا لگا جاؤں گی ۔ یہاں پاس ہی تو جانا ہے ۔ابھی لوٹ آؤں گی ۔ سمجھی ۔''

جب اماں دروازہ بند کر کے تالہ لگانے میں مصروف تھی تو دفعتاً سروری کو محسوس ہوا کہ اس سے بہتر موقع نہ ملے گا ۔ اللہ کرے وہ معزز شخص آ نکلے ۔ اللہ کرے ۔ مگر گلی ویران پڑی تھی ۔ جانے وہ کہاں تھا ۔ اس کا دل سینے میں اچھلا ۔ سامنے اس کی ڈیوڑھی کھلی تھی۔

''اے ہے اس تالے کو کیا ہو گیا ؟'' اماں بڑبڑا رہی تھی۔

وہ دبے پاؤں چل پڑی ۔ اور ایک جست لگا کر ڈیوڑھی میں جا پہنچی۔

ڈیوڑھی میں ایک طرف چارپائی کھڑی دیکھ کر وہ اس کے پیچھے چھپ گئی ''شکر ہے میرے اللہ'' اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اے ہے کہاں ہے تو'' بڑھیا چلائی ۔ سروری سروری کہاں چلی گئی'' بڑھیا کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔

سروری نے سانس بند کر لیا ۔ ''یااللہ یااللہ'' اس نے چھت کی طرف دیکھا ۔ اماں کی آواز مدہم پڑتی گئی ۔ ''ایک مرتبہ اس بڑھیا سے بچا لے مجھے'' اس نے دعا مانگی ''صرف ایک بار یااللہ''

اُسے ایسے محسوس ہوا جیسے اسے وہاں بیٹھے مہینوں گزر گئے ہیں ۔ ٹک ٹک

ٹک اندر سے گھڑی کی آواز سنائی دے رہی تھی ۔ دھک دھک ۔ اس کا دل بج رہا تھا ۔

"اے ہے حد ہو گئی" ۔ بڑھیا کی آواز پھر سنائی دی ۔ سروری نے پھر ہاتھ جوڑ دیئے ۔ بڑھیا کے پاؤں کی چاپ قریب آتی گئی ۔ قریب اور قریب ۔ دھک سے دروازہ بجا اور وہ دروازے میں آگئی ۔ "بابو جی ۔ اے بابو جی" سروری کا بدن تختہ بن چکا تھا۔

"کیا ہے" داڑھی والا معزز پڑوسی باہر نکل آیا ۔ "کیا ہے؟"

"لڑکی یہاں تو نہیں آئی؟"

"نہیں تو" ۔ وہ بولا۔

"عجیب بات ہے ۔ ابھی میرے ساتھ تیار ہوئی تھی ۔ جانے غلطی سے کونسی گلی میں مڑ گئی ۔

"یہاں تو نہیں آئی" ۔ وہ بولا۔

"میں سمجھی شاید ۔ پر تم فکر نہ کرو" بڑھیا نے اُس کی چھاتی پر ہاتھ رکھ دیا ۔ اور مسکرانے لگی۔

"ابھی مل جائے گی ۔ جانا کہاں ہے اسے ۔ بڑی پیاری بچی ہے ۔ جانا کہاں ہے"۔

وہ ہنسا "ہاں بڑی پیاری"۔

"ابھی لاتی ہوں میں اسے ۔ دروازہ کھلا رکھنا۔"

"اچھا"۔

دفعتہً سروری نے محسوس کیا جیسے اس کا وہ تختہ سا جسم موم بن کر پگھل گیا ہے اور دھارے کی طرح بہہ رہا ہے ۔

گوبر کی بو کا ایک تیز ریلا آیا ۔ اُس نے دیکھا چارپائی کے پیچھے پاس ہی اپلوں کا ایک ڈھیر لگا ہے اور گوبر میں سے ایک آبنوسی جونک نکل رہی ہے ۔ ایک ساعت کے لئے وہ رک گئی ۔

پھر دیوانہ وار بڑھ کر اس نے گوبر کے ڈھیر کو آغوش میں لے لیا۔

ایک چیخ ابھری اور پھر قہقہہ ۔ ہی ہی ہی ہی۔

"اے ہے تو یہاں ہے" ۔ بڑھیا اس کی طرف لپکی ۔ "یہ اچھا مذاق ہے" ۔

"مذاق" پڑوسی اپنی داڑھی ہاتھ میں پکڑ کر مسکرایا۔

"مذاق ۔ ہی ہی ہی ہی" ۔ وہ دیوانہ وار ہنسی۔

اور پھر دھم سے پڑوسی کے چوڑے اور مضبوط جسم پر گر پڑی ۔ اس کے سر پر کالے سیاہ سائبان کی بجائے تارے چمک رہے تھے ۔

اور گوبر کے بجائے فضا چنبیلی کی خوشبو سے بھری ہوئی تھی ۔

○

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور ۔ باہتمام عبدالسلام پرنٹر اور پبلشر

اسمارائیں

ہماری گلیوں کے پیچ و خم، ہمارے نیم روشن و نیم تاریک گھروں کے در و دیوار اور سڑک پر کھلنے والے دریچوں کی بے طرح غمازیاں ممتاز مفتی کے محبوب موضوع ہیں۔ ہم ان گلیوں سے روز گزرتے ہیں، ان روشن اور تاریک گھروں میں روز آتے جاتے ہیں اور ان اَدھ کھلی کھڑکیوں اور چلمنوں پر بیسیوں مرتبہ ہماری نگاہیں پڑتی ہیں لیکن ان کے پیچھے جو افسانے پروان چڑھتے ہیں، ان کی چہرہ کشائی مفتی جیسے صاحبِ فن ہی کا حصہ ہے۔

اسمارہ ایک لڑکی ہے جو مفتی کے ایک افسانے کی ہیروئن ہے۔ لیکن یہ اسمارہ تو ہر عام عورت کا آئینہ ہے۔ اس آئینے میں ہر عورت اسمارہ بن جاتی ہے —— عورتیں اسمارائیں۔ مفتی کا یہی کمال ہے۔ وہ سیدھے سادھے کرداروں میں ایسی لچک ڈھونڈ نکالتا ہے کہ وہ سب کے دل کی دھڑکن بن جاتے ہیں

969 0 01111 1

Rs. 250.00